

لرور سلاخ نلکاری اکا نارلخی اور فکری جمانر

تحقیقی مقالہ برائے بی ایچ ڈی (لرور)

سید عباس رضا

UNIVERSITY
OF PUNJAB
LIBRARY

اُردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری جائزہ

تحقیقی مقالہ

پی ایچ۔ ڈی (اُردو)

۲۰۰۲ء



مقالہ نگار

سید عباس رضا

اُستاد شعبہ اُردو

گورنمنٹ کالج، ٹاؤن شپ۔ لاہور

نگران

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

ڈین آف آرٹس

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی۔ لاہور

جامعہ پنجاب۔ لاہور

(اقتضاب)

اپنے والد ماجد محترم پروفیسر سید مختار حسین ترائی مرحوم و مغفور

کے نام

کاش! وہ آج زندہ ہوتے

اور

اپنی والدہ ماجدہ محترمہ سیدہ کوکب رضوی صاحبہ

کے نام

میں ان کی دعاؤں کے سہارے زندہ ہوں



ترتیب

گزارش احوال واقعی عباس رضا

باب اول

اُردو سلام — فنی مباحث، ہیئت، خصوصیات

واقعہ کر بلا اور اصناف شعر و ادب — مرثیہ، سلام اور نوے — معتقدات کی شاعری کی حیثیت — سلام
مرثیہ کی توسیع — سلام میں ہیئت کا تنوع — سلام کے لغوی مطالب — سلام کے متعلق ماہرین لغت
کے افکار و نظریات — سلام اور غزل کی ہیئت — ہیئت کے حوالے سے اہم نکات — مختلف النوع
ہیتوں میں لکھے گئے سلاموں کی مثالیں — سلام کے مضامین — اعتقادی اور اخلاقی مضامین —
زبان و بیان — الفاظ و معانی — جذبہ تخیل، احساس — سلام میں تبلیغ دین — خلوص و صداقت
— حقیقت نگاری — تاریخی روایات — ایجاز و اختصار — سماجی شعور — انقلاب اور مزاحمتی
ادب — عقیدہ اور سلام — فصاحت — بلاغت — تخیل — داخلیت — خارجیت —
سوز و گداز — اسلوب — الفاظ کا انتخاب — فصاحت — بلاغت — تخیل — داخلیت
— خارجیت — سوز و گداز — اسلوب — الفاظ کا انتخاب — تراکیب — روزمرہ —
محاورہ — صنائع لفظی و معنوی — مجموعی جائزہ — حواشی

اُردو سلام قیام پاکستان سے قبل

سلام نگاری کا پس منظر — اردو میں سلام نگاری کی روایت — دکن میں سلام نگاری — قطب شاہی و عادل شاہی دور — قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، لطیف، فائز، مرزا، نوری — شاہی، ہاشمی، کاظم، ذوقی، اشرف — اورنگ زیب کا دکن پر قبضہ — اس دور کے سلام نگار، درگاہ، رومی، کاظم، رضی، امائی، ہاشم علی، عابد — آصف جاہی دور حکومت — سکندر، جعفری، بیان، ناجی، رضا، مہدی، مظہر، سفیر، الم، جعفر، شریف، میر عثمان علی، مسرور، نصرت، صادق، شہیدی، شہید یار، جنگ، باقر امانت خانی، نجم آفندی، وفا، شامی، ہند میں سلام نگاری — محمد شاہی عہد — سلام نگار شعراء — یک رنگ، مغمون، ناجی، مسکین، خادم، جانفشان، فضلی، کرم علی، میر وسودا، ضاحک، محبت، قائم چاند پوری، سید علی سید رنگین، مصحفی، جرأت، غالب، بہادر شاہ ظفر، مولوی محمد باقر، افسوس، سالک، ظہیر، داغ — لکھنؤ میں سلام نگاری — سلام نگار شعراء — گدا، افرودہ، احسان، ناظم، خلیق، ضمیر، گلبر، میر انیس، مرزا دبیر، مونس، نفیس، جلیس، سلیم، انس، عشق، تعشق، صابر، اوج، واجد علی شاہ اختر، کامل، عارف، بندہ جاوید، جدید، فاخر، نظم طباطبائی، مرزا طاہر رفیع، صفی، ناطق، آرزو، فرید، خبیر، پیارے صاحب، رشید، فائز، فائق، لائق، آل رضا، اثر، جوش، بہزاد، نسیم، امروہوی، سالک، فضل، کامل، عارف — مجموعی جائزہ — حواشی

اُردو سلام قیام پاکستان کے بعد

جدید نظریات و میلانات — سوچ اور فکر کے مروجہ معیارات کی تبدیلی — اجتماعی شعور کی بیداری — آل رضا، نجم آفندی، نسیم، امروہوی، جمیل مظہری، علی سردار جعفری اور جوش کی مقصدی لے — شعراء کی پاکستان آمد — سلام نگاری کا احیاء — سلاموں پر پاکستانی ثقافت کے اثرات — مسالوں کی روایت — سلام خوانی — کراچی کے سلام نگار — آل رضا، جوش، نسیم، امروہوی، راجہ صاحب، محمود آباد، نجم آفندی، آرزو، لکھنوی، شمر لکھنوی، کامل، جو ناگرہ، محسن، اعظم گڑھی، منظر عظیمی، ضیاء الحسن، موسوی، ڈاکٹر یاور عباس، صبا اکبر آبادی، صبا لکھنوی، زیبا رودلو، وصی فیض آبادی، قمر جلالوی، شاہد نقوی، زید اے بخاری، ارم لکھنوی، رعنا اکبر آبادی، طالب جوہری، ماہر القادری، ثابت مظفر پوری، منور عباس، ساحر لکھنوی، رئیس، امروہوی، ساحر فیض آبادی

معجز جونپوری، فہیم ردولوی، نعیم میرٹھی، راغب مراد آبادی، محشر بدایونی، شان الحق حقی، تابش دہلوی، شاداں دہلوی، رضی ترمذی، تجل لکھنوی، شر ہوشنگ آبادی، ذابہ فتح پوری، اکرم زیبائی، اختر ہاشمی، عزت لکھنوی، اُمید فاضلی، بیدار جُنئی، وفا کانپوری، برق زیدی، انعام نقوی، رفیق جابر، نعیم میرٹھی، ابرار عابد، حسین جعفری، عروج بجنوری، آصف عابدی، حیدر اختر کاظمی، رشید ترائی، رئیس امر وہوی، ابن صفی، تصویر فاطمہ شاہد، جعفر اجمل، سراج احمد نوید، قاری حبیب اللہ حبیب، روشن لکھنوی، سبطین جارجوی، ظفر عباس ظفر — لاہور کے سلام نگار —

احسان دانش، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، قیصر بارہوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، وحید الحسن ہاشمی، عاصم گیلانی، سہیل بنارس، سیف زلفی، افسر عباس زیدی، مشکور حسین یاد، مسعود رضا خاکی، کوثر پانی پاتی، شائق زیدی، سید راحت حسین، طاہر ناصر علی، ڈاکٹر وجاہت حسین، زیبا ناروی، اثر ترائی، مظفر نقوی، موسیٰ کلیم نظامی، مظفر نقوی، سجاد باقر رضوی، امانت بخاری، شہزاد احمد، کسری منہاس، حسن زیدی، ڈاکٹر حسن رضوی، محسن نقوی، حسن عسکری، کاظمی ہوش عابدی، گلزار بخاری، شہریار زیدی، منیر سیفی، زاہد بخاری، مرزا حامد علی، سعید عالم زیدی، اقبال ساجد، اسرار زیدی، اعجاز احمد آذر، اے جی جوش، اشرف جاوید، مرزا حامد علی، سعید عالم زیدی، اقبال ساجد، اسرار زیدی، اعجاز احمد آذر، اے جی جوش، اشرف جاوید، انوار قمر، جواز جعفری، جعفر بلوچ، حفیظ تائب، خالد احمد، سعید اقبال سعدی، سعد اللہ شاہ، ستار سید، شہرت بخاری، ظہیر کاشمیری، عبد الحمید عدم، عباس تابش، علی اصغر عباس، غفر علی ندیم، نجیب احمد، ڈاکٹر خورشید رضوی، اعجاز ثقلین بخاری، ظفر شارب، علی ضیغم، ہمدانی، راجا رشید محمود، خوشتر علی خوشتر، فدا حسین فدا، نقاش ہاشمی، شبیر الحسن، عبدالکریم خالد، نواز زیدی — راولپنڈی کے سلام نگار — صفی حیدر دانش، نیساں اکبر آبادی، سید فیضی، ناصر زیدی، کلیم سائلی، افتخار عارف، ڈاکٹر ظہیر فتح پوری، تجل حسین اختر، سجاد بزداری، نشاط مقبول — دیگر شہروں کے سلام نگار — معروف سلام نگاروں کے خصوصی مطالعے و تجزیے — سلام کا پیش منظر — حواشی

اُردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ

سلام اور غزل کی ہیئت — معنوی اور فکری آفاق کی وسعت — غزل کے رموز و علائم اور استعاراتی اندازِ سلام میں — غزل کی فکری جہتیں، سلام میں — کربلا کا موضوع، غزل میں — غزل کی ہیئت، سلام نگاری کے لئے موزوں — غزل گو شعراء کے ہاں کربلا کا حوالہ — کربلا کا استعارہ، ایک وسیع تر معنویت — غزل سے سلام نگاری تک — سلام کو سیل جذبات سے نکل سمجھنے کی ضرورت — غزل کی فنی

اور معنوی خصوصیات، سلام میں — سلام غزل کا عکس جمیل — سلام کے موضوعات کا فکری جائزہ —
 کربلا کی فکری اساس، سلام میں — سلام کی دنیا، اخلاقی صفات اور تزکیہ نفس کی دنیا — غزل کی فنی
 خصوصیات، سلام میں — سلام نگاری اور عصری شعور — جبر و استحصال کے خلاف ایک نیا طرز احساس —
 شعراء کے کلام سے مثالیں — سلام نگاری کے فنی اور جمالیاتی پہلو — سلام نگاری کے فکری پہلو —
 اسلامی تہذیب کی بازیافت — عصری مسائل کا شعور — کربلا اور انقلاب کا تصور — حضرت امام
 حسینؑ کا کردار اور فکری جہات — مظلومیت ایک فعال طاقت — جبر میں اختیار کا راستہ — شہادت
 حسینؑ، ایک روشن علامت — حیات جاوداں کا استعارہ — کربلا اور فکر جدید — تہذیب و فکر کا مبلغ
 استعارہ — تخلیقی وجدان فکر کے نئے زاویے — درد انگیز تخلیقی کیفیت کا اظہار — سلام کا معنیاتی اور
 فکری نظام — اسلوبیاتی سرچشمے — سلام کے داخلی نظام کی صلابت اور استحکام — سلام نگاری کی ترقی
 کے امکانات — حواشی

۳۲۸

○ باب پنجم

اُردو سلام نگاری کا مجموعی جائزہ

سلام نگاری کی ضرورت، آخر کیوں؟ — سلام نگاری کا منطقی ارتقاء — سلام نگاری، مرثیے سے الگ صنف
 سخن — سلام نگاری، ایک قابل لحاظ صنفِ سخن — ہیئت کے مباحث کا جائزہ — سلام کے موضوعات کا
 جائزہ — زبان و بیان اور دیگر فنی خصوصیات کا جائزہ — سلام نگاری کی روایت کا جائزہ — تہذیبی بحران
 اور سلام — قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری کا جائزہ — سلام نگاری کے احیاء کا زمانہ — واقعہ کربلا اور
 اس کے متعلقات کا نئے سماجی انسانی مفہیم میں استعمال — جدید سلاموں کا استعاراتی انداز — واقعہ کربلا
 کا ایک رخ، شامِ غریباں — مباحث کا خلاصہ — سلام نگاری ایک زندہ صنف —

۳۳۷

○ ضمیمہ

(انتخاب غزل کی ہیئت میں لکھے گئے نامور شعراء کے سلام)

۳

○ کتابیات



گزارش احوال واقعی

تحقیق ایک مستقل اور مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے جو جانچ پرکھ کی صلاحیت، طویل اور اکتا دینے والے عمل میں بھی مستقل مزاجی سے کام میں لگے رہنے اور دشوار گزار مرحلوں میں عزم اور استقامت کے ساتھ ڈٹے رہنے والے مزاج کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لئے ایک خاص نوع کی ذہانت اور بصیرت بھی درکار ہے۔ ذوق نظر بھی — کہ جو شے کی حقیقت کو پا جائے۔ متلون مزاج محقق دو چار قدم چل کر سستانے لگتا ہے اور بعض اوقات سستانے کا یہ وقفہ اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ دن، ہفتوں — ہفتے مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں اور گھڑیاں، غفلت شعاری کے دروازے پر دستک دیتے دیتے تھک جاتا ہے اور بالآخر وقت گزر جاتا ہے اور تحقیق کے غنچے بن کھلے مر جھا جاتے ہیں — تحقیقی کام کی سرانجام دہی میں وقت کی بے حد اہمیت ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب کہ ہر شے تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ معیارات بدل رہے ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل اس قدر تیز رفتار ہے کہ آج ایک شے کو اپنے اور اس کی قدر متعین کرنے کے سانچے اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اذکار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس صورتحال میں آج محقق کو جس تندہی اور استقامت کی ضرورت ہے اس کی ضرورت شاید پہلے کبھی اتنی نہ تھی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر محقق اپنے کام کے ساتھ سنجیدہ ہے اور خلوص نیت کے ساتھ کار تحقیق انجام دینے کا عزم رکھتا ہے تو پھر اُسے یہ طے کر لینا چاہئے کہ کام کی بروقت تکمیل کے لئے اُسے کیا کرنا ہے۔ کام کے جملہ مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے اُسے کون سا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے اور اوقات کار کو کس انداز میں ترتیب دینا ہے۔ یہ سب باتیں اس لئے ضروری ہیں کہ تحقیق کوئی ایسا کام نہیں ہے جو بھل انگاری اور غفلت شعاری کے باوجود اپنے جملہ معیارات کے ساتھ مکمل ہو جائے۔ یہ ایک دشوار گزار اور کٹھن راستوں کا سفر ہے جس میں ایک لمحہ رُک کر پاؤں سے خارج مغلیاں چننے کا وقت بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ آپ اس میں اتنے طویل وقفے ڈالتے جائیں کہ ایک سرے کا دوسرے سرے سے ملانا ہی مشکل ہو جائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تحقیق نگار کو اٹھتے بیٹھتے اپنے موضوع کے ساتھ بسر کرنا چاہئے۔ اس دوران میں کوئی بھی لمحہ ایسا آ سکتا ہے جب کوئی نکتہ لمحہ برق کی طرح اچانک ذہن میں کوندتا ہے اور ذہن کو روشن کر دیتا ہے اور پھر وہی نکتہ تحقیق کی اساس بن کر سارے مرحلے آسان کر دیتا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک شاید اس نوع کا رواج نہیں پڑا کہ تحقیقی موضوع

کے ساتھ اس طرح اپنا قیمتی وقت گزار دیا جائے کہ ہمارے سوچنے اور غور و فکر کرنے کے اور بے شمار موضوعات ایسے ہیں جنہوں نے ہمیں آکاس نیل کی طرح جکڑ رکھا ہے۔ جس معاشرے میں انسان کو فکرِ معاش سے الگ اپنی زندگی کے تحفظ اور جان بچانے کے جتن کرنا پڑیں وہاں کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر سوچ بچار کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہ بات اپنے تساہل اور کم علمی کو چھپانے اور بے بصیرتی پر پردہ ڈالنے کا بہانہ نہیں بلکہ ایک ایسی سفاک حقیقت ہے جس کا ہم سب کو سامنا ہے۔ روزانہ اخبار کی چینی چنگھاڑتی سرخیاں تازیانہ بن کر دماغ پر لگتی اور اعصاب شل کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ایسے میں ذہن میں کوئی نکتہ جمانا اور اس پر ارتکاز کر کے کسی عقدے کو کھولنا اور دقیقے کو سمجھنا کس حد تک آسان ہے یہ ہر کوئی جانتا ہے یا تو انسان اپنی محدود سی دنیا میں سمٹ کر رہ جائے اور باہر کھلنے والے سارے در پیچے بند کر دے اور آنکھیں موند کر تخیل کی رسی دراز کر دے اور غیب سے مضامین کے اترنے کا انتظار کرے۔ لیکن یہ بھی غالب کے زمانے میں ہو سکتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہوتا کہ یہ معروضی حقائق کا زمانہ ہے۔ معروضیت غیب کی باتوں پر دھیان نہیں دیتی بلکہ اپنے ہونے کا جواز مانگتی ہے۔ محقق کو اپنی ہر بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے سند چاہئے۔ وہ ادھر ادھر سے لفظ اُچک کر کاغذ کا پیٹ بھر بھی لے تو اس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی حوالہ درکار ہے کہ تحقیق حوالے کے بغیر نہیں چلتی۔

ڈاکٹر بیٹ کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنا میرا خواب تھا — لیکن میں ابتدا میں نہیں جانتا تھا کہ اس خواب کو حقیقت بننے کے لئے کن جاں گسل مراحل سے گزرنا ہوگا۔ درج بالا طور کسی حد تک میری ان مشکلات کی ترجمانی کرتی ہیں جو بعد میں اس راہ میں میرے مقابل پر تھیں۔ آغاز میں جب میں نے زیرِ تحقیق موضوع پر خاکہ تیار کیا تو بورڈ آف سٹڈیز نے اس میں چند ترامیم کرنے کو کہا۔ یہ ترامیم اس نوعیت کی تھیں کہ موضوع کی ہیئت ہی تقریباً بدلنا پڑی۔ چنانچہ خاکہ دوبارہ تیار کر کے پیش کیا گیا جسے منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد خاکے کی حتمی منظوری کے باقی مراحل بھی طے ہو گئے۔ عزت مآب ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب نے میرے تحقیقی کام کا نگران بنا قبول فرمایا۔ یہ میری خوش بختی تھی۔ ورنہ کہاں مجھ جیسا بیچ مدان اور کہاں ڈاکٹر سہیل احمد خان — انہوں نے بڑی محبت سے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا اور میں اسی سرور میں بھول گیا کہ مجھ ایک پہاڑ سر کرنا ہے — ”اردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ“ اپنی قیمت اور کمیت کے اعتبار سے ایک بہت اہم موضوع تھا۔ اہم اس لئے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی نمایاں کام نہیں ہوا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ اتنا پھیلا ہوا موضوع تھا کہ اس کے لئے اردو شاعری کی پوری تاریخ کو عرق ریزی اور باریکی بینی کے ساتھ کھنگالنا تھا۔ مواد کی تلاش کے لئے ہر سمجھ دار محقق کی طرح سرکاری لائبریریوں کا رخ کیا۔ مگر اکثر لائبریریاں کسی مفلس کی جیب کی طرح مطلوبہ مواد سے خالی دکھائی دیں۔ شہر کے بعض اہل علم کے نجی کتب خانوں تک رسائی حاصل کی تو امید کی کرن دکھائی دی لیکن صاحبانِ کتب خانہ کتاب کو ہاتھ تک نہ لگانے دیتے تھے۔ سفارشیں بہم پہنچائی گئیں تو ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ سو قطرہ قطرہ پانی کا سہ امید میں ٹپکنے لگا اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اسے بھرنے میں پورے پانچ برس لگ گئے — موضوع ایسا تھا کہ سرحد پار کے اہل علم سے رابطہ بھی ضروری تھا — والد محترم پروفیسر مختار حسین ترابی مرحوم کے دوست پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی راہنمائی حاصل کی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ادب میں بہت نام ہے — اور میں بے نام — لیکن انہوں نے میرے والد مرحوم کی

محبت میں مجھے یاد رکھا۔ ادھر لاہور میں وحید عصر سید وحید الحسن ہاشمی کا گھر تھا۔ جو گھر کم اور گہوارہ علم و ادب زیادہ ہے۔ یہاں سے مجھے کتابیں بھی دستیاب ہوئیں اور استاد محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب بھی۔ مواد کے حصول اور اس کی تنظیم و ترتیب میں مجھے سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کی سرپرستی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کی رہنمائی حاصل رہی۔ کام آسان ہونے لگیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سوچا، مواد جمع ہو چکا ہے۔ اسے الگ الگ خانوں میں بھی رکھا جا چکا ہے۔ حوالوں کے لئے ضروری مقامات پر چٹیں بھی آویزاں کر دی گئی ہیں۔ اب یہ سامنے ہی کی تو بات ہے۔ دو نہیں تو تین مہینے لگ جائیں گے اور کام نہ ہو جائے گا۔ مگر واہ رے غفلت۔ تن آسانی نے ایسی لوری سنائی کہ جب آنکھ کھلی تو کئی روشن اور اُبلے موسم گزر چکے تھے۔ لیکن اس مرحلے پر ایک ہلکا سا اطمینان ضرور تھا کہ چیونیوں کی طرح دانہ دانہ اکٹھا کر لیا ہے۔ اب چاہے با مخالف چلے یا طوفان اٹھیں، کام ہو ہی جائے گا۔ سوا اللہ کا کرم اور اس کا فضل و احسان ہے کہ کام ہو گیا ہے۔ کیا ہوا ہے؟ یا کیا ہونا چاہئے تھا؟ یہ میرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ جس نے مجھے یہ پہاڑ سر کرنے کی ہمت بخشی ہے وہی جانے۔

میرے مشفق مگر ان پر و فیر ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب کی نظر التفات کیسا اثر ہے۔ میں ان کی خاص شفقت اور محبت کا رہنما احسان ہوں کہ انہوں نے اس خاک کی قدر افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور مجھ ایسے طالب علموں کے لئے ان کا فیض جاری رہے۔

زیر نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ”اردو سلام“۔ فنی مباحث، ہیئت، خصوصیات، سلام نگاری کے حوالے سے فن کے عمومی مباحث سے متعلق ہے۔ اس باب میں اردو سلام کے پس منظر کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مفاہیم کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بطور خاص اس امر پر سیر حاصل بحث کی گئی کہ سلام نگاری اگرچہ متنوع الجہات صنفِ سخن ہے لیکن اگر اسے محض معتقدات کی شاعری شمار کیا جائے تو اردو شاعری میں اس کا کیا مقام بنتا ہے۔ اسی ذیل میں ایک اور سوال بھی ابھرتا ہے کہ اگر یہ صنف مرثیہ کی توسیع ہے تو مرثیے سے الگ اس کی حیثیت کا کیا جواز بنتا ہے؟ زیر نظر باب میں ”سلام“ کی مختلف ہیئتوں اور مختلف ادوار میں ان کے استعمال کے طریقوں کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں قدیم شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ اس باب کا ایک اہم حصہ ان لغوی مطالب پر مشتمل ہے جو مختلف اہم لغات میں سلام کے حوالے سے درج کئے گئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں لغت نویسوں کے افکار و نظریات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ سلام کی ہیئت کے بارے میں اہل نقد و تحقیق اصحاب کی توجہات اور غزل کی مخصوص ہیئت اختیار کرنے کے جواز پر بھی اس باب میں تفصیلی بحث موجود ہے۔ اس حوالے سے مختلف ہیئتوں میں لکھے گئے سلاموں سے مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس باب کا آخری حصہ سلام کے موضوعات اور اس کی فنی خصوصیات پر مشتمل ہے۔

دوسرا باب ”اردو سلام کی روایت“۔ قیام پاکستان سے قبل، سلام نگاری کے آغاز و ارتقاء سے متعلق ایک طویل شعری تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں فارسی شاعری کے حوالے سے سلام نگاری کے ابتدائی نقوش تلاش کئے گئے ہیں۔ اردو سلام کے

آغاز کا زمانہ دکن کی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے عہد سے مختص ہے۔ چنانچہ اس دور کے سلام گو شاعروں کی فہرست مرتب کر کے ان کے سلاموں کو دریافت کیا گیا ہے۔ اس دور میں چونکہ سلام اور مرثیے ایک جیسی ہیئتوں میں لکھے جاتے تھے اس لئے بہ تحقیق مرثیے اور سلام کے بنیادی فرق کی وضاحت کی گئی ہے اور اس سلسلے میں بعض ضروری مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس باب کے دوسرے حصے میں شمالی ہند کے مختلف شعری ادوار میں سلام کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بطور خاص دہلی کے طبقہ متاخرین کے شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن کے عہد میں سلام کے لئے غزل کی ہیئت کو مخصوص کیا گیا۔ زیرِ نظر باب کا تیسرا حصہ لکھنؤ میں سلام نگاری کے لئے مخصوص ہے۔ اس باب میں اودھ کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے حوالے سے سلام نگاری کے ارتقائی مرحلوں کو پوری تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بطور خاص میر انیس اور مرزا دبیر کی سلام نگاری کا جائزہ لے کر اس کے مستقبل کے امکانات پر بحث کی گئی ہے۔ اس طرح لکھنؤ کے دورِ آخر کے تمام اہم شعراء بھی اپنی جدت کاریوں اور نو بہ نوا سالیب کے ساتھ اس باب میں سمٹ آئے ہیں۔ اس باب میں اہم بات یہ ہے کہ اس میں ان تبدیلیوں کا بھی مفصل ذکر موجود ہے جو سلام نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سامنے آئیں۔

تیسرا باب ”اردو سلام نگاری — قیام پاکستان کے بعد“ جہاں پاکستان کے سلام نگاروں کے تفصیلی جائزے پر مشتمل ہے اور فرد افراد ہر سلام نگار کے سوانحی حالات اور فن کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے وہاں سلام نگاری کے بدلتے ہوئے رجحانات کو جدید طرزِ احساس کے تناظر میں بیان کرتا ہے۔ اس باب میں گزشتہ ستاون سال کے دوران میں سلام نگاری کی ترقی کے علاوہ ان سیاسی معاشرتی اور تہذیبی عوامل پر بحث کی گئی ہے۔ جو کسی نہ کسی سطح پر سلام نگاری پر اثر انداز ہوئے۔

چوتھا باب ”اردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ“ اس مقالے کا اہم باب ہے جس میں تاریخی اور فکری تناظر میں ان محرکات اور اسباب پر بحث کی گئی ہے جو اس صنف کی تخلیق اور اس کے فروغ کا باعث بنے۔ اس سلسلے میں سلام کی تدریجی استعاراتی توسیع اور عالم گیر آفاقی معنویت کے نقوش ابھارنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس پس منظر میں نمایاں بات یہ ہے کہ سلام کی غزلیہ ہیئت کو خالصتاً تاریخی اور فکری تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی اور یہ بنیادی نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ سلام نگاری کے لئے غزل کی ہیئت اس اعتبار سے بھی موزوں ٹھہرتی ہے کہ اردو غزل اپنی صدیوں پرانی روایت میں کربلا اور اہل کربلا سے بہت مانوس رہی ہے اور واقعہ کربلا کے تاریخی حوالے کو کہیں استعاراتی انداز میں اور کہیں واضح طور پر اپنے دامن میں جگہ دیتی رہی ہے۔ واقعہ کربلا کی تاریخی معنویت اور سلام نگاری میں اس کا اظہار بھی اس باب کا موضوع ہے جس کا اہم نکتہ یہ ہے کہ واقعہ کربلا میں مظلومیت کو فعال طاقت میں بدلنے کا بھید پوشیدہ ہے اور اس میں انسان کی انتہائی جبر میں سے مکمل اختیار کا راستہ پیدا کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے اور سلام نگاری نے اس صلاحیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس باب کے آخر میں اس امکان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ سلام نگاری کی اصل زندگی اس کے داخلی نظام کی صلابت اور استحکام سے ہے۔ جب تک اس میں فکر کے نئے زاویوں کی تلاش کا عمل باقی رہے گا اور اسلوب کی مختلف جہتوں کی بازیافت کے حوالے سے تاب و توانائی موجود رہے گی اس کی زندگی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

پانچواں اور آخری باب مقالے میں پیش کئے گئے جائزوں اور مباحث کو سمیٹا ہوا مجموعی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں گزشتہ ابواب میں بیان کئے گئے اہم نکات کا ذکر کر کے ان سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بطور خاص سلام نگاری کے جدید عہد کو سامنے رکھ کر ان امکانات کو تلاش کیا گیا ہے جو اس عہد کی سلام نگاری سے وابستہ ہو کر سلام نگاری کو بطور صنف کے زندہ رکھ سکتے ہیں۔

مقالے کے آخری حصے میں ایک ضمیمے کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں جدید عہد کے نمایاں سلام نگاروں کے سلام مرتب کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ضمیمہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں شامل جدید نمائندہ سلاموں سے جدید سلام کی کروٹیں ملاحظہ کی جاسکی ہیں اور آخر میں حسب دستور کتابیات کی فہرست ترتیب دی گئی ہے جن سے استفادہ کر کے اس مقالے کے مندرجات کو اعتبار بخشا گیا۔

آخر میں مجھے اپنے ان دوستوں کرم فرماؤں اور اعزہ و اقارب کا ذکر کرنا ہے جن کے لئے میرا دل شکر و امتنان کے جذبات سے لبریز اور سراپا استحسن ہے۔ اگر مجھے ان دوستوں اور احباب کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں میرا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا۔

میری خوش بختی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ڈاکٹر عبدالکریم خالد جیسا شفیق اور محسن استاد عطا کیا۔ خالد صاحب نے زندگی کے ہر موڑ پر میری دنگیری فرمائی اور علم و ادب کے حصول کے لیے مجھے نئے راستوں سے روشناس کرایا۔ اس مقالے کی منصوبہ بندی سے لے کر تکمیل تک خالد صاحب نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ مجھے فخر ہے کہ میں عبدالکریم خالد کے عہد میں سانس لے رہا ہوں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ذات گرامی دوستوں کے لیے شجر سایہ دار کا درجہ رکھتی ہے نجی مصروفیات ہوں یا خرابی صحت کی پریشان کن صورت حال ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ فراخ دلی اور اپنائیت سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری رفاقت کم و بیش پندرہ برس سے زائد عرصے کو محیط ہے۔ یوں تو ہمیشہ ہی شبیہ الحسن صاحب نے اپنی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کے فطری جوہر کے باوصف بڑی سے بڑی مشکل کو آسان بنائے رکھا ہے مگر بالخصوص اس مقالے کی ترتیب و تسوید کے دوران قدم قدم پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جس اپنائیت، ہمدردی، اخلاص اور بے پایاں شفقت و عنایت کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً تادم آخر یاد رہ جانے والا حسن سلوک ہے یقیناً آپ جیسی مشفق و مہربان شخصیت سے قرابت کا شرف ہی میرا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی علم و ادب کی دنیا میں فرد واحد نہیں بلکہ ایک مستقل ادارہ ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں جو جملہ علوم متداولہ پر بے پناہ قدرت رکھتے ہوں۔ زیدی صاحب کا اختصاص یہ ہے کہ وہ تحریر اور تقریر دونوں میدانوں کے مضبوط شہسوار ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو لوگوں کی سماعتیں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں اور جب وہ لکھتے ہیں تو لفظ و معانی ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہو جاتے ہیں۔ اس مقالے کی تشکیل و تسوید میں ان کا کردار مرکزی ہے۔ انہوں نے اپنی محققانہ بالغ نظری اور تنقیدی بصیرت کا جوا اظہار کیا ہے میں اس کے لیے ان کا سراپا پاس ہوں۔ خدا اس ”طوطی پاکستان“ کو سلامت رکھے۔

اس مقالے کی تشکیل و ترتیب کے دوران جن احباب نے مختلف امور میں میری دست گیری فرمائی اُن میں جناب ڈاکٹر آغا سہیل، جناب ڈاکٹر اختر جعفری، جناب ڈاکٹر مظفر عباس، جناب ڈاکٹر اجمل نیازی، جناب ڈاکٹر ریاض قدیر، جناب ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، جناب پروفیسر حسن عسکری کاظمی، جناب پروفیسر مرغوب حسین طاہر، جناب سید اختر ہاشمی (کراچی)، جناب پروفیسر باقر علی شاہ، جناب پروفیسر ظفر چشتی، جناب ثناء اللہ، جناب عبدالوحید، جناب جاوید اقبال اور جناب ڈاکٹر طارق عزیز شامل ہیں۔ میں ان تمام احباب کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں۔

اس مقالے کی ترتیب کیلئے جس ارتکاز اور سکون قلب کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے ہرگز دستیاب نہ ہوتی اگر میری زوجہ محترمہ زگس نقوی کا تعاون میرے شامل حال نہ ہوتا۔ میری بچیوں آمنہ اور علیزہ نے میری تھکاوٹ کو ہمیشہ مسکرا کر دور کرنے کی کوشش کی۔ میری چھوٹی بہن ثناء زہرا ہر وقت میرے لیے مددگار ثابت ہوئی۔ اسی طرح بیرون ملک مقیم میری بہنوں سیدہ رباب، سیدہ صائمہ اور بہنویوں حیدر گیلانی اور علی عمران نے اس مقالے کے بارے میں مجھے حرکت و عمل پر آمادہ رکھا۔ میں صمیم قلب سے ان سب کا شکر گزار ہوں۔

اس مقالے کے صوری حسن کو جناب تصور حسین صاحب نے دوبالا کیا انہوں نے رات دن کام کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اسی طرح محمد آصف ڈٹو اور انجم فاروق نے اس مقالے کی پروف خوانی کی۔ پروفیسر فرقان صاحب لحد بہ لحد یاد آتے رہے۔ میں یہ مقالہ انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنے والد مرحوم کی روح اور والدہ ماجدہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر انہوں نے اس ناچیز کے تحفے کو قبول کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کامیاب ہوگئی۔

عباس رضا
(سید عباس رضا)

استاد

گورنمنٹ کالج، ٹاؤن شپ، لاہور

۳۰۔ جون ۲۰۰۴ء

باب اوّل

اُردو سلام— فنی مباحث، ہیئت، خصوصیات

اُردو سلام

فنی مباحث، ہیئت، خصوصیات

شعر و ادب میں ایسے واقعات زیادہ اہم قرار پاتے ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرت پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ واقعہ کر بلا محض ایک تخیلی داستان نہیں بلکہ اس واقعے میں معاشرت کرنے کے اعلیٰ اقدار مل جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے تاریخی واقعات کی بہ نسبت واقعہ کر بلا نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ حق گوئی، مظلومیت اور خرد کے خلاف جہاد کرنا یہ ایسے اعلیٰ اقدار ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ معاشروں کو متاثر کیا بلکہ اس کے اثرات ادب و شعر پر بھی مرتب ہوئے۔ (۱) یہی سبب ہے کہ اعلیٰ قدروں کی ترویج کے لئے کر بلا کو استعارہ بنایا گیا (۲) اور ان استعاروں اور تلازموں سے نہایت عمدہ اور کارگر شدہ پارے تخلیق کئے گئے۔ (۳، ۴)

بالعموم یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ واقعہ کر بلا نے مختلف اصناف شعر و ادب کو متاثر کیا، بطور ثبوت غزل، داستان، افسانہ، مثنوی، ناول، نظم، ناولٹ اور دیگر اصناف میں سے چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کر بلا نے محض شعر و ادب ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اُردو شاعری کو متعدد اصناف سے مالا مال بھی کیا۔ آپ سلام، نو حہ اور مرثیہ کا بغور مطالعہ کیجئے اور اس سوال کا کھوج لگائیے کہ کیا واقعہ کر بلا کے بغیر ان اصناف کا ظہور میں آنا ممکن تھا؟؟

صنف مرثیہ وہ ممتاز صنف ہے جس کا خمیر اسی برصغیر میں تیار ہوا اور یہی وہ صنف ہے کہ جس میں اُردو کے بیشتر اصناف کے محاسن کا جوہر مل جاتا ہے۔ (۵) اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مرثیے کی صنف کو برصغیر پاک و ہند سے جو خصوصیت ہے وہ کسی دوسری صنف کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ سلام و نو حہ بھی صنف مرثیہ کی توسیع ہیں۔

مرثیہ سلام اور نو حہ کے اصناف ہر عہد میں اس لئے مقبول خاص و عام رہے کہ ان میں زندگی کی اعلیٰ قدریں پیش کی جاتی رہیں اور اسی سبب سے ان کے ذریعے اعلیٰ تر معاشرتی رویے ظاہر ہوئے۔ آج بھی مذکورہ اصناف میں واقعہ کر بلا کے حوالے سے زندگی بسر کرنے کے بہترین تصورات مل جائیں گے۔ (۶) واقعہ کر بلا کا یہ فیضان ہے کہ اس نے ایک سطح پر تو انسان کا تعلق خدا سے

اور دوسری سطح پر انسان کا تعلق اعلیٰ تر معاشرتی اقدار سے جوڑ دیا ہے۔ آپ واقعہً کربلا سے متعلق اصناف کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ ان اصناف میں ایک جانب تو اخلاقی موعظت کے یگانہ نمونے موجود ہیں اور دوسری جانب ان اصناف میں زندگی بسر کرنے کے قرینے موزن ہیں۔ ان اصناف کے ذریعہ ہم ایک ایسی مثالی زندگی کی دلیلیں پر قدم رکھتے ہیں جہاں دینی روایات اور عصری صداقتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔

دینی روایت میں مابعد الطبیعیاتی صداقتوں پر ایمان اور ان کے ساتھ طہارت اور تقدس کے تصورات کی وابستگی، روایت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو ان صداقتوں اور ان سے وابستہ طہارت، تقدس اور برکتوں کی تجسیم ہے، یعنی ایسی شخصیات کا وجود جو صداقتوں کے ہم پلہ ہیں۔ مذہبی معتقدات میں ان دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ صداقتیں مذہب کے تزئینی محرکات کا درجہ رکھتی ہیں جبکہ شخصیات ایک طرف تو تشبیہی محرکات کی ضامن ہیں اور دوسری طرف تزئین کا بدل ہیں۔ ایسی شخصیات تمام مذاہب میں اہم حیثیت کی حامل ہوتی ہیں کہ وہ صداقتوں کا عملی پہلو نمایاں کرتی ہیں۔

کردار کی تعمیر میں مقدس شخصیتوں کا حصہ مقدس صداقتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ عام انسان انہی مقدس شخصیتوں کے حوالے سے ہی صداقتوں کا ادراک کرتے ہیں۔ ان مقدس شخصیات کے تتبع اور ان کی تقلید سے وہ اپنی جلی آلائشوں کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کے حوالے سے اپنے لئے ایک مثالی زندگی کا تصور قائم کرتے ہیں۔ ذات اور شخصیت کی یہ تربیت اور تہذیب معتقدات کی بدولت ہی ہوتی ہے اور اسی لئے انسانی زندگی میں عقیدے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ (۷)

ایک اور چیز جس نے انسان کی باطنی تہذیب کی شاعری ہے۔ (۸) شاید یہی وجہ ہے کہ اسے ہماری روایت میں ”جزو پیغمبری“ بھی بتایا گیا ہے۔ یونانیوں نے تہذیب نفس کی بنیاد ہی اصول توازن پر رکھی تھی۔ شاعری کی بنیاد بھی اسی اصول توازن پر ہے۔ شاعری نے بھی انسانوں کی باطنی تربیت و تہذیب کے لئے بہت کام کیا ہے، گو اس کا دائرہ اثر مذہب کے مقابلے میں کم رہا ہے۔ معتقدات کی قوت اور تاثیر شاعری کی قوت اور تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے اور شاعری کے مقابلے میں اس نے انسانوں کی زیادہ بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے۔ تاہم ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاعری اور عقیدہ دونوں یکجا ہو جائیں۔ یہ صورت دو طرح نمایاں ہو سکتی ہے۔ ایک یوں کہ عقیدہ پس منظر میں رہے اور شاعری کے لئے توانائی مہیا کرے۔ دوسری یوں کہ شاعری عقیدے کے اظہار کے لئے ذریعہ بن جائے۔ اس دوسری صورت میں شاعری کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی اور عقیدہ بحیثیت مقصد شاعری پر حاوی ہو جائے گا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایسی صورت میں ہمیں عقیدے اور شاعری دونوں کی ملی جلی قوتوں سے سروکار ہوتا ہے۔ (۹) تخلیق شعر میں عقیدے کی افادیت بیان کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین کی یہ رائے ملاحظہ فرمائیے:

”— کوئی شاعری کتنی ہی سرچشموں سے فیض اٹھائے اس کے کلام میں زور تازگی جدت“

گرمی اور سرمستی کے عناصر اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک وہ مسائل اور واقعات پر اپنے مخصوص نقطہ نظر سے غور نہ کرتا ہو یہ بات صرف مذہب ہی کے لیے نہیں زندگی کے ہر پہلو

کے لیے صحیح کہی جاسکتی ہے کہ اس میں عقیدے کی آگ کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا اظہار مصنوعی اور بے روح ہوگا۔ یہی ایک اچھے فنکار کی پہچان ہے کہ اس کا موضوع ہی اس کی زندگی

اور روح ہو۔“ (۱۰)

ایک سوال ناقدین کے درمیان ہمیشہ باعث نزاع رہا ہے کہ کیا معتقدات کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والی شاعری عظیم ہو سکتی ہے؟؟؟ بعض ناقدین اور دانشور تو برملا کہہ دیتے ہیں کہ اعتقادات جتنے بھی مضبوط اور پختہ کیوں نہ ہوں، یہ شاعری کو عظمت سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ ناقدین کا دوسرا گروہ شعری روایات میں معتقدات کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ دنیا کی عظیم شاعری کی بنیادیں کسی نہ کسی سطح پر مابعد الطبیعیاتی دینی روایت سے جڑی ہوئی ملتی ہیں۔ آپ یونان، انگلستان اور ہندوستان کی پر عظمت شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے، آپ دیکھیں گے کہ عظیم شاعری ہو یا تہذیب، اس کا تعلق کسی نہ کسی دینی روایت سے جڑا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اگر آپ اپنی شاعری کو عظیم تہذیب کی نمائندہ بنانا چاہتے ہیں تو کسی دینی روایت سے جوڑ دیجئے، آپ کی ذات کی تطہیر بھی ہو جائے گی اور آپ کی شاعری میں بھی مثبت معتقدات کی خوشبو آ جائے گی۔ آپ خود مطالعہ فرمائیے کہ دانش مند شعرا نے اس بصیرت افروز حقیقت سے آگاہی کے بعد شعوری سطح پر اپنی شاعری کی بنیاد غزل کے برعکس مدیہ شاعری پر رکھی اور اپنے لئے ایک جداگانہ راستہ منتخب کیا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ جان گئے تھے کہ غزل کے کردار سحر انگیز تو ہو سکتے ہیں لیکن مقدس اور قابل تقلید نہیں ہو سکتے۔ غزل کے کرداروں کا نہ تو شجرہ نسب ہوتا ہے اور نہ کوئی خاندان۔ اس کے مقابلے میں مدیہ شاعری ایک پاکیزہ خاندان کا خود بھی طواف کرتی ہے اور اپنے شاعر کو بھی اس کا طواف کرا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جسے محمدؐ و آل محمدؐ جیسے پاکیزہ نفوس دستیاب ہوں وہ قیس و فرہاد کے چکر میں کہاں پڑتا ہے۔ (۱۰۔ الف)

ہمارے خیال میں حقیقت یہی ہے کہ مذہبی معتقدات فنون لطیفہ کو قوت فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں لہذا دانش مند فنکار وہ ہوتا ہے جو نامحسوساتی طریقے سے ادب و شعر میں عقیدے کی قوت بروئے کار لائے۔ اس سلسلے میں معروف دانشور اور نقاد ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”— فن کسی نہ کسی طرح انسانی تقدیر کے مسائل سے الجھتا رہا ہے۔ فنون لطیفہ کے بہت سے مظاہر جنہیں ہم آج عجائب گھروں یا آرٹ گیلریوں میں غیر جانبدار مظاہر کے طور پر دیکھتے ہیں اپنے وقتوں میں کسی نہ کسی انداز میں تبلیغی بھی تھے مگر یہ بات عجیب ہے کہ موجودہ زمانے میں احتجاج اور نظریات کا ذکر کرنے والے مخصوص اصطلاحات کے دائرے میں محدود فنی سانچوں ہی کو صحیح گردانتے ہیں اور فنون لطیفہ کی تاریخ کے بارے میں سطحی نقطہ نظر رکھتے ہیں —“ (۱۱)

افلاطون سے مولانا حالی تک اور شبلی نعمانی سے ڈاکٹر وزیر آغا تک تمام دانشمندوں نے مذہب و اخلاق کو شعر و ادب کے

لیے ضروری قرار دیا ہے۔ حالی نے بطور خاص اخلاقیات کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ وہ شاعری میں اخلاقیات کے قائل ہی نہیں بلکہ اس کے مبلغ بھی ہیں۔ وہ مقدمہ شعر و شاعری میں رقم طراز ہیں:

”شعر سے جس طرح نفسیاتی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔“ (۱۲)

اردو شعر و ادب میں ایسے اصناف کی کثرت ہے جن میں مذہب و اخلاق اور معتقدات اپنے جملہ اوصاف کے ساتھ جلوہ گر ہوں تاہم یہ معتقدات بھرپور طریقے سے جن اصناف میں ظاہر ہوئے ان میں مرثیہ، سلام اور نوحہ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کے بیشتر مورخین، ناقدین اور محققین اس امر پر متفق ہیں کہ درج بالا اصناف نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، اعتبار، تنوع اور وقار بخشا ہے۔ ان اصناف نے تہذیبی اور معاشرتی روایتوں، ادبی تقاضوں اور معتقدات کی گود میں پرورش پا کر زندگی کی حقیقتوں کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا اور افراد کے باہمی رشتوں، روحانی اور اخلاقی قدروں اور فن کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھ کر حیات و کائنات کے بہت سے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ (۱۳) ہم نے گزشتہ صفحات میں یہ معروضہ پیش کیا تھا کہ اردو سلام و نوحہ دراصل اردو مرثیہ کی توسیع ہیں لہذا ان اصناف کو مطالعہ مرثیے کے سیاق و سباق کے بغیر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے تاہم ایک بات یہاں پیش نگاہ رہے کہ صنف سلام کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ (۱۴) اس صنف کا خمیر بھی چونکہ معتقدات پر تشکیل پایا تھا اس لیے اس میں بھی واقعہ کر بلا کے دور رس اثرات جلوہ فگن ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید صفدر حسین رقم طراز ہیں:

”..... اردو شعر و ادب میں ”سلام“ ایک ایسی صنفِ سخن کا نام ہے جس میں غزل کی عروضی ہیئت کے اندر رسول اکرم، ائمہ کرام، اہل بیت اطہار اور خاصانِ خدا کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تعبیر بیان کی جاتی ہے۔ خصوصاً کر بلا کے ہیر و حضرت امام حسین اور ان کے اعزہ و انصار کا تذکرہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ان مقربانِ خدا نے چونکہ حق و صداقت اور دین کی حمایت میں دنیا کی عظیم قربانیاں پیش کی تھیں اس لئے ایسے موضوعات بھی شاعر کے دائرہ فکر میں آ جاتے ہیں جن سے اعلیٰ اقدار حیات اور محاسن انسانی کی ترویج و تبلیغ کا کام لیا جاسکتا ہے۔ گویا ”سلام“ کے احاطہ خیال میں مسائل حیات و کائنات پر بھی تبصرے کی گنجائش ہوتی ہے تاکہ فطائے الہی، اسوۂ رسول اور فکر اہل بیت کی وضاحت کر کے عمل خیر کی ترغیب دی جا سکے۔“ (۱۵)

اردو سلام کی ہیئت، تاریخ اور اہمیت پر تو آئندہ صفحات میں گفتگو ہوگی تاہم ایک غلط فہمی کا ازالہ اسی وقت ہو جائے تو بہتر ہے۔ ایک ناقد ڈاکٹر شارب ردو لوی کا یہ کہنا کہ ”سلام کا ارتقا مرچے کی ایک ضمنی صنف کی حیثیت سے ہوا اور چونکہ اس کا مقصد سوز یا مرثیہ خوانی سے پہلے پیش خوانی کا تھا اس لیے وہ علیحدہ ایک صنف کی حیثیت سے ادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں بنا سکا۔“ (۱۶) ہمارے نزدیک درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنف سلام نے اردو شاعری کے اولین دور ہی میں اپنی حیثیت منوالی تھی اسی باعث ابتدائی شعرا نے اس صنف کو اپنے افکار و نظریات سے مالا مال کر دیا تھا۔ (۱۷) اس صنف کی بنیاد بھی چونکہ مذہبی معتقدات پر استوار تھی اس لیے اس قبیل کی دیگر اصناف کی طرح اسے بھی وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ اس سلسلے میں علی جواد زیدی کی رائے بھی ہمارے موقف کی تصدیق کرے گی ملاحظہ فرمائیے:

”..... مذہبی ادب اتنا ہی اچھا ہے جتنا خود مذہب۔ عوامی زندگیوں میں آج بھی مذہب کا اہم کردار ہے۔ مذہبی ادب مذہبی اجتماعات میں آج بھی نثر و نظم کی صورت میں سنایا جاتا ہے اور کتابوں میں شائع ہوتا ہے۔ مذہبی عقیدت ایک قوی عوامی جذبہ ہے۔ کچھ مذہبی عقیدت تنگ نظری بھی نہیں ہوتی بلکہ اپنے بہت سے رجحانات میں آفاقیت کا پہلو رکھتی ہے۔ اس ادب سے افراد اور معاشرے دونوں کے واردات و محسوسات و معتقدات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ پھر اس کی زبان اجتماعی ضرورتوں کے پیش نظر نسبتاً سادہ ہوتی ہے۔ غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے مذہبی ادب دور بھینکنے کی نہیں بلکہ بغور مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔ اس میں رسومات و توہمات سے لے کر فلسفیانہ خیالات، عالیہ اور اخلاقی معیار کے بلند مضامین تک مل جاتے ہیں۔ معاشروں کو سمجھنے میں بھی ان سے مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے مذہبی ادب میں بڑا تنوع ہے اور اس کے موضوعات وسیع ہیں۔ مذہبی ہوتے ہوئے بھی اس کے بعض اصناف میں سیکولر مضامین بکثرت نظم ہوئے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود مذہبی ادب پر علی العموم اور سلام پر علی الخصوص تحقیق مفقود ہے۔ اس صنف کے بارے میں اردو میں اگر کچھ لکھا بھی گیا ہے تو بے حد نا کافی ہے۔“ (۱۸)

ان پیش کردہ معروضات کے بعد صنف ”سلام“ کے فن کے حوالے سے چند نکات پیش خدمت ہیں۔

آداب معاشرت اور اخلاقی نقطہ نظر کے مطابق مہذب اقوام عالم میں سلام کی روایت انتہائی قدر و منزلت کی حامل رہی ہے۔ حسن سلوک، عقیدت و احترام اور باہمی ملاقات کے وقت خیر خواہی کے جذبات آداب و سلام اور کلمات خیر ادا کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ سلام کی ادائیگی کے پس منظر میں جو حقائق مضمحل ہیں ان میں حسن سلوک کی ابتدا و اولیت، بہتری اور نیکی کی ادائیگی میں پہل کرنے کے علاوہ مخاطب کی عظمت کو تسلیم کرنا شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلام کرنے والا مخاطب کے لیے نیکی اور خیر

خوانی کا پیام بر بھی بن جاتا ہے۔ سلام کے حوالے سے سید وحید الحسن ہاشمی رقم طراز ہیں:

”..... دنیا کی تمام قوموں کا یہ رواج ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے سے ملتا ہے تو اسے سلام

کرتا ہے مجھے اس سے غرض نہیں کہ اس سلام کا مقصد کیا ہے لیکن اس عمل سے ابتدا، اولیت، پہل

اور مخاطب کی عظمت تسلیم کرنا ضرور واضح ہوتا ہے۔“ (۱۹)

اسلامی معاشرے میں سلام کو ایمانی و اعتقادی حوالوں کے مطابق نعمت، ثواب اور عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا حکم فرمایا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں درود و سلام کی ادائیگی کے ان طریقوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے جن کی بدولت رسول اکرم کی شان، عظمت اور بڑائی کو مکمل حقہ بیان کیا جاسکے۔ درود و سلام سے متعلق مختلف عناصر مثلاً شان رسالت، عقیدت و احترام، تاریخی واقعات اور اسلامی روایات کو ملحوظ خاطر رکھنے کی تلقین کی گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صفدر حسین کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

”..... ابتدا میں سلام کا مقصد اصلی بزرگان دین کی روحوں پر براہ راست درود و سلام بھیجنا ہوتا

تھا۔“ (۲۰)

اردو شاعری میں سلام کو مختلف اصناف کے حوالوں سے تحریر کیا گیا۔ نعت کے اسلوب میں لکھے جانے والے سلاموں میں درود و سلام کے بنیادی عناصر کا خاص خیال رکھا گیا۔ علاوہ ازیں شعراء نے حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے سلام لکھے۔ ان سلاموں میں عقیدت و احترام اور جذبہ و خلوص کے رنگ میں قابل احترام ہستیوں کے اوصاف حمیدہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات و حالات کی کرب ناک کو سوز و گداز اور رقیق القلبی کے لہجے میں موثر انداز میں ادا کیا جاتا ہے۔ مجالس ذکر شہدائے کربلا کے تقدس و احترام کے پیش نظر، سامعین کی توجہ مبذول کراتے وقت سکوت و خاموشی اور روح پرور ماحول پیدا کرنے کے لئے مرثیہ خوانی سے قبل بارگاہ شہدائے کربلا میں سلام کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ سلام میں عقیدت و احترام، محبت و اُلفت، جذبات و احساسات، تقدس و پاکیزگی کا رنگ غالب رہتا ہے۔ اس سلسلے میں امداد امام اثر کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... عموماً سلام میں واقعہ کربلا و شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسینؑ و مصائب حضرت

خاتون جنت و رحلت حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہم الی یوم القیام کے مضامین

داخل رہتے ہیں اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں

اندراج پاتے ہیں۔ علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی

زینت تصور ہے منظوم کیے جاتے ہیں۔“ (۲۱)

عصر حاضر کے نامور محققین اور ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ ”سلام“ اردو کی قدیم ترین صنف ہے (۲۲) اور اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے یہ دوسری قدیم اصناف کے ہم پلہ ہے۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر شارب ردو لوی کا سلام کے بارے میں یہ

کہنا کہ ”وہ علیحدہ ایک صنف کی حیثیت سے ادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں بناسکا“ (۲۳) محل نظر ہے۔ اگر معروضی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم اصنافِ سخن میں ”سلام“ وہ واحد صنف ہے جو ہر عہد میں عوام و خواص میں مقبول رہی ہے اور یہ صنف آج بھی اپنے موضوعاتی محاسن اور تکنیکی صفات کی بنا پر اہل دانش و بینش کی نگاہوں میں بے حد مقبول ہے۔ اس کی یہی دل آویزی دلپذیری اور ہر عزیزِ یاس کے ارتقا کا باعث بنی۔ اس صنفِ سخن میں بے حد وسعت اور وقعت ہے۔ اس لئے مختلف ادوار میں اس کی مختلف جہتیں اور سمتیں نظر آتی ہیں اور ہر عہد کے اہل علم اور دانشوروں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس صنف کے مبادیات اور مقتضیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف لغات نویسوں نے ”سلام“ کے لغوی معانی اور اصطلاحی مفہوم پیش کر کے اس صنف کی وضاحت کی ہے اور اس صنف کے حوالے سے چند اہم مباحث بھی پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ”سلام“ بحرِ بکرا کی طرح وسیع و عریض معانی رکھتا ہے اس کے مطالب و معانی مختلف مقامات پر مختلف ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لغت نویسوں، محققین اور ناقدین نے اس کے بارے میں اپنے اپنے طور پر گل افشائیاں کی ہیں۔ راقم الحروف کے لیے سردست یہ ممکن نہیں کہ وہ تمام لغت نویسوں کے معانی و افکار اس مقالے میں پیش کرے تاہم نمائندہ مورخین، ناقدین، محققین اور لغت نویسوں کے لغوی و اصطلاحی معانی پیش خدمت ہیں۔ اردو لغت میں ”سلام“ کے بارے میں یوں درج ہے:

”..... سلام۔ (فت س) اند

۱۔ تسلیم بندگی، آداب، کورنش

قاسم	کبرا	تجھ	پیغام
لیایا	با	تشریف	سلام

(۱۶۰۹ قطب مشتری، ۶)

عطارد	کیا	مشتری	کوں	سلام
کہ	شبہ	میں	ہوں	تیرا کمینہ غلام

(۱۶۰۹ قطب مشتری، ۷۲)

جو فرد جاہ سوں تو گھر منے تھے نکلے بھار
تو سور گھن اتر آ تجھے سلام کرے

(۱۶۷۸ غواصی، ک ۷۸)

یارو سلام میرا اس بار سیں کہو جا
مجھ ہجر کے یو دیکھ کوں دلدار سیں کہو جا

(۱۷۰۷ اولیٰ، ک ۸۰)

کہیے گر اوسے السلام علیک
ہے جواب سلام کچھ کا کچھ

(۸۲ء دیوانِ محبت (ق) ۱۵۲)

جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ
آپ کے باپ ہیں سلام کیجئے

(۱۸۸۷ء خیابانِ آفرینش ۳۹)

کیا ملنا جلنا کہاں کا سلام آداب
ساس منہ نکلتی رہیں اور وہ میسے چلتی ہوئی

(۱۹۱۵ء گردابِ حیات ۳۹)

آپ جہاں جا رہے ہیں ان کو ہمارا سلام کہیے گا

(۱۹۸۷ء گردشِ رنگ چمن ۵۵۳)

اُف کرنا کہنا

۲۔ رخصتِ خدا حافظ کی جگہ

اے عشقِ رخصت اے ہوس و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارالبقا ہوا

(۱۸۷۸ء گلزارِ داغ ۲۳)

سرابِ دہر کو میرا سلام اے ابرار
جہان بے سر و ساماں میں جی نہیں لگتا

(۱۹۵۱ء صدرنگ ۵۸)

۳۔ محاف رکھیے اور باز آیا کی جگہ ناامیدی اور مایوسی کے موقع پر بھی مستعمل۔

دربار ہو یا نہ ہو غرض کیا
اپنا تو سلام ہو چکا اب

(۱۸۲۳ء صحیفی دُستِ انتخاب رامپور ۶۹)

بظاہر مہربانی ہے تو دل میں بدگمانی ہے
سلام ایس عنایت کو عنایت اپنی رہنے دو

(۱۸۹۲ء مہتابِ داغ ۱۳۸)

بس سلام آپ کو ہے آج سے اے بندہ نواز
خوب پہچان گئے جان گئے مان گئے

(۱۹۱۱ء، نظمیں، ۲، ۱۵۳)

۴۔ نماز کا سلام جو نماز ختم کرنے کے لئے تشہد اور درود وغیرہ کے بعد پڑھا جاتا ہے۔ نماز ختم کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں طرف منہ پھیرتے ہیں اور ہر بار السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہیں۔

ہے اس بت کے طاق ابو کو
جو سجود و سلام ہے میرا

(۱۷۸۸ء، جہاں دار، ۲، ۶۵)

منہ موڑنا بتان حسیں سے حرام ہے
موقوف یہ نماز نہیں ہے سلام پر

(۱۸۵۴ء، غنچہ آرزو، ۵۹)

دوسری حدیث میں یہ دعا بعد فراغت سلام آتی ہے

(۱۸۷۳ء، مطلع العجایب (ترجمہ)، ۸۵)

وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں کچھ دیر تک کھڑا بڑا تاربا جب وہ سلام پھیر چکیں تو دل کھول کر بھڑاس نکالی۔

(۱۹۱۵ء، گرداب حیات، ۳۹)

۵۔ مسلمانوں کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں یا آپ کے روضہ مبارک کی طرف رخ کر کے السلام علیک اے پڑھنا درود محمدی

پوچھیے جنہیں رسول تمام
تب ہووے پورا سلام

(۱۵۷۸ء، خوب ترنگ (ادب و لسانیات)، ۲۶)

بھیجتا ہے جو سلام آپ اس کو دیتے ہیں جواب
اور جو پڑھتا ہے درود اس کو تو بے حد ثواب

(۱۸۷۲ء، محمد خاتم النبیین، ۱۵۷)

اس کے کرم نے کھینچ لیا جالیوں کے پاس
ڈرتا تھا میں سلام پڑھا میں نے دور سے

(۱۹۱۹ء شہوار، بیخود ۷۷)

۶۔ خدا کی طرف سے سلامتی کا نزول

کہا تجھ خدا نے کیا ہے سلام
بلایا تجھے آج اپنے مقام

(۱۶۰۹ء قطب مشتری، ۱۰)

تعیت نبی کی رخن تھی ہوا
سلام ہو شرف حق کرن تھی ہوا

(۱۶۵۷ء گلشن عشق، ۱۶)

۷۔ سلامتی، امن و امان

دنیاۓ حوادث میں سلام اور سکون کیا
اک حال پہ رہتی نہیں قائم کبھی دنیا

(۱۹۴۷ء شعر انقلاب، ۱۵۶)

ہیں آنسو شفاۓ دل جتا
رسول سلام و سفیر سکون

(۱۹۶۹ء مزمور میر مغنی، ۶)

۸۔ خدائے تعالیٰ کا وصفی نام

قوی و متین و بدیع و کریم
سلام و عزیز و صبور و حلیم

(۱۵۶۳ء حسن شوقی، ۹۵۳)

تمہیں ہے ملک ہو تو نہیں سلام
تمہیں ہے مہمیں تو نہیں نیک نام

(۱۶۰۹ء قطب مشتری، ۱۰)

یا قوی یا سلام یا قدوس
یا ولی یا قدیر یا حافظ

(۱۸۶۶ء گلدستہ امامت، ۵۳)

تو سلام و خالق و متعال و عدل و کریم
تو عزیز و باری و غفار و قہار و علیم

(۱۹۸۴ء الحمد، ۸۴)

۹۔ ایک قسم کی رٹائیہ اور مدحیہ نظم جو غزل کی ہیئت میں ہوتی ہے اور جس میں عموماً معرکہ کربلا کا ذکر ہوتا ہے

جس کو دیکھا تو ایک کام میں ہے
کوئی مجھے کوئی سلام میں ہے

(۱۷۹۱ء حسرت لکھنوی، طوطی نامہ، ۱۰۲)

نوحہ سلام کہنے کا ورد تھا دلگیر کا شاگرد تھا

(۱۸۶۳ء شرح اندر سجا، ۸۲)

اگر یہ قصیدے کے طور پر ہوتا ہے تو اس کو نجر اور سلام کہتے ہیں۔

(۱۸۶۳ء انشائے بہار بے خزاں، ۱۷)

مدح علی میں ہے یہ بلندی کلام کی
عرش بریں زمیں ہے ہمارے سلام کی

(۱۸۷۵ء دبیر دفتر ماتم، ۲۶۲۸)

حسب فرمائش دو چار سلام موزوں کیے تھے وہ یاد نہیں

(۱۸۸۸ء مکاتیب امیر مینائی، ۱۵۷)

۱۰۔ (۱) مرجا آفریں، کلمہ تحسین

سلام خانہ زہرا ترے چراغوں پر
بجھے ہیں شمع رسالت کی روشنی کے لئے

(۱۹۷۹ء دریا آخردریا ہے، ۴۰۱)

(۱۱) دعا (نور اللغات)

(تصوف) راضی برضائے الہی ہونے کو کہتے ہیں۔ (ماخوذ، مصباح التصوف، ۱۳۷)

۱۲۔ بے گزند، بے ضرر، بے ازار

منجملہ امور غریبہ کے معجزے پیغمبروں کے ہیں جیسے شق ہو جانا قمر کا..... سرد اور سلام

ہو جانا آگ کا۔ (۱۸۷۷ عجائب الخلق، ترمیم، ۱۳۷)

۱۳۔ قاتل کرنے یا داد طلب کرنے کے موقع پر مستعمل، مراد ہماری بات یا دعویٰ سچ نکلا۔

بندگی کام آگئی آخر

میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

(۱۸۵۱، مؤمن، ک، ۲۵)

۱۴۔ (کشتی) اکھاڑوں میں کشتی پٹے یا تلوار وغیرہ کے کرتب دکھانے سے قبل استاد کی عظمت

اور اجازت لینے کے لئے شاگرد کا سلام

سلام لیتا ہے اس ٹھاٹھ سے وہ قاتل خلق

پٹے کا بانک کا جب سلام ہوتا ہے

(۱۸۶۷، رشک، (نور اللغات))

۱۵۔ (بیت) سال کی ایک اکائی، ہزار سال کا عرصہ وہ ہزار سال کو سلام اور سو سلام کو اشار

..... کہتے ہیں۔ (۱۸۹۱، بوستان خیال، ۶۹۱۸)

(ع : (س ل م) (۲۳)

لفظ سلام کی معنوی سطح اُجاگر کرنے کے لئے فرہنگ آصفیہ کے مولف سید احمد دہلوی یوں تحریر کرتے ہیں:

”..... سلام (ع) اسم مذکر

۱۔ گردن جھکانا، تسلیم کرنا، درود تحیت، کورنش، بندگی، ڈنڈوت، پرنام، رام رام، جے گوپال

یا واللہ، عشق اللہ، مجرا، دعا، اشیر باد

زمانہ مہدی موعود گر پائے مومن

تو سب سے پہلے تو کہو سلام حضرت کو

۲۔ سلامتی، بے گزندگی، امن، پاکی از عیوب، امینیت، امان

۳۔ الف۔ رخصت، خدا حافظ، فی امان اللہ، سدھاریے

۴۔ الف۔ باز آئے معاف رکھیے دہائے پوچھیے

۵۔ الف۔ جو مرثیہ رباعی قطعہ غزل یا قصیدے کی طرز پر ہوا اور اس کے مطلع یا اول شعر میں لفظ مجرا، سلام، مجرائی، سلامی لایا جاوے تو اسے مجرایا سلام کہتے ہیں۔

سلام ان پہ جو کہتی تھیں دل پہ ہاتھ دھرے
خدا ہی جانے مرے لوگ جیتے ہیں کہ مرے
(آزردہ)

کہوں جو مجرائی وقت فنا حسین " حسین "
صدا مزار سے نکلے سدا حسین " حسین "

سلامی شہ پہ جو گزرے ستم کوئی تو پوچھیے گا
ہوا سر بے گنہ جو قلم کوئی تو پوچھیے گا
مجرا اسے جو شام سے لے کر سر شبیر
روئے تن اطہر سے ملا کر سر شبیر
(دبیر)

۶۔ خاتمہ نماز کا پہلا خواہ دوسرا سلام

۷۔ رخصت، جائے تشریف لے جائے، سدھاریے

اے عشق رخصت اے ہوس و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارالبقا ہوا
(داغ)

۸۔ الف (مجازاً) ناامید اور مایوسی کے موقع پر بھی آتا ہے۔

دربار ہو یا نہ ہو غرض کیا
اپنا تو سلام ہو چکا اب
(مصحفی) (۲۵)

علمی اردو لغت کے مولف اور ماہر لغات وارث سرہندی سلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”..... سلام (ز ع۔ مذ)

(۱) سلامتی

(۲) تسلیم آداب

(۳) رخصت کرنا، الوداع

(۴) بس جائے، معاف کیجئے

(۵) بجالانا۔ کسی نے جو بات نہ مانی ہو اس پر طنزیہ سلام

(۶) نماز کے آخر میں دائیں بائیں منہ پھیرنا

(۷) مایوسی کا اظہار

(۸) غزل کے انداز میں وہ نظم جس میں واقعات کر بلا کا ذکر کیا گیا ہو

(۹) کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام عرض کرنا، سلام

پھیرنا (محاورہ) نماز ختم کرنا

سلام پیام / پیغام : [ع صف] معنی یا نسبت کی بات چیت

سلام دینا : [ار محاورہ] افسر کا کسی آدمی کو اندر بلوانا

سلام روستائی بے غرض نیست : [ف مثل] سلام کرنے والے کا عموماً کوئی نہ کوئی مطلب ضرور

ہوتا ہے۔

سلام شوق : [ع اند بہ ترکیب فارسی] محبت اور اشتیاق کا سلام (برابر والوں کے لئے)

سلام علیکم : [ع کلمہ دعا] تم پر سلامتی ہو۔ مسلمان جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو یہ

کلمہ کہہ کر دعا دیتے ہیں۔

سلام علیکی : [ار امث ق] صاحب سلامت، علیک سلیم، جان پہچان

سلام کرائی : [ار۔ امث] سلامی، وہ رقم جو رخصتی کے وقت دولہا کے سلام کرنے پر دلہن والوں کی

طرف سے دی جاتی ہے۔

سلام کرنا : [ار محاورہ] ۱۔ سرماتھے یا سینے پر ہاتھ رکھنا۔ آداب بجالانا ۲۔ رخصت ہو جانا

۳۔ سر تسلیم خم کرنا، ہار ماننا، کسی کی بڑائی کا اعتراف کرنا، قائل ہونا، سراپنا ۴۔ دستبردار ہونا،

باز آنا ۵۔ خیر باد کہنا

سلام کہنا : [ار محاورہ] بندگی عرض کرنا

سلام لینا : [ار محاورہ] سلام کا جواب دینا (اشارے یا زبان سے)

سلام نیاز : [عف اند] عاجزی کا سلام (بڑوں اور بزرگوں کے لئے)

سلام ہونا: [ارمخاورہ] ملاقات ہونا، رو برو یا سامنے ہونا

سلام ہے: [ارمخاورہ] باز آئے، چھوڑا دستبردار ہوئے۔“ (۲۶)

مخزن المحاورات کے مولف منشی چرنجی لال لفظ ”سلام“ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”..... سلام دینا: ا۔ ف۔ م۔ (۱) رخصت کرنا، دور کرنا

ہے روز عید رنجش خاطر کو دو سلام

آؤ گلے لگو مرے کیسی نہیں نہیں

(آزردہ)

(۲) یورپین، سلام کہنا، بلانا، طلب کرنا، شکریہ ادا کرنا، زبانی رسید دینا

سلام کرنا: ا۔ ف۔ م۔ (۱) بندگی کرنا، رام رام کرنا (۲) خیر باد یا خدا حافظ کہنا (۳) چھوڑنا، ترک

کرنا، تیاگنا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے؟ کیا احرام؟

کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے کیا سلام

(میر تقی میر)

سلام ہے : ا۔ ند اوندیہ، جواب ہے، معاف رکھئے

میں تو مفت ہی خدا ہوئی بدنام

اس محبت کو آپ کی ہے سلام

(شوق)

سلامی اُتارنا: ا۔ ف۔ م۔ کسی رئیس یا نواب کی آمد میں توپیں چھوڑنا، تعظیمی فیر کرنا، سلامی پھیرنا،

و۔ ف۔ م۔ اندھا کر دینا، ناپینا کرنا۔“ (۲۷)

جامع اللغات کے مرتب خواجہ عبد المجید لفظ ”سلام“ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”..... سلام (ع، مذکر)

(۱) تسلیم، بندگی، آداب، کورنش، منستے، رام رام، پیری پونا، ڈنڈوت، پرنام، ہجرا، یاد اللہ

عشق اللہ، جے گوپال، گڈ مارنگ، گڈ آفٹرنون، گڈ ایونگ، خدا حافظ، رخصت،

سد ہاریئے، تشریف لے جائیئے، گڈ بائی، ٹاتا

(۲) سلامتی، امن، امان

(۳) نماز کے اخیر پر خاتمہ کے لئے مسلمان سر کو پہلے دائیں پھر بائیں طرف پھیرتے ہیں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہیں۔ یہ بھی سلام ہے۔

(۴) نظم بطور غزل جس میں معرکہ کربلا کا ذکر ہوتا ہے اور پہلے شعر میں ہجرا 'سلام' ہجرائی یا سلامی کا لفظ لایا جاتا ہے خدا کا نام ان معنوں میں پاکی از عیوب ہے، معاف رکھے، باز آیا، ناامیدی اور مایوسی کے موقع پر کہتے ہیں۔ الزام دینے کے موقع پر وسلم، محفوظ ہونا۔

سلام پہنچانا: (متعدی) پہنچنا (لازم) سلام کا پیغام پہنچنا
سلام پھیرنا: (متعدی) دیکھو سلام (۴) نماز ختم کرنا۔

سلام پیام یا پیغام: (مذکر) (۱) گفت و شنید بات چیت (۲) مٹلنی کی نسبت پیغام، نسبت کا ذکر اذکار

سلام جھک کر کرنا: (متعدی) ۱۔ ادب سے سلام کرنا ۲۔ طنزاً سلام کرنا ۳۔ شرارت میں استاد ماننا

سلام دینا: (متعدی) ۱۔ رخصت کرنا، الگ کرنا ۲۔ سلام پہنچانا ۳۔ انگریزی طریقے پر ملاقات کے لئے بلانا ۴۔ شکریہ ادا کرنا

سلام شوق: (مذکر) ایسا سلام جس سے شوق ظاہر ہو

سلام طلب: (صفت) سلام کا خواہاں

سلام علیک: (مونث) تو سلامت رہے تجھ پر سلام ہوا۔ سلام ۲۔ واقفیت، شناسائی، صاحب سلامت

سلام علیکم (مونث) ۱۔ تم پر سلامتی ہو، تم سلامت رہو، مسلمانوں کا سلام جب کسی کو ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں وہ جواب میں علیکم السلام کہتا ہے یعنی تم پر بھی سلامتی ہو۔

سلام قبول ہونا: (لازم) ۱۔ سلام منظور ہونا ۲۔ حاضری کی اجازت ہونا

سلام کرائی: (مونث) وہ نقدی یا زیور جو دلہن کے رشتہ دار دولہا کو دیتے ہیں۔

سلامی سلام کرنا: (متعدی) ۱۔ لوگوں کو سلام کرنے پر مجبور کرنا ۲۔ فتنوں کے بعد اچھا ہونے پر بچے کو کسی مزار وغیرہ پر لے جانا

سلام کر کے چلنا: (لازم) ناراض ہو کر جانا

سلام کرنا: (متحدی) ۱۔ مجرا کرنا "آداب بجالانا۔" (۲۸)

اردو کا جدید جامع اور مستند لغت قائد اللغات کے مولف ابو نعیم عبدالحکیم خان نشتر جالندھری سلام کے حوالے سے تحریر

کرتے ہیں:

"..... سلام (سلام) (ع) مذکر

(۱) آداب، تسلیم، بندگی، کورنش، ڈنڈوت

(۲) جائے، آب رخصت، بس

سلام پھیرنا: (۱) نماز کے خاتمے پر دائیں بائیں منہ پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا، نماز ختم کرنا

سلام پیام: (مذکر) (۱) بات چیت، گفت و شنید (۲) نسبت یا مقلنی کی بابت ذکر اذکار

سلام دینا: (۱) چھوڑنا، الگ کرنا، وداع کرنا، رخصت کرنا (۲) انگریزوں کی اصطلاح میں کسی کو

اندر آنے کی اجازت دینا یا بلانا

سلام روستائی بے غرض نیست: (ف) مثل، ضرورت مند کا آنا بے سبب نہیں ہوتا

سلام شوق: (ع) مذکر۔ شوق و محبت کا سلام

سلام علیکم: (مونث) تم پر سلامتی ہو، جیسے رہو، مسلمانوں کا سلام

سلام کرائی: (الف) مونث۔ وہ روپیہ یا زیور جو دلہن کے رشتہ داروں کو دیتے ہیں

سلام کرنا: (الف) (۱) بندگی کرنا، تسلیم کرنا، سر یا ماتھے پر ہاتھ رکھنا (۲) خدا حافظ کہنا، دست

بردار ہونا، چھوڑنا

سلام لینا: سلام قبول کرنا، سلام کا جواب دینا

سلام ہے: باز آئے، تم سے خدا بچائے، معاف رکھیے، ترک کیا، چھوڑا

سلامی: مونث (۱) سلام، تعظیم، سپاہیانہ سلام (۲) بندوقوں یا توپوں کے فیر سے پیشوائی یا تعظیم

کرنا (۳) پیش کش۔ نذرانہ (۴) زیور زیور پیہ، جو دولہا یا دلہن کو بیاہ کے موقع پر دیا جاتا ہے۔

سلامی اُتارنا: بندوقوں یا توپوں سے کسی با اختیار حاکم یا رئیس یا بادشاہ کی تشریف آوری پر اظہار

تعظیم کرنا، سلامی کی توپیں سر کرنا۔" (۲۹)

معروف لغت نسیم اللغات کے مولف نسیم امر و ہوی لفظ "سلام" کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"..... سلام: (مذکر) تسلیم کرنا، بندگی، کورنش (کہنا، کرنا کے ساتھ)۔ رخصت، خدا حافظ کی جگہ

اے عشق رخصت اے ہوس و آرزو سلام (داغ)

معاف رکھے باز آیا کی جگہ ہے

لوں میں نو چیز فقط گنتی گننانے کے لیے

ایسے توڑے کو سلام آئے ہیں نوخوان عبث

(جان صاحب)

سلام آخر نماز کا سلام، ناامیدی اور مایوسی کے موقع پر بھی آتا ہے

دیار ہو یا نہ ہو غرض کیا

اپنا تو سلام ہو چکا اب

(مصحفی)

ایک قسم کی مدحیہ نظم جو غزل کے طرز پر ہوتی ہے اور جس میں معرکہ کر بلا اور شہدائے کرلا کے

مضامین پیشتر ہوتے ہیں۔ الزام دینے کے لیے بھی سلام کہتے ہیں:

بندگی کام آگئی آخر

میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

(مومن)

پٹے کا سلام :

سلام لیتا ہے اس ٹھاٹھ سے وہ قاتل غلط

پٹے تک کا جب جب سلام ہوتا ہے

(رشک)

..... وہ رقم جو دولہا کو سلامی میں دی جاتی ہے، سلام پہنچنا، سلام کا پیغام پہنچنا، سلام پھیرنا، نماز کو ختم

کرتے وقت مقررہ طریقے سے سلام ادا کرنا، سلام پیام یا سلام پیغام (مذکر) رشتہ ناتہ کی چھیڑ

چھاڑ، بات چیت، سلام دینا، سلام کہنا، رخصت کرنا، حاکم کا کسی ماتحت کو بلانا (جاؤ سلام دو یعنی

اندر بلاؤ) اور کبھی کسی تحفے کو قبول کرتے وقت لانے والے سے کہتے ہیں جس سے مراد سکر یہ

ہوتا ہے۔ دولہا کو سلامی کی رقم دینا، سلام علیک..... (مونث) تسلیم، بندگی، ملاقات، شناسائی،

امیری ان کی دور کی سلام علیک ہے (سلام علیکم:..... آنے یا جانے کے وقت مسلمان یہ الفاظ

بولتے ہیں اور سننے والا وعلیکم السلام کہتا ہے۔ ”سلام کرائی“..... (مونث) وہ رقم جو دولہا کو

رخصت کرتے وقت دلہن کے رشتہ دار دیتے ہیں..... ”سلام کر کے چلنا یا سلام کر چلنا۔

ناراضگی سے رخصت ہونا..... سلام کرنا، آداب بجالانا، سلام علیکم کہنا، ماتھے پر ہاتھ باندھ کر تسلیم یا آداب کہنا ترک کرنا، چھوڑنا۔

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا
(داغ)

استادی برائی، چالاک کی وغیرہ کا قائل ہونا
پردہ اٹھا کے جب وہ دیدار عام کرتے
ایوب صبر کرتے تو ہم سلام کرتے
(امیر)

رخصت ہونا، خیر باد کہنا، الزام دینا
پیام ان کا جو آیا کہ ہم نہیں آتے
تو اٹھ کے درو جگر نے مجھے سلام کیا
(جلیل)

..... سلام لینا..... سلام قبول کرنا..... سلام ہونا..... ملاقات ہونا، سامنے ہونا..... سلام ہے.....
معاف رکھیے.....“ (۳۰)

”سلام“ کے حوالے سے علامہ وحید الزماں نے ”لغات الحمدیث“ میں چند اہم نکات بیان کیے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

”..... سلام: اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے یعنی ہر عیب اور آفت اور تغیر اور فنا سے پاک اور محفوظ ہے۔ بہشت کو دار السلام کہتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے یا وہ سلامتی کی جگہ ہے وہاں کوئی آفت بیماری اور مصیبت نہیں آسکتی۔

احدہم من یدخل بیتہ بسلام۔ تین شخصوں کا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اُن میں سے ایک وہ ہے جو اپنے گھر میں سلامتی کے ساتھ بیٹھا رہے (تمام فتنوں اور فسادوں سے الگ رہ کر گوشہ نشینی اختیار کرے) یا جو شخص گھر میں گھستے وقت گھر والوں کو سلام کیا کرے۔ قل السلام علیک فان علیک السلام تحیۃ الموتی۔ زندہ لوگوں کو سلام کرے تو کہہ السلام علیک لیکن علیک السلام مردوں کے لئے کہتے ہیں (عرب لوگوں کی عادت تھی مردوں کو سلام کرتے تو علیک کا لفظ مقدم کرتے کیونکہ مردوں کا جواب سننے کی توقع نہیں ہے اس لئے پہلے ہی

سے جو جواب میں کہا جاتا ہے وہ اُن سے کہا گیا۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردوں کو السلام علیکم نہ کہو کیونکہ دوسری حدیث میں وارد ہے کہ آپ نے مردوں سے یوں خطاب کیا۔

سلام علیکم دار قوم مومنین یا السلام علیکم یا اہل القبور السلام علی اہل الدیار من المومنین السلام علیکم کا معنی یہ ہے کہ تم سلامت رہو یا اللہ تمہارا نگہبان ہے۔ السلام علیکم اور سلام علیکم اور صرف سلام سب طرح کہہ سکتے ہیں اور نماز کی تمامی پر السلام علیکم کہنا چاہئے اگر سلام علیکم کہے گا تو بعضوں کے نزدیک کافی نہ ہوگا۔ نہایت یہ میں ہے کہ اگلے لوگ شروع میں سلام علیکم اور آخر میں السلام علیکم کہنا بہتر سمجھتے تھے اور قرآن شریف میں سب جگہ سَلَامُ آیا ہے بہ تنکیر۔ کان یسلم علی حق اکسویت (عمران بن حصین نے کہا) فرشتہ مجھ کو سلام کیا کرتا تھا (جب تک بیماری میں میں نے داغ نہیں لیا تھا حق تعالیٰ پر بھروسہ کیا تھا) جب داغ لیا اور دوا دار کی طرف متوجہ ہوا تو فرشتے نے سلام کرنا چھوڑ دیا..... اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ داغ لینا دوا دار کو کرنا منع ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دوا دار کو کرنا ادنیٰ درجہ والوں کا کام ہے اور جو لوگ توکل کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے ہیں وہ ہر بیماری اور دکھ میں اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں شفا دینے والا وہی ہے اور دوا دار و طبیب کو ایک ڈھکوسلا خیال کرتے ہیں۔ صاحب نہایت نے ایسا ہی کہا ہے اور اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہمارے پیغمبر صاحب نے جو سید المتوکلین تھے دوا کی ہے اوسعد بن معاذ کو اپنے ہاتھ سے داغ دیا اُس کا جواب یہ ہے کہ دوا دار کو کرنا اُس وقت توکل کے خلاف نہیں ہے جب بھروسہ اللہ ہی پر ہونہ دوا دار و پر اور دوا دار کی نسبت یہ سمجھے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ اثر کرے گی ورنہ دوا دار اپنی ذات سے کچھ نہیں کر سکتی واللہ اعلم۔

فصرکت ثم ترک فعاذ السلام۔ پہلے سلام موقوف ہو گیا (جب میں نے داغ لیا) پھر جب میں نے داغ لینا چھوڑ دیا (اور حق تعالیٰ پر پورا بھروسہ کر دیا) تو دوبارہ فرشتے مجھ کو سلام کرنے لگے (اُن کو بواسیر کی بیماری تھی اُس کے دفعیہ کے لئے انہوں نے داغ لیا تو فرشتوں نے اُن کو سلام کرنا چھوڑ دیا پھر داغ چھوڑا اُس سے منہ موڑا تو پھر سلام شروع ہو گیا۔“ (۳۱)

علامہ قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی اپنی تصنیف ”اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا“ میں سلام کے حوالے سے چند دلچسپ

حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

”—— سلام

مجالس میلاد میں بعد ذکر ولادت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلام پڑھتے ہیں یہ اکثر

بصورت غزل ہوتا ہے۔ بہت سے شعراء نے سلام لکھے ہیں۔ مجلس عزائمیں مرثیہ سے پہلے سلام پڑھتے ہیں سلام بصورت مثنوی و رباعی بھی ہوتے ہیں۔

شہید فخر جو د جفا سلام علیک
سوار دوش رسول خدا سلام علیک
(لا اعلم)

ہو شہ کی ثنا میں سلامی سخن اپنا
جنت کے دروں سے ہو بھرا یہ دہن اپنا
(لا اعلم)

راقم سطور نے بھی حیدر آباد دکن میں اپنے ایک دوست کے اصرار پر ان کی مجلس کے لئے دو سلام لکھے تھے۔ جن کو جناب رشید لکھنوی نے پسند کیا تھا اور اخبارات نے شائع کیا تھا، مطلع تھا

سلام ان پہ جو سینہ سپر تھے حق کے لئے
رکھے ہوئے جو ہتھیلی پہ سر تھے حق کے لئے

شیخ چاند ایم۔ اے نے لکھا ہے کہ مولوی شبلی اور مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے کہا کہ سلام کی ایجاد لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء سے ہے۔ مجھے ان دونوں صاحبان کے اس قول پر تعجب ہے کیونکہ سلام سب سے پہلے غواصی دکنی ۱۰۳۵ھ/۱۶۳۶ء نے لکھا اس کے بعد مرزا دکنی ۱۰۶۷ھ نے لکھا

اے شہ عالی مقام شاہ سلام علیک
ہر دو جہاں کے امام شاہ سلام علیک
اسی نے ایک مجموعہ مرثیوں میں بھی مرتب کیا۔ ذوقی دکنی ۱۱۰۹ھ نے بھی سلام کہا۔

شمس البھٹی پر سلام بولو
بدر الدینی پر سلام بولو

شیخ جیون دکنی (گیارہویں صدی ہجری) نے محفل میلاد کا سلام لکھا۔ وقار ایک قدیم مرثیہ گو دکن کا شاعر تھا اس نے بھی سلام لکھا۔ میر باقر آگاہ ۱۲۰۷ء نے سلام لکھا۔ اگر مولوی شبلی اور مولوی سلیم کو ان دکنی شعراء کے کلام سے واقفیت نہ تھی تو کیا انہوں نے کلیات سودا کو بھی نہ دیکھا تھا اس میں تو دس سلام ہیں۔

نجی کے نور بصر پر کہو درود و سلام

علق کے لخت جگر پر کہو درود و سلام

مصطفیٰ نے اپنے شاگرد تہا کے متعلق لکھا ہے کہ اکثر سلام کہتا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو شعراء، خلیق، ضمیر ان سب کے بعد ہیں۔ میرے مرحوم عزیز ڈاکٹر عبدالرحمن المعروف بڈاکٹر بجنوری نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے برلن کے کتب خانہ میں ایک مخطوط مجموعہ دیکھا جو شجاع الدین نوری دکنی کے کلام کا تھا۔ اس میں ایک سلام محفل میلاد ایک سلام مجلس عزاء ایک سہرا بطریز غزل ایک مہندی بطریز غزل ایک معمرہ باسم امام قاسم اور ایک نوحہ مستزاد تھا۔“ (۳۲)

معروف و مقبول لغت ”فیروز اللغات“ میں مولوی فیروز الدین لکھتے ہیں:

”..... سلام: (سلام) (ع) مذکر

(۱) کورنش: بندگی، ڈنڈوت، تسلیم آداب (۲) بس: اب رخصت، چاہیے

سلام پھیرنا: (۱) نماز کے خاتمے پر دائیں یا بائیں منہ پھیر کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا، نماز ختم کرنا

سلام پیام: (۱) مذکر (۱) گفت و شنید، بات چیت (۲) مگنی یا نسبت کی بات ذکر اذکار

سلام دینا: (الف) (۱) رخصت کرنا، وداع کرنا، الگ کرنا، چھوڑنا (۲) انگریزوں کی اصطلاح

میں کسی کو اندر آنے کی اجازت دینا یا بلانا۔

سلام روستایاں بے عرض نیست: (ف) (مثل) ضرورت مند کا آنا بے سبب نہیں ہوتا۔

سلام شوق: (ع۔ مذکر) شوق و محبت کا سلام۔

سلام علیکم: (ع۔ مونث) تم پر سلامتی ہو، جیتے رہو، مسلمانوں کا سلام۔

سلام کرائی: (۱۔ مونث) وہ روپیہ یا زیور جو دہلین کے رشتہ دار دولہا کو دیتے ہیں۔

سلام کرنا: (الف) (۱) سریا ماتھے پر ہاتھ رکھنا، بندگی کرنا، تسلیم کرنا (۲) چھوڑنا، دست بردار

ہونا، خدا حافظ کہنا

سلام لینا: (الف) سلام کا جواب دینا، سلام قبول کرنا

سلام ہے: (الف) باز آئے، چھوڑا ترک کیا، معاف رکھیے، تم سے خدا بچائے۔“ (۳۳)

”اردو جامع انسائیکلو پیڈیا“ میں مولانا حامد علی خاں ”سلام“ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”..... سلام مرہی کی ایک ذیلی صنف جو ہیبت، بحر اور تعداد اشعار کے لحاظ سے غزل کا سا انداز

رکھتی ہے۔ اس کے آغاز میں اہل بیت پاک اور آئمہ معصومین پر درود بھیجا جاتا ہے۔ سلام اردو

شاعری کی مخصوص صنف ہے اور اساتذہ لکھنؤ نے اس کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔“ (۳۴)

”فرہنگ کارواں“ کے مولف فضل الہی عارف ”سلام“ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

”.....سلام: (ع۔ مذکر)

(۱) تسلیم بندگی آداب سلامتی امن (۲) غزل کے پیرایہ میں شہدائے کربلا کے حالات نظم کرنا

سلام پھیرنا: نماز ختم کرتے وقت اپنے داہنے بائیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا۔

نہ سجدہ در جاناں سے سر اٹھاؤں گا

یہ وہ نماز ہے جس کا کوئی سلام نہیں

(ناخ)

سلام روستایاں بے غرض نیست: ضرورت مند کا آنا بے سبب نہیں ہوتا۔

سلام علیکم: تم پر سلامتی ہو تم سلامت رہو۔ السلام علیکم کہیں تو پھر سلام کے ”م“ پر ایک پیش ہوگا۔

سلام کرنا (۱) السلام علیکم وغیرہ کہنا (۲) چھوڑنا، الگ ہونا قف (میں تو تم کو دور ہی سے سلام کرتا

ہوں)

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام

اس کوچے کے باشندوں نے سب کو یہیں سے کیا سلام

(میر)

سلام لینا: سلام کا جواب دینا

سلام ہے: ہم باز آئے ہم نے چھوڑا۔“ (۳۵)

”فرہنگ تلفظ“ کے مرتب اور معروف لفظ شناس شان الحق حقی سلام کے لفظی معنی پر روشنی ڈالتے ہیں:

”.....سلام: فتس۔ امد

امن، تحفظ، سلامتی، سلامتی کی دعا بطور اظہار دوتی، خوشنودی، تکریم، آداب، کورنش، تسلیم، نماز

کے ختم پر آخری قعدے میں دائیں سے بائیں منہ پھیر کر ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ کہنا، سلام

پھیرنا۔ (بطور طنز) برأت بے تعلقی کے اظہار کا کلمہ م: ایسی نوکری کو سلام ائمہ اہل بیت کی شان

میں منقبت، محفل میلاد میں رسول اللہ صلع کی شان میں کھڑے ہو کر پڑھے جانے والے نعتیہ

اشعار یا کلمات۔ مجاورہ

سلام زینا: بلوانا، طلب کرنا، ہم صاحب آپ کو سلام دیتے ہیں = یاد کرتے ہیں، بلاتے ہیں، نیز:

سلام دو = بلوالاؤ۔

سلام روستائی: دیہاتی کا سلام توجہ چاہنا مطلب کی ملاقات (بول چال)
سلام ہے: دور سے سلام ہے: کوئی واسطہ نہیں انکار یا بیزارى کے اظہار کے لیے
سلام علیکم: فت س تن صم م فت ع لے لین ضمہ ک فقرہ۔ تم پر سلامتی ہو۔ نیز
السلام علیکم: (اَس من لام ع لے گم) ع: واحد کے لیے

علیک / علیک خصوصاً واحد مونث کے لیے

علیک (کسح ک)۔ (۳۶)

”فرہنگ انیس“ میں نائب حسین نقوی لکھتے ہیں:

”..... سلام: (ار۔ر)

ہم باز آئے۔ ہم دُور ہیں۔

۔ سلام اگر بھی ہے سلام کو سلام

کھل جائے گا کھنچے گی جو کل تیغ انتقام

سلام پھیرنا: (ار۔ر) نماز کے آخر میں سلام پڑھ کر نماز ختم کرنا

۔ یہ ذکر تھا کہ شاہ نے پھیرا اُدھر سلام

وہ آخری نماز جماعت ہوئی تمام“ (۳۷)

مولوی سید تصدق حسین رضوی ”لغات کشوری“ میں رقم طراز ہیں:

”..... سلام:

سلام کرنا دعا دینا، گردن ڈال دینا اطاعت کے لیے پاکی بے عیبی خدا کا نام، نام ایک درخت کا

سلام ترازو: ف۔ ترازو کے ایک پلہ کا جھک جانا، مگر غلطی کی طرف کا۔“ (۳۸)

”نور اللغات“ کے مولف و مرتب مولوی نور الحسن نیر نے نہایت وضاحت کے ساتھ ”سلام“ کے لفظ پر روشنی ڈالی ہے

ملاحظہ فرمائیے:

”..... سلام (ع)

۱۔ فرماں برداری

۲۔ گردن جھکانا

۳۔ بے عیب ہونا

۴۔ بے آزار ہونا

۵۔ دعا

۶۔ خدا تعالیٰ کا نام

۷۔ سلامتی

اصل میں مصدر ہے بمعنی سلامت لیکن خدا تعالیٰ کے نام میں بمعنی سالم ہے یعنی وہ جس کی ذات ہر طرح کے عیب اور نقصان سے سالم اور محفوظ ہے۔

مذکر:

۱۔ تسلیم ہندگی، کورنش (کہنا۔ کرنا کے ساتھ)

۲۔ رخصت۔ خدا حافظ کی جگہ

اے عشق رخصت اے ہوں و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارالبقا ہوا
(دارج)

باز آیا کی جگہ

لوں میں نوچیز فقط گنتی گننانے کے لیے
ایسے تورے کو سلام آئے ہیں نوخوان عبث
(جان صاحب)

خاتمہ نماز کا سلام

منہ موڑنا بتان حسیں سے حرام ہے
موقوف یہ نماز نہیں ہے سلام پر
(صبا)

مایوسی اور نا اُمیدی کے موقع پر بھی آتا ہے

دربار ہو یا نہ ہو غرض کیا
اپنا تو سلام ہو چکا اب
(مصحفی)

ایک قسم کی مدحیہ نظم جو غزل کے انداز پر ہوتی ہے اور جس میں معرکہ کربلا کا ذکر ہوتا ہے (کہنا کے ساتھ)

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہو سلام پاک حضرت کا
(مومن)

کنایۃ الزام دینے کے لیے بھی سلام کہتے ہیں
بندگی کام آگئی آخر
میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا
(مومن)

بچے کا سلام
سلام لیتا ہے اس ٹھاٹھ سے وہ قاتل خلق
بچے کا بانک کا جب جب سلام ہوتا ہے
(رشک)

سلام پہنچنا۔ سلام کا پیغام پہنچنا
دیا رقیبوں کو تم نے پیام نام بنام
مری طرف سے بھی پہنچے سلام نام بنام
(داغ)

سلام پھیرنا۔ نماز ختم ہونا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے نماز ختم کرتے ہیں
پڑھیے سلام پھیر کے تسبیح فاطمہ
سمہ نظر میں عقد ثریا ہے نور کا
(منیر)

سلام پیام۔ سلام پیغام (مو) مذکر۔ گفت و شنید۔ بات چیت۔ معافی کی نسبت ذکر اذکار
سلام دینا

رخصت کرنا۔ دور کرنا

ہے روز عید رنجش خاطر کو دو سلام
آؤ گلے لگو مرے کیسی نہیں نہیں
(آزردہ)

انگریز اور ان کی تقلید میں بعض انگریزی وضع کے لوگ جب کسی کو ملاقات کیلئے اندر بلاتے ہیں تو کہتے ہیں سلام دو اور کبھی کسی چیز کے پہنچ جانے کا شکریہ ادا کرنے کیلئے سلام دو کہتے ہیں۔ سلام روستائی بے طمع نیست۔ سلام روستائی بے غرض نیست۔ (ف۔ روستائی۔ دیہاتی) شل۔ اُس کی نسبت بولتے ہیں جو کسی غرض سے بار بار آئے۔ سلام علیک (ع۔ تجھ کو سلام۔ تو سلامت رہے) مونٹ۔ بندگی، تسلیم، کورنش، صاحب سلامت۔ شناسائی۔ (فقرہ) میری اُن کی دور کی سلام علیک ہے۔ سلام علیکم۔ سلام علیکم۔ (ع۔ تم پر سلامتی ہو۔ تم سلامت رہو۔) جب کوئی شخص کسی مجلس میں آتا ہے یا کسی شخص سے ملتا یا رخصت ہوتا ہے تو یہ کلمہ زبان پر لاتا ہے۔ جواب میں دوسرا شخص وعلیکم السلام کہتا ہے۔ سلام قبول ہونا۔ سلام منظور ہونا۔ حاضری کی اجازت ہونا۔

مزاج پوچھا جو کرتے تھے صبح و شام ہمارا
قبول ہوتا نہیں اب وہاں سلام ہمارا
(قدر)

سلام کرائی۔ مونٹ۔ وہ نقدی یا زیور جو دلہن کے طرف کے رشتہ دار دولہا کو رخصتی کے وقت دیتے ہیں۔ سلام کرنا۔ آداب بجالانا۔ (کنایہ) ترک کرنا۔ چھوڑنا۔

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا
(داغ)

اُستادی۔ بڑائی۔ چالاکی یا ہنرمندی کا قایل ہو جانا۔ (امیر) پردہ اٹھا کے جب وہ دیدار عام کرتے۔ ایوب صبر کرتے تو ہم سلام کرتے۔ رخصت ہونا۔ خیر باد کرنا۔ (۳۹)

”سلام“ کے لفظ کی جامعیت کا احاطہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ یہ لفظ اپنے اندر جو جہان معانی رکھتا ہے اس کا مختصر سا

تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ”اردو دائرۃ معارف اسلامیہ“ میں تحریر ہے:-

”.....قرآن مجید میں یہ لفظ ۳۵ آیات میں تکبیر (سلام) اور تعریف (السلام) دونوں شکلوں میں مختلف معنی کے لئے وارد ہوا ہے۔

(۱) تحیہ کے لئے جیسے وہ تحفہم فیہا سلم (۱۰ یونس، ۱۰) یعنی اہل جنت ایک دوسرے کو لفظ سلام سے تحیہ پیش کریں گے۔

(۲) بطور تبریک یا خوش آمدید جیسے سلم علیکم بما صبرتم فنعیم عقبی الدار (۱۳۳ الرعد ۲۴) یعنی دنیا میں صبر کرنے والوں کو بطور تبریک یا خوش آمدید کہا جائے گا کہ تم پر سلام ہو کہ تم نے صبر کیا اب دار آخرت تمہارے لیے بہت عمدہ ٹھکانا ہوگا۔

(۳) امن و سلامتی کے معنی میں جیسے سلم ہی حتی مطلع الفجر (۹۷ القدر ۵۰) یعنی یہ امن و سلامتی طلوع فجر تک رہتی ہے۔

(۴) پاکیزہ باتیں جیسے لا یسمون فیہا لغوا ولا تأتید الا قیلا سلما سلما (۵۶ الواقعة ۲۵، ۲۶) یعنی اہل جنت وہاں نہ تو کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ خلاف تہذیب بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آوازیں آرہی ہوں گی۔

(۵) جنت الفردوس کے معنی ہیں جیسے واللہ یدعو الی دار السلام (یونس ۲۵) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سلامتی کے گھر (جنت الفردوس) کی طرف بلاتا ہے۔

(۶) بامعنی درود اور سلام جیسے وسلم علی المرسلین (۳۷ الصف ۱۸۱)

(۷) غضب الہی سے نجات جیسے وسلم علی من اتبع الهدی (۲۰ طہ ۴۷) یعنی سلامتی اس کے لیے ہے جس نے ہدایت کا اتباع کیا۔

(۸) بس بات ختم ہوئی جیسے فاصح عنہم وقل سلم فسوف یعلمون (۴۳ الزمر ۸۹) یعنی ان کافروں سے درگزر کیجئے اور کہیے کہ بس سلام ہے۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

(۹) السلام اللہ کے اسمائے حسنی میں سے ایک اسم کے طور پر بھی آیا ہے۔

هو اللہ الذی لا الہ الا هو الملک القدوس السلام (۵۹ الحشر ۲۳)

اور علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ”وہ ذات جو ان لوگوں کو حادثہ سے پاک ہے جو مخلوق کو لاحق ہوتے رہتے ہیں جیسے عیوب آفات اور فنا وغیرہ“۔

(النبیۃ ۹۱، ۹۲ بعد مفردات القرآن ۲، ۷ بعد) (۴۰)

درج بالا صفحات میں راقم الحروف نے شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ لفظ ”سلام“ کے لغوی مطالب پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالی جائے اسی لیے راقم نے لغت نویسوں کے افکار و نظریات کو زیادہ سے زیادہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بعض اصحاب نے لفظ ”سلام“ کے لغوی معانی کے ساتھ ساتھ جزوی طور پر اس کے اصطلاحی معانی بھی پیش کیے ہیں تاہم درج ذیل صفحات میں ”اردو سلام“ کے مروجہ اصطلاحی معانی بھی پیش خدمت ہیں تاکہ قارئین اس صنف سے کما حقہ آگاہ ہو سکیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان و ادب کے بیشتر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ادبی اصطلاح میں سلام سے مراد

ایسی صنف سخن ہے جس میں اہل بیتؑ شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان پر درود و سلام بھیجا جاتا ہے۔ سلام عام طور پر مجلس میں مرثیہ سے قبل پڑھا جاتا ہے جس میں اہل بیت کے مناقب بیان کئے جاتے ہیں۔ پھر ان پر سلام بھیجنے کے بعد مرثیہ خوانی یا سوز خوانی کی جاتی ہے چنانچہ ادبی اصطلاح میں سلام اس صنف شاعری کو کہتے ہیں جس کے اشعار میں اہل بیت کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے اور ہیئت کے اعتبار سے غزل سے قریب تر ہے۔ اس صنف میں شعرا کرام غزل کی عروضی ہیئت میں رسول اکرمؐ آئمہ اطہار اور اہل بیت سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کارناموں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ راہ حق میں شہیدان کربلا نے جو عظیم قربانیاں پیش کیں انہیں سراہا جاتا ہے تاکہ اعلیٰ اقدار حیات کی ترویج و تبلیغ کا کام لیا جاسکے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سلام کے اصطلاحی معانی یوں بیان کرتے ہیں:

”سلام بہ اعتبار معنوی منقبت کی ایک صورت تھی اور انہیں رعایتوں اور خصوصیتوں کی بنا پر اصطلاح شاعری میں اس کا نام ”سلام“ تھا لیکن انقلاب زمانہ کے ساتھ سلام کی ظاہری اور معنوی دونوں صورتوں میں تبدیلیاں آئیں۔ ظاہری تبدیلی یہ ہوئی کہ کچھ دنوں بعد لفظ ”سلام“ کی ردیف بنانے کی قید نہ رہی اور معنوی تبدیلیوں کی صورت یہ رہی کہ حضرت امام حسین اور ان کے اعزاء و رفقاء کی قربانیوں کے توسط سے بہت سے اخلاقی، اصلاحی اور حکیمانہ پہلو بھی سلام میں داخل ہو گئے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کربلا کے دل دوز واقعات کی معرفت شاعر کے واردات قلبیہ کا تعلق تو ”سلام“ سے قائم ہی تھا جب اس میں واردات قلبیہ اور محسوسات حزن و غم کے دوش بدوش دوسرے مضامین بھی جگہ پانے لگے تو ”سلام“ بلحاظ معنی غزل سے بہت ہی قریب ہو گیا۔“ (۴۱)

مہذب اللغات کے مولف صنف سلام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ردیف و قوافی کی پابندی کے ساتھ غزل کی طرز پر واقعات کربلا اور فضائل و مصائب سید الشہداح حضرت امام حسین علیہ السلام سے متعلق اشعار۔“ (۴۲)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی سلام کے حوالے سے موازنہ انہیں و دبیر میں چند اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے ملاحظہ فرمائیے:

”..... اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسام سخن میں اسی کو سب سے

زیادہ فروغ ہوا۔ عام مرثیہ گوئیوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ

اختیار کیا لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ

نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔“ (۴۳)

”سلام“ کے حوالے سے علی جوادی کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

”..... سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے جو صرف اردو میں پھلی پھولی عربی میں متفرق اشعار جو سلام سے موضوعاتی رابطہ رکھتے ہیں اس زبان کے قصائد میں مل جائیں گے لیکن ایک جداگانہ صنف کے اعتبار سے سلام کا عربی میں وجود نہیں۔ فارسی میں کچھ سلام مل جاتے ہیں لیکن بے رتبہ ہیں۔“ (۴۴)

معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر تقی عابدی صنف سلام کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”..... رثائی ادب میں سلام رباعی اور مثنوی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بالخصوص سلام پر تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے..... صنفی اعتبار سے عربی ادب میں سلام موجود نہیں۔ ایرانی فارسی ادب میں بھی ہمیں اردو شاعری میں مروج سلام نہیں ملتا۔“ (۴۵)

سید وحید الحسن ہاشمی اردو سلام کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”..... مفہوم کے لحاظ سے ہر ناقد نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سلام وہ صنف سخن ہے جس میں اہل بیتؑ اور شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض ناقدین نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے اس کا انداز غزل کا سا ہے۔ ردیف و قوافی کی پابندی اور تعداد اشعار کے سلسلے میں یہ غزل ہی کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ البتہ دونوں میں یہ فرق ملحوظ خاطر رہے کہ غزل کا زیادہ تر تعلق واردات قلبیہ سے ہے اور سلام میں واقعات و حادثات کربلا کا تذکرہ ہوتا ہے۔“ (۴۶)

سید علی رضوی اردو سلام نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”..... سلام ہمارے رثائی ادب کی مقبول ترین صنف سخن ہے جس میں غزل کے عروضی اسلوب، آہنگ اور ہیئت کے اندر رسول کریمؐ اہل بیت اطہارؑ اور شہدائے کربلاؑ آئمہ معصومینؑ کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تعبیر بیان کی جاتی ہے۔ خصوصاً کربلا کے واقعات اور سید الشہید حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی داستان ایثار و شہادت اور واقعہ عزم و قربانی اپنے اندر لازوال بصیرتیں اور بہتر سیرت کی عمدہ مثالیں رکھتا ہے۔ اس لئے سلام کے کہنے والے بعض صورتوں میں اس فن سے قوم میں ملی بیداری، قومی شعور اور العزمی اور یقین پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اس صورت میں اس محدود اور مخصوص فن سخن کی ہمہ گیری اور وسعت میں صرف اضافہ ہی بہتر نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثر و نفوذ کے رشتے عوام کے جذبات و احساس سے پیوست ہو جاتے ہیں۔“ (۴۷)

نواز حسن زیدی اردو سلام کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

”..... دورِ حاضر میں سلام نگاری کا تعلق اہل بیت اور آئمہ معصومین کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تعبیر کے بیان سے جدید عہد میں سلام کے دائرے میں مسائل حیات و کائنات پر تبصرے، اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیز دیگر امورِ جلیلہ کو نظم کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے تاکہ عملِ خیر کی ترغیب دی جاسکے۔“ (۴۸)

ڈاکٹر اسداریب ”سلام“ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

”..... ایک وقت وہ آیا کہ غزل کے جذبے کی دہائی ہوئی چنگاری مرثیہ گوئیوں کے آتش کدہ فکر میں پھر ایک بار سلگ اٹھی۔ غزل کے سبب ہوئے جذبے نے مرثیہ میں سلام کا روپ دھار لیا۔“ (۴۹)

اب چند معروضات ”سلام کی ہیئت“ کے بارے میں بھی سن لیجئے۔

سلام کی ہیئت کے بارے میں مختلف نقادانِ ادب متفق ہیں کہ سلام ہیئت اور تکنیکی اعتبار سے جدید شکل میں غزل سے قریب تر ہے۔ جس طرح غزل میں ردیف اور قوافی کا التزام روا رکھا جاتا ہے بعینہ سلام میں بھی ردیف و قوافی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غزل کی مانند سلام میں بھی مطلع اور مقطع کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں غزل کی بحر بھی سلام نگاری کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ گویا اردو کی شعری روایت میں سلام کی ایجاد غزل سے مشروط ہے۔ دونوں میں بے حد مماثلت و مشابہت موجود ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف موضوعات و مضامین کا جو ان دونوں اصنافِ شعری کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔

اردو ادب کے قدیم تذکروں مثلاً ”آب حیات“ گل رعنا، شعر الہند معیار الشعراء، نکات الشعراء اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں سلام کی کوئی الگ ہیئت بیان نہیں کی گئی۔ تاہم مرثیہ کے ضمن میں بلکہ الحاقی طور پر سلام کا تذکرہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ”موازنہ انیس و دبیر“ میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”..... اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں اس کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ عام مرثیہ گوئیوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا۔ لیکن غزل کی لئے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی کہ لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بناء پر انہوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحریں بھی وہی غزل کی ہوتی ہیں۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرحِ مختلفہ اور نئی بندش سادہ اور صاف مضمون درد انگیز اور پرتاثر ہو۔“ (۵۰)

یہ بات طے ہے کہ سلام اور غزل میں بے حد مماثلت موجود ہے چونکہ سلام نے ہیبتی سطح پر بعد میں غزل ہی کے بطن سے جنم لیا ہے اس لئے سلام میں غزل کے خدو خال کا پیدا ہو جانا ایک فطری بلکہ جبلی عمل ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی سلام کی ہیبت کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

”..... سلام غزل کی ہیبت میں لکھا جاتا ہے۔ غزل کی طرح سلام میں بھی مطلع اور مقطع ہوتا ہے۔ قوافی کی ترتیب بھی غزل کی ہیبت کے مطابق ہوتی ہے۔ غزل کی طرح سلام میں بھی ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتا ہے جس کا دوسرے شعروں کے ساتھ منطقی اعتبار سے مربوط ہونا ضروری نہیں یعنی غزل کی طرح سلام میں بھی تمام اشعار کا متحد المضمون ہونا لازم نہیں بلکہ مختلف المضمون ہونا ہی انب ہے۔ غزل کی طرح سلام کے لیے بھی کوئی عنوان تجویز نہیں کیا جاسکتا۔ سلام میں بھی تعداد اشعار زیادہ تر دس بارہ ہی ہوتی ہے۔ ایجاز و اختصار اور نکتہ بندی کو سلام گو شعراء بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ غرضیکہ جہاں تک فارم کا تعلق ہے سلام اور غزل میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ (۵۱)

اس طویل اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ غزل کی صفات سلام نگاری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فنی اور تکنیکی اعتبار سے جو باتیں غزل میں ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہیں وہی باتیں سلام گو شعراء کے پیش نظر رہتی ہیں۔ غزل کی نمایاں صفت ایجاز و اختصار اور نکتہ بندی ہے جو سلام نگاری میں بھی موجود ہے۔ غزل کے طاق اشعار کی مانند سلام میں بھی اشعار کی تعداد گیارہ، تیرہ اور پندرہ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی رائے بیان کرتے ہیں:

”غزل کی طرح سلام کے تمام اشعار مقفی ہوتے ہیں۔ سلام میں غزل کی طرح مطلع و مقطع بھی ہوتا ہے اور اشعار کی تعداد بالعموم پندرہ سے تجاوز نہیں ہوتی۔“ (۵۲)

چونکہ سلام کو عموماً پابند شاعری کے دیئے ہوئے سانچوں کے مطابق تحریر کیا جاتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر شعراء نے غزل ہی کی تربیت اور طبیعت کو سلام میں شریک کیا ہے اور غزل کے مزاج کو سلام کی عقیدتوں میں شامل کیا ہے۔

سلام اور غزل کی ہیبتی مماثلتوں کے باوجود ایک بات بہر حال طے ہے کہ ہمارے ناقدین نے سلام کو مرثیے کی ذیلی صنف قرار دیا اور سلام کے ہیبتی ارتقا پر بالکل توجہ نہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلام اور غزل کی ہیبتی مماثلتیں تلاش کرنے والے ناقدین نے اردو سلام کی ترقی یافتہ شکل کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلام کی ابتدائی ہیبت مخصوص نہ تھی۔ ابتدا میں سلام مثلث، مربع اور مخمس ہیبت میں بھی کہے جاتے تھے اور اس کی مثالیں اسی مقالے میں آپ کو جگہ جگہ مل جائیں گی۔ سلام کی ہیبت کے حوالے سے ڈاکٹر سید صفدر حسین کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... ابتدا میں سلام کا مقصد اصلی بزرگان دین کی روحوں پر براہ راست درود و سلام بھیجنا ہوتا

تھا اور یہ تخصیص بھی نہیں ہوتی تھی کہ سلام صرف غزل ہی کی عروضی ترکیب کا پابند ہو چنانچہ متقدمین کے ذخیرہ کلام میں ہمیں جو نمونے ملتے ہیں اُن میں منفرد اشعار کے سلاموں کے علاوہ مثلث یا مربع ہیئت کے سلام بھی موجود ہیں لیکن نئے ادبی شعور اور مجلسِ عزاء کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے رفتہ رفتہ ”سلام“ کی ہیئت اور نفسِ مضمون کی ترکیب و تشکیل میں بعض تبدیلیوں کو رونما کیا چنانچہ رسولؐ و آئمہؑ سے براہِ راست مخاطب کا طریقہ بھی بدلا اور اب ”سلام نگار“ سامعینِ مجلس کو جنہیں ”سلام“ کی اصطلاح میں ”مجرائی“ یا ”سلامی“ کہتے تھے مخاطب کرنے لگے۔“ (۵۳)

ڈاکٹر شاربِ ردو لوی نے ”اردو سلام کی ہیئت“ کے حوالے سے درج ذیل نکات بیان کیے ہیں:

”..... مرچے کی تو رفتہ رفتہ ایک ہیئت بنتی گئی اور بلاآ خرمسدس کی شکل میں اردو کی عظیم بیانیہ شاعری بن کر ہمارے سامنے آیا اور جو شکل ابتدائی مرثیوں کی صورت میں غزل کی ہیئت میں ظاہر ہوتی تھی اس نے سلام کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح سلام کی تاریخ کی کڑیاں مرچے کی ابتدا سے ملی ہوئی ہیں۔“ (۵۴)

سید علی رضوی اردو سلام کی ہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”..... رباعی ادب میں ہمیں جو مواد ملتا ہے اس کی چھان بین اور تحقیق سے بات ظاہر ہوتی ہے کہ غزلوں کی عروضی ترکیب میں سلاموں کے علاوہ مثلث اور مربع میں بھی کثرت سے سلام موجود ہیں۔ یہ سلام عام طور پر عزا خانوں اور امام بارگاہوں میں مجلس سے قبل اور مجلس کے اختتام پر نوحہ خوانی کے کام آتے تھے، لیکن حالات کی تبدیلی اور زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر ان میں خیالات اور اظہارِ بیان کی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور بلاآ خراس کا ایک مستقل سانچہ (جس کو غزل کی عروضی ترکیب کہا جاتا ہے) مرتب ہو گیا اور اب جتنے بھی سلام کہے جا رہے ہیں وہ سب اس سانچے کے انداز اور اسی سانچے کے پابند ہیں۔

سلام کا بظاہر رشتہ اردو مرثیہ سے جڑا ہوا ہے جس وقت اردو میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا اور مختلف شہروں کے عزا خانوں میں مرثیائی پڑھے جانے لگے، سلام کی کوئی ہیئت مقرر نہیں تھی، لوگ حصولِ ثواب کی غرض سے رونے اور زلزلے کیلئے مثلث اور مخمس، مسدس یا غزل کے اسلوب میں کچھ شعر کہہ لیا کرتے تھے، جن میں ہر شعر اور ہر بندہ کائی کا درجہ رکھتا تھا کسی ربط یا تسلسل کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی، زبان اور بیان کے لحاظ سے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی

تھی۔“ (۵۵)

اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر اسداریب سلام کی ہیئت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

”..... سلام کی تکنیک اور ہیئت (Form) وہی ہے جو غزل کی ہوتی ہے۔ مطلع ہوتا ہے۔ قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے۔ مقطع کا اہتمام ہوتا ہے۔ غزل کی ساری تعریف اس پر ذرا سے تغیر کے ساتھ پوری اترتی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک الگ مفہوم رکھتا ہے اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنے ماقبل اور مابعد سے منسلک ہو اسی طرح سلام کے شعر ہیں کہ وہ مفہوم کے اعتبار سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔“ (۵۶)

سلام کی ہیئت، لوازم اور حدود کے بارے میں یہ باتیں نقادان مرثیہ کے ہاں تقریباً مسلمات کا درجہ رکھتی ہیں مگر شیخ چاند مرحوم نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد سودا کے بارہ (۱۲) میں سے تین (۳) سلام ہیں جو غزل کی بجائے مریع کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

”سلام کے جو لوازم اور مہمات موضوع حال کے سلام گو شعراء نے مقرر کر لیے ہیں ان کی سودا کے زمانے میں تجدید و تعین نہیں ہوئی تھی۔ اس کے زمانے میں سلام کہنے کا مدعا صرف یہ تھا کہ شہیدان کربلا اور خصوصاً امام حسینؑ کی جناب میں عقیدت مندانہ سلام و نیاز کا تحفہ بھیجا جائے جیسا کہ اس زمانے کے شاعروں کے اور خصوصاً سودا کے ہر سلام سے ثابت ہے۔“ (۵۷)

انہوں نے میر کے ایک مریع سلام کا بھی حوالہ دیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میر و سودا کے یہ سلام اس دور کی تخلیقات ہیں جب سلام کے لوازم پوری طرح متعین ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے ان سلاموں کی حیثیت تجرباتی چیزوں کی سی ہے۔ اگر ہم اردو شاعری کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں سلام کے لیے کوئی ہیئت مقرر نہ تھی بلکہ متقدمین شعراء کے ہاں سلام نگاری غزل کے علاوہ مثلث، مریع، مخمس میں بھی موجود ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سلام ایک مخصوص شعری پیکر میں ڈھلتا گیا۔ تا آنکہ غزل کی تکنیک سلام کا شعری ڈھانچہ ٹھہری۔ ابتدائی دور کے سلاموں کی ہیئت کا جائزہ لیتے ہوئے علی جواد زیدی یوں رقم طراز ہیں:

”..... ابتدائی دور میں سلام صرف غزل اور قصیدے کی ہیئت یعنی منفردہ کا پابند نہیں تھا۔ مثلث مریع اور ترکیب بند ہیئتوں میں بھی متقدمین کے سلام دیکھنے میں آتے ہیں۔“ (۵۸)

یہ حقیقت ہے کہ سلام کی صنف نئی نہیں ہے بلکہ اس کا سراغ ہمیں اردو کے آغاز ہی سے ملتا ہے۔ سلام گوئی کے اس مواد کی چھان بین اور تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دکن کے قدیم اردو شعراء اپنے سلاموں کی ردیف بھی عموماً ”سلام“ ہی رکھتے تھے مثلاً:

میں بھیجتا ہوں تجھے فاطمہؑ کے لال سلام
علیؑ کے باغ کے اے سرو نوںہال سلام (سودا)

ساتی کوثر کے پیارے السلام
تشنہ لب سید ہمارے السلام (میر)

بعد ازاں ہر شعر میں سلام اور السلام کے الفاظ کی تکرار کی بجائے سلامی، مجرائی، مجرئی یا مجرا کے الفاظ صرف ایک بار مخاطب کے طور پر استعمال ہونے لگے مثلاً

سلامی! اشک سے یہ چشم مومنین تر ہے
کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے (مصطفیٰ)

مجرئی! شہ نے کہا میں جو نہ بے سر ہوتا
حشر کو تاج شفاعت نہ مرے سر ہوتا (ضمیر)

اس قسم کے سلاموں میں سلامی اور مجرائی خود شاعر بھی ہو سکتا تھا اور حاضرین و سامعین بھی۔ رفتہ رفتہ یہ ہلکا سا مخاطب بھی غیر ضروری ہو گیا اور چند خاص مضامین کا شمول اور عام اعتقادی فضائی کافی سمجھی جانے لگی۔ سلام کی ہیئت جو آج مقبول اور مروج ہے اس کا آغاز میر انیس کے سلاموں میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بیان ہے:

”..... سلاموں کا مطالعہ تو یہاں تک ظاہر کرتا ہے کہ سلام میں غزل کی جن خصوصیات کا ذکر کیا

ہے وہ میر انیس ہی کی ایجادات میں شامل ہیں۔“ (۵۹)

اردو سلام کی ہیئت کا تعین کرنے سے قبل چند باتیں پیش نگاہ رہنا چاہئیں۔

(۱) اردو سلام کی ابتدائی ہیئت مخصوص نہ تھی اسی لیے شعراء نے مختلف ہیئتوں میں سلام کہے ہیں اور ان سلاموں کی مثالیں اس مقالے میں بھی موجود ہیں۔

(ب) اردو سلام کی مقبول ہیئت غزل کی ہے۔ ہمارے معروف اور مستند شعرا نے اسی صنف کو استناد بخشا ہے۔ تاہم یہ بات تحقیقی

اعتبار سے ہرگز قابل قبول نہیں ہے کہ میر انیس نے اپنے عہد میں سلام کی ہیئت کو غزل کے مطابق ڈھالا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول سید وحید الحسن ہاشمی انیس سے بہت پہلے سلام کی یہ ہیئت مخصوص بلکہ مقبول ہو چکی تھی۔ وہ رقم طراز ہیں:

”..... بعض نقادوں نے سلام کے مضامین اور اس کی ہیئت کا ذکر کرتے ہوئے جدید ساخت کے سلاموں کو میرانیس کی ایجادات میں شامل کر دیا ہے حالانکہ میرانیس سے بہت پہلے مکرنگ اور مصحفی کے سلام منفردہ بھی ہیں اور ان میں ادبی شان بھی پیدا ہو چکی تھی:

زنجی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا (مکرنگ)
ہے مصحفی کے کلام فصیح میں یہ سلام
ذرا زباں کی طرف دیکھ اور سخن کی طرف (مصحفی)..... (۶۰)“

(ج) اردو سلام کے بارے میں ہیئت کے حوالے سے یہ مغالطہ بھی عام ہے کہ انیس و دہیر نے سلام کی جو ہیئت مخصوص کر دی ہے اس سے سرمو تجاوز کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ رو یہ کسی طرح بھی قابل تحسین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عصر حاضر میں ہر ہیئت میں سلام کہا جا رہا ہے۔ سید آل رضا لکھنوی کا معروف سلام

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا
غریب دیتے ہیں پر سہ تمہارے پیاروں کا

مثنوی ہیئت میں ہے۔ اب تو جدید شعرا آزاد نظم بلکہ نثری نظم کی ہیئت میں بھی سلام تحریر کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سلام کی مقبول ہیئت تو غزل کی ہے تاہم اسے یہیں تک محدود رکھنا کسی بھی طور پر درست نہیں ہے۔ اردو سلام کی ہیئت کے حوالے سے ایک سوال ہنوز تشنہ طلب ہے کہ جب مرثیہ نے ابتدائی طور پر مختلف ہیئیں تبدیل کیں اور مسدس کی ہیئت کو حتمی طور پر قبول کر لیا تو صنف سلام کا کیا جواز باقی رہتا ہے اور اس کی ہیئت مرثیہ کے ساتھ ساتھ کیوں تبدیل ہوتی رہی.....؟؟ اگر اس اہم نکتہ پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس صورت حال کے بقول ڈاکٹر شارب ردو لوی دو اسباب ہیں:

”..... اول یہ کہ کسی محفل میں مرثیہ پڑھنے کے لیے ایک فضا بنانے کی ضرورت تھی تاکہ سامعین اپنے ذہن کو ایک طویل بیانیہ نظم سننے کے لئے تیار کر سکیں اور شاعر کو محفل میں ایسی فضا مل جائے جس میں اس واقعہ کو سننے کے لیے لوگ ہمہ تن گوش ہو سکیں اس مقصد کے لیے مرثیہ گو شعراء نے سلام اور رباعی کا استعمال کیا یعنی یہ ایک رواج بن گیا کہ مرثیہ پڑھنے سے پہلے شاعر پیش خوانی کے طور پر چند اشعار سلام کے پڑھنے لگا۔ ان سلاموں میں سے بعض زیادہ دردا انگیز سلام سوز خوانوں نے سوز میں بھی پڑھنے شروع کر دیئے۔ عشرہ محرم کے آخری دنوں میں جب ایک دن میں سینکڑوں مجلسیں ہوتی تھیں جن کی حیثیت گشتی مجالس کی ہوتی تھی اور جن میں مرثیہ پڑھنے یا

واقعہ کر بلا کے تفصیلی ذکر کا وقت نہیں ہوتا تھا۔ مختصر پڑھ کر لا دینے کا سامان سلام کے چند اشعار سے کیا جاتا تھا۔

سلام کے کہے جانے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد عام تھا اور روز ہی اس طرح کی محفلیں کہیں نہ کہیں ہوتی رہتی تھیں لیکن ایام عزا کے احترام میں عشقیہ شاعری یا غزلوں وغیرہ کا کہنا یا سنانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں غزل کے بدل کے طور پر سلام کہے جاتے تھے اور مشاعرے کے بجائے مسالے کی محفلیں ہوتی تھیں اس طرح ایک طرف شعر گوئی کے جذبے کی تسکین ہو جاتی تھی اور دوسری طرف ایام عزا کے احترام اور ثواب کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔“ (۶۱)

اسی بات کو ایک دوسرے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام اپنی نوعیت، اہمیت اور ہیئت کے اعتبار سے یقیناً اس قابل ہے کہ یہ ذہنوں کو جلد متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ یہ قاری اور سامع کو غزل کی طرح جلد یاد ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس صنف نے کیفیت، مزاج اور ہیئت کے حوالے سے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سلام کی ہیئت کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں پیش کردہ نکات کا جائزہ لیں تو درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

- ۱۔ ہیئت کے اعتبار سے سلام ایک مقصدی غزل ہے جس کا ہر شعر جدا جدا معنی اور مطالب رکھتا ہے۔
- ۲۔ غزل کی طرح سلام میں بھی رمز یہ انداز ہوتا ہے اور ایجاز و اختصار اس کی اہم خصوصیت ہے۔
- ۳۔ سلام میں بھی تعلی اور فخر و مباہات کے جذبات ادا ہوتے ہیں۔
- ۴۔ جس طرح غزل کے اشعار کی تعداد سات، نو اور گیارہ ہوتی ہے اسی طرح سلام میں بھی اتنی ہی تعداد معین ہے۔
- ۵۔ غزل کی طرح سلام میں بھی مخصوص استعارے اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔
- ۶۔ غزل میں حزن یہ اور طرب یہ دونوں قسم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سلام کا بھی یہی انداز ہے مگر طرب یہ انداز ایسا نہ ہو کہ شعر میں مسخر اپن پیدا ہو جائے۔
- ۷۔ غزل گو شعراء مرثیہ کہنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں مگر سلام بہترین طور پر کہہ سکتے ہیں۔

۸۔ جس طرح غزلوں سے اصلاحی اور انقلابی کام لیا گیا ہے اسی طرح سلاموں سے بھی یہ کام بطریق احسن لیا گیا ہے۔

۹۔ جدید غزل اور جدید سلام دونوں پر ترقی پسند کی چھاپ ہے۔

۱۰۔ صنف سلام کی ہیئت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔

۱۱۔ سلام کو محض ہیئت کی بنیاد پر جانچنا درست نہیں۔

۱۲۔ سلام میں اجمالی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۳۔ سلام میں شاعر اپنے عقائد کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔

۱۴۔ سلام نگار مربع، مخمس، مسدس، معری، آزاد، نثری کسی بھی شکل میں اپنا سلام پیش کر

سکتا ہے۔“ (۶۲)

اب ذیل میں مختلف النوع ہیئتوں میں لکھے گئے سلاموں کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ ان مثالوں کے ذریعہ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ عہد قدیم ہو یا جدید سلام کی کوئی ایک ہیئت اس صنف سے وابستہ نہیں رہی ہے۔ کبھی کسی ہیئت کو قبولیت عام کا درجہ ملا اور کبھی کسی دوسری ہیئت کو۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ جدید و قدیم دور کے سلام نگاروں نے سب سے زیادہ غزل کی ہیئت میں سلام لکھے ہیں۔

سلام..... ہاشم علی (۱۱۶۹ھ)

آج	پرخوں	کفن	ترا	اصغر
آج	سوکھا	دہن	ترا	اصغر
لال	ہے	گل	بدن	ترا
حیف	یو	بال	پن	ترا

کیوں ہے زلفاں کے بال تاروں تار
کیوں گلے سوں لہو کے جاری ہار
تجھ کو سوتے کبھو نہ لگتی بار
حیف یو بال پن ترا اصغر

اٹھ گلے کا لہو دھلاؤں میں
 نیند آئی تجھے سلاؤں میں
 چل ترا پالنا جلاؤں میں
 حیف یو بال پن ترا اسغر (۶۳)

سلام.....امامی (۱۱۹۳ھ)

محشر میں جب محمدؐ شاہ زمن اٹھیں گے
 سب انبیائے مرسل پر غم حزن اٹھیں گے
 حیدر علی لہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے
 لیتے لہو کے ہلکاں ہے ہے حسن اٹھیں گے

آلودہ خاک و خون میں دندان مصطفیٰؐ لے
 لہو سوں تر بتر سب دستار مرتضیٰؑ لے
 کلزے حسن کے دل کے جامہ حسینؑ کا لے
 تربت سے فاطمہؑ جب لے یو برن اٹھیں گے

دریائے غم میں ہرگز کرنے نہیں غواصی
 ہرچند تو امامی عالم سنے ہے عاصی
 امید تو قوی ہے پائے گا تو خلاصی
 کرنے کہیں شفاعت جب پختنؑ اٹھیں گے (۶۴)

سلام.....محمد ہاشم (۱۲۱۰ھ)

اے دُر دریائے سرمد السلام گوہر کان محمدؐ السلام
 اے سب کونین کے ایجاد کے وے ظہور کن کے مقصد السلام
 فاطمہ کے ناز کے پالے ہوئے مرتضیٰؑ کے ابن ارشد السلام

لخت جان والد و مادر حسین نور چشم جد امجد السلام
 اے مدینہ کے مسافر جا کئے دشت غربت بچ مرقد السلام
 اے بلائے کربلا کے جتلا کشتہ ملعون و مرتد السلام
 اے حسین ہاشم کے ہیں ہر امر میں
 ہو کرم میں تم مویۃ السلام (۶۵)

سلام..... (نظر)

یاراں ہزار حیف رسول خدا نہیں اور فاطمہؑ حسینؑ و حسنؑ مرتضیٰؑ نہیں
 تنہا حسین ان میں کوئی آشنا نہیں بازو نہیں رفیق نہیں دربا نہیں
 اصغر کو شہ نے گود میں لے کر مٹے نیر ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر
 بیداد کیا کیا تری تقصیر یو صغیر سیانا نہیں زبان نہیں دست و پا نہیں
 کہنے لگا ہے جب سول الم کے نظم میں بیت دنیا کوں دل سوں سہٹ کے تو یوں اس الم میں بیت
 دو جگ میں نظر کوں بجز اہل بیت مقصد نہیں مراد نہیں مدعا نہیں (۶۶)

سلام..... بہادر شاہ ظفر (۱۲۴۸ھ)

اُس کو مجرا جس کا نانا احمد مختار ہے جس کی ماں زہرا ہے بابا حیدر کراڑ ہے
 ایک تو بھائی حسنؑ سم سے جگر انگار ہے ایک بھائی اس کا عباس علم بردار ہے
 آپ کھینچے ہاتھ میں اسلام کی تلوار ہے
 قید ہو کر شام کو جس دم چلے زین اہل عبا پاؤں میں بیڑی گلے میں طوق اس پر پیادہ پا
 تازیانے جب دکھاتے آن کر اہل جفا کہتے تھے کچھ رحم بھی اس پر کرو بہر خدا
 ایک تو مظلوم ہے اور دوسرے بیمار ہے
 گو کہ اہل ظلم دیتے شہ کو تھے رنج و عقب پر یہی ہنس کے فرماتے تھے شاہ تشنہ لب
 کیا دکھاؤں ان کو برق آتش قہر و غضب امت جد ہے نہیں اک آن میں یہ سب کا سب
 لشکر اہل جفا ہوتا ابھی فی النار ہے

بازوئے شہ کے ہوئے جب ہاتھ شانوں سے جدا دیر تک عباس کو رویا کئے وہ بادشاہ
جا کے آخر نقش رو رو بصد آہ و بکا کہتے تھے سرور کہ اکبر ہے ضعیفی کا عصا
پر نہ ہو جب ہاتھ ہی تن پر عصا بیکار ہے
ہیں در دولت سے ہوتے بہرہ در شاہ و گدا پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجئے التجا
آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پر ظفر ہے آپ کا آئیے اب تو مدد کے واسطے بہر خدا
یا حسین ابن علی بندہ بہت ناچار ہے (۶۷)

سلام.....عزیز لکھنوی

شہید اعظم و فخر الم سلام علیک غریب کشتہ تیغ ستم سلام علیک
فروغ دودہ ختمی مآب نور اللہ بختہ شاہ جمیل و شیم سلام علیک
وہ خدا میں سر و تن سے کام آیا تو کریم و رہبر اہل کرم سلام علیک
مسح دین محمد مجدد اسلام ضیا فراز شہستان غم سلام علیک
فراز نوک سناں تیرے واسطے معراج بلند مرتبہ عالی ہمم سلام علیک
شہید آل محمد خلاصہ ایجاد نوادہ محی محترم سلام علیک
ابوالاعتمہ الاطہار سید الشہداء صحیفہ شرف مختتم سلام علیک
طواف کرتے ہیں جس کا ملائکہ شب و روز وہ تیرا کعبہ نقش قدم سلام علیک
ہر ایک زخم میں فردوس معرفت پنہاں بہار دین کی سرتا قدم سلام علیک
ہر اک مصیبت عظمیٰ کا خاتمہ تجھ پر خدائے لذت ذوق ستم سلام علیک
عزیز بھی ہے طلب گار تیری نصرت کا

امین و مونس ارباب غم سلام علیک (۶۸)

سلام.....سید آل رضا

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا غریب دیتے ہیں پر سنا تمہارے پیاروں
سلام اس پہ جو زحمت کش سلاسل ہے مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
سلام ان پہ جنہیں شرم کھائے جاتی ہے کھلے سروں پہ اسیری کی خاک آتی ہے

سلام بھیجتے ہیں اپنی شاہ زادی پر
 مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھائی
 اسیر ہو کے جسے شامیوں کے زخمے میں
 سیکندہ بی بی تمہارے غلام حاضر ہیں
 یہ سن یہ حشر یہ صدے نئے نئے بی بی
 پہاڑ رات بڑی دیر ہے سویرے میں
 زمین گرم تیشی کی سختیاں بی بی
 جناب مادر بے شیر پر بھی سب کا سلام
 ابھی کلیجے میں اک آگ سی لگی ہو گی
 نہیں اندھیرے میں کچھ سوچتا کہاں ڈھونڈیں
 نہ اس طرح کوئی کھیتی ہری بھری اجڑی
 نہیں لعینوں میں انساں کوئی خدا حافظ
 شریک حق درود و سلام پیغمبر
 سلام تم پہ رسول و بتوں کے پیارو
 سلام محسن اسلام خستہ تن لاشو
 بچے تو اگلے برس ہم ہیں اور یہ غم پھر ہے
 کہ جس کو سوپ گئے چلتے وقت گھر سرد
 ثار کر دیے بچے نہ بچ سکا بھائی
 حسینیت ہے سکھانا علی کے لہجے میں
 بچھے جو پیاس تو اشکوں کے جام حاضر ہیں
 کہاں پہ بیٹھی ہو خیمے تو جل گئے بی بی
 کہاں ہو شام غرباں کے گھپ اندھیرے میں
 وہ سینہ جس پہ ہوتی تھیں اب کہاں بی بی
 عجیب وقت ہے کیا دیں تسلیوں کا پیام
 ابھی تو گود کی گرمی نہ کم ہوئی ہو گی
 تمہارا چاند کہاں چھپ گیا کہاں ڈھونڈیں
 تمہاری مانگ بھی اجڑی ہے کوکھ بھی اجڑی
 درندے اور یہ بے وارثی خدا حافظ
 سلام سید لولاک کے لئے گھر پر
 سلام مہر شہادت کے گرد سیارو
 سلام تم پہ شہیدوں کے بے کفن لاشو
 جو چل بے تو یہ اپنا سلام آخر ہے (۶۹)

.....کشمورناہید سلام

تمہارے دم سے امام عالی

گلاب کے معجزے بھی صحرا میں ہم نے دیکھے

یہ ہم نے دیکھا

کہ وہ فضائیں بھی نیلگوں ہیں

جہاں کہیں رات ڈھل نہ پائی

یہ ہم نے دیکھا

کہ ریگ صحرا

ردائے زینبؑ کے غم میں بے حال
 نامرادی کے بین کرتی بلک رہی ہے
 یہ ہم نے دیکھا
 ہمارے پیاروں کے پیاسے
 ہونٹوں کی داستاں
 اب تلک رقم ہے
 ہر ایک موسم کے اوس لہجوں کو
 آگ بن کر جلا رہی ہے
 یہ ہم نے دیکھا زمیں کی قسمت میں جتنی
 زرداری تھی
 صرف صحرائے نجد ہو کر
 ہوا کی تحریر بن گئی ہے
 یہ ہم نے دیکھا
 تمام بچوں کے پھول چہروں کی آب
 جب کر بلا میں اُجڑی
 تو سبیں موج فرات بھی
 حدتِ نفاں سے ابل پڑی تھی
 تمہارے دم سے امام عالیؑ
 حباب کے معجزے بھی
 صحرا میں ہم نے دیکھے
 یہ ہم نے دیکھا
 کہ تم نہیں تھے تو ہر نظر میں
 تمہاری تصویر تھی ہویدا
 ہر ایک اورچ و فاپہ تحریر تھا اُجالوں کا سبز سایہ
 یہ ہم نے دیکھا

کہ تم نے پایا حیات و بعد حیات

وہ رتبہ شہادت

کہ نبض ہستی

فضا کی دہلیز سے لپٹ کر

بقائے غم کو ترس رہی ہے

تمہارے دم سے امام عالی

گلاب کے معجزے بھی محرا میں ہم نے دیکھے۔“ (۷۰)

..... سلام..... عارف عبدالتین

مرے حسین " تری روح جاوداں پہ سلام

تری شہادت بے مثل و بے کراں پہ سلام

تو آفتاب رسالت کی اک کرن بن کر

جہاں کی ظلمتِ شوریدہ سر میں اترتا تھا

بجا کہ تیرا وجود ایک دو گھڑی کے لئے

سپاہیوں کے بھنور میں ضرور ڈوبا تھا

مگر یہ ایک کرنِ وقت کے کرشمے سے

نہ جانے کتنی شعاعوں میں بٹ گئی آخر

زمانہ دیکھ رہا تھا ضیاء کے خنجر سے

رگِ حیات اندھیرے کی کٹ گئی آخر

مرے حسین " تری کامرائوں پہ سلام

جہادِ پاک کی ان ترجمانیوں پہ سلام

ہجومِ یاس ہراساں نہ کر کہ دل میں مرے

امیدِ شمع کی مانند ابھی فروزاں ہے

میں خود شہید کے سانچے میں ڈھل کے ابھروں گا

کہ میری روح میں عکسِ حسین " تاباں ہے

مرے حسین * ترے عکس مہرباں پہ سلام
 ترے ظہور کے انداز بے عیاں پہ سلام
 میں اپنی چشمِ تصور سے دیکھتا ہوں وہ دور
 جو تیرے نام سے منسوب ہو کے آئے گا
 وہ خوابِ حق جسے دیکھا تھا تیرے دل نے کبھی
 اسے حقیقتِ عظمیٰ بنا کے لائے گا
 مرے حسین ترے دورِ منتظر پہ سلام
 تری شہادتِ مقبول کے ثمر پہ سلام (۷۱)

سلام..... احمد فراز

حسین!

اے میرے سرِ بریدہ

بدنِ دریدہ

سدا ترانامِ برگزیدہ

میں کر بلا کے لہوِ ہودشت میں تجھے

دشمنوں کے زرخے میں

تیغِ در دست دیکھتا ہوں

میں دیکھتا ہوں

کہ تیرے سارے رفیق

سب مموا

سبھی جاں فروش

اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں

گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں

ہوائے جانکاہ کے بگولے

چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں

مسافر این رو وفات لٹا چکے ہیں

اور اب فقط تو!

زمین کے اس شفق کرے میں

ستارہ صبح کی طرح

روشنی کا پرچم لئے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے

اک داستان کا حصہ نہیں ہے

اک واقعہ نہیں ہے

یہیں سے تاریخ

اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے

یہیں سے انسانیت

نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج اسی کربلا میں

بے آبرو گلوں سر

فلکست خوردہ خجل کھڑا ہوں

جہاں سے میرا عظیم ہادی

حسین کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر

قضا کے دلدل میں جاں بلب ہوں

زمین اور آسمان کے عز و فخر

سارے حرام مجھ پر

وہ جاں لٹا کر

منارہ عرش چھو گیا ہے

سلام اس پر!

سلام اس پر! (۷۲)

سلام.....فارغ بخاری

حسینؑ میں تجھے خوں کا خراج کیسے دوں
توؑ زن میں آیا تھا خارا شکاف عزم لئے
ہے بے مثال زمانے میں تیری قربانی
تو وہ دلیر شجاعت بھی تجھ پہ فخر کرے
تو وہ عظیم کہ عظمت کو ناز ہے تجھ پر
تو وہ شہید شہادت ہے سرخ رو تجھ سے

جھکا نہ عزم ترا قلم کی مشیت پر
رکے نہ تیرے قدم دشتوں کی آندھی سے
ترے جلال نے ہر مصلحت کو ٹھکرایا

سلام تجھ پہ حریفانِ آذری کے خدا
سلام تجھ پہ فقیہانِ سرکشی کے رسول
سلام تجھ پہ مسلح بغاوتوں کے امام (۷۳)

سلام.....امجد اسلام امجد

میں نوحہ گر ہوں

میں اپنے چاروں طرف بکھرتے ہوئے زمانوں کا نوحہ گر ہوں
میں آنے والی رتوں کے دامن میں عورتوں کی اُداس باہوں کو دیکھتا ہوں
اور ان کے بچوں کی تیز چیخوں کو سن رہا ہوں
اور ان کے مردوں کی سرد لاشوں کو گن رہا ہوں
میں اپنے ہاتھوں کے فاصلے پر فصیلِ دہشت کو چھو رہا ہوں
زمین کے گولے پہ زرد کالے تمام نقطے ابھی سرخی میں جل رہے ہیں
نئی زمینوں کے خواب لے کر

مسافرانِ تباہ یا دوں کے ریگزاروں میں چل رہے ہیں!
 میں نوحہ گر ہوں مسافروں کا جو اپنے رستے سے بے خبر ہیں
 میں ہوش والوں کی بدعوا سی کا نوحہ گر ہوں
 حسین! میں اپنے ساتھیوں کی سیدہا سی کا نوحہ گر ہوں
 ہمارے آگے بھی کر بلا ہے ہمارے پیچھے بھی کر بلا ہے
 حسین! میں اپنے کارواں کی جہت شناسی کا نوحہ گر ہوں
 نئے یزیدوں کو فاش کرنا ہے کام میرا
 ترے سفر کی جراحاتوں سے
 ملا ہے مجھ کو مقام میرا
 حسین، تجھ کو سلام میرا!!“ (۷۴)

سلام..... اسرار زیدی

تباہ حال لے قافلے کا سناٹا!
 کبیدہ چہروں پہ رُک رُک کے جم گئے آنسو
 بجز ردائے فلک اب سروں پہ کچھ بھی نہیں

نہ رجز خواں کوئی باقی یہاں نہ تیغ و پر
 نہ چوبِ خیمہ نہ گنبد نہ کوئی پہرے پر
 صفیں اُجڑ گئیں سب ختم ہو چکا لشکر
 علم گھوٹے سو کون اب اسے بلند کرے؟

ہر اک شہید کا تاراج و سر بریدہ جسد
 ٹڈیال بھوک سے کوئی نہ لب پہ پیاس کا ٹھون
 فرات سامنے دو ہاتھ پر مچلتا ہوا
 خیام چلتے ہوئے دشتِ خون اُگھٹا ہوا (۷۵)

سلام..... اقبال کوثر

اس محشر خوں کے لمحے میں
 کتنی صدیوں کے آنسو ہیں
 اس پل کے کتنے پہلو ہیں
 ہر پہلو کیا کیا غم رکھے
 ہر شاخ پہ کیا کیا زخم عیاں
 ہر پھول میں کیا کیا داغ تپاں
 اب لاکھ صبا شبنم رکھے
 اب لاکھ ہوا مرہم رکھے
 داغوں کو تو جلتے رہتا ہے
 یہ خوں تو ہمیشہ بہتا ہے
 یہ خون جو تیری نسبت ہے
 ہر شام و سحر کا غازہ ہے
 ہر عہد کی سرخی تازہ ہے
 ہر کرب و بلا کے محشر میں
 اس خوں کی روایت برحق ہے
 اس خون کی یاد مکرم ہے
 اس خون سے سب کا خونِ دل
 اس غم میں سارے غم شامل
 اس نوحہ گری میں سب نوحے
 اس ماتم میں ہر ماتم ہے
 اے خونِ روانِ ابنِ علی
 ملتا ہے یہ تجھ سے درسِ جلی
 جو تیری رو میں چلتا ہے
 وہ عشق ابد میں ڈھلتا ہے

سلام.....جعفر بلوچ

انساں کی عظمت کا علم ہے تیری یاد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 تابہ ابد ہر انساں دے گا تجھ کو داد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 ایسی صورت ایسی سیرت کس نے پائی ہے؟ کیا یکتائی ہے
 پاک سرشت و پاک ضمیر و پاک نہاد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 دیں میں ملوکت جب آئی تو نے اسے ٹوکا تو نے اسے روکا
 اور اس راہ میں تو نے جھیلی ہر بیداد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 تیرے خوں سے اسلامی آئین فروزاں ہے دین فروزاں ہے
 کتنا البیلا ہے تیرا رنگ جہاد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 تو نے خالق کو شان تسلیم دکھائی تھی ورنہ کس کی تھی؟
 یہ دنیائے آتش و آب و خاک و باد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 خود اس راہ پہ چلنے والے ششدر و حیراں ہیں تجھ پر نازاں ہیں
 طرز شہادت تو نے کی ایسی ایجاد حسینؑ زندہ باد حسینؑ
 راہ خدا میں جانیں دینے والے زندہ ہیں خواہ نہ ہم سمجھیں
 سن لیجئے فطرت کا ترانہ زندہ باد حسینؑ زندہ باد حسینؑ !! (۷۷)

سلام (بہ شکل تراویح).....غفر علی ندیم

میں کیا بتا سکوں گا کہ کیا کیا حسینؑ ہیں
 بنیاد لا الہ کا حوالہ حسینؑ ہیں
 سب ہیں غلام جس کے وہ آقا حسینؑ ہیں
 میں کیا بتا سکوں گا کہ کیا کیا حسینؑ ہیں
 یکتا حسینؑ ہیں شاہ تھا حسینؑ ہیں
 دریائے اعطش کے شناسا حسینؑ ہیں
 میں کیا بتا سکوں گا کہ کیا کیا حسینؑ ہیں
 بنیاد لا الہ کا حوالہ حسینؑ ہیں

شہید ہو کے بھی زندہ رہا کرے کوئی
 ہر ایک عہد میں ایسا کیا کرے کوئی
 خدا کی ذات سے یوں بھی ملا کرے کوئی
 شہید ہو کے بھی زندہ رہا کرے کوئی
 عبادتوں کو بھی سب سے جدا کرے کوئی
 سر سناں بھی تلاوت کیا کرے کوئی
 شہید ہو کے بھی زندہ رہا کرے کوئی
 ہر ایک عہد میں ایسا کیا کرے کوئی (۷۸)

سلام.....احمد حسین مجاہد

ہوا ہے سر بہ گریباں سر فرات اب بھی
 شفق پہ سرخی خونِ امام " باقی ہے
 زمیں سے ہوتی نہیں کھل کے کوئی بات اب بھی
 ہوا ہے سر بہ گریباں سر فرات اب بھی
 نظامِ جبر سے ممکن نہیں نجات اب بھی
 فلک جو سکتے میں ہے اس کام باقی ہے
 ہوا ہے سر بہ گریباں سر فرات اب بھی
 شفق پہ سرخی خونِ امام باقی ہے (۷۹)

سلام.....حریم حیدر

یہ کیسا قافلہ تھا جس میں مختصر سے لوگ تھے
 یہ قافلہ یزیدیت کو روند کر نکل گیا
 شکستہ جسم و تشنہ لب وہ چند بندگانِ حق
 یقین جن کا دنیوی غرور کو نکل گیا
 یہ کیسا قافلہ تھا جس میں مختصر سے لوگ تھے

یہ مختصر سے لوگ ہی بنے ہوئے ہیں روشنی
ضمیر کی وفا کی اور صبر کی یقین کی
کوئی بھی قافلہ ہو اس کی گرد کو نہ پا سکا
کوئی بھی راہ پر نہ ایسا راستہ دکھا سکا

حسین تیرے خون کی مہک رہے گی تا ابد
جو تیغِ ظلم اب کبھی اٹھی کسی یزید کی
وہ آ کے تیرے نام پر انک رہے گی تا ابد

حسین تیرا قافلہ عظیم تھا عظیم ہے
یہ کربلا کا معرکہ عظیم تھا عظیم ہے
یہ حرف حق کا ماجرا عظیم تھا عظیم ہے
شہید ابن مرتضیٰ عظیم تھا عظیم ہے (۸۰)

سلام..... انیس احمد

خون ابن علی کا کہتا ہے
سچ کی عظمت کے پاسانوں کو
سرفروشی عزیز ہوتی ہے

۰۰۰

گو حسینی سپاہ پیاسی تھی
خونِ ناحق سے ریگزاروں کی
پیاس صدیوں کی بجھ گئی ہو گی

۰۰۰

ان کو پابند کربلا نہ کرو
بوجھ کاندھوں پہ خونِ ناحق کا
تاقیامت تنہی اٹھاؤ گے

اک بہانہ بنا کے فطرت نے
 خشک صحرا میں کارواں بھیجا
 پیاسا پیاسے کی یوں بجھا ڈالی (۸۱)

سلام..... آثم میرزا

حسین میرے

حسین سب کے

خلا کی رندھی مسافتوں کو

چراغِ حقِ عمل سے روشن بنانے والے

سلام اُن پر

سلام اُن پر

کہ زندگی کی روشِ روش کو نکھارنے کے

جوان جذبوں کی کامیابی کے وہ ہیں ضامن

سلام اُن پر

کہ جب بھی ظلمت کی آندھیوں نے

چراغِ عشقِ نبیؐ بجھانے کا جال پھینکا

تو مات کھائی

یزیدیت کی ہراک کڑی ٹوٹ کر

بکھر کر

نشان اپنا مانگئی تھی

سلام اُن پر.....

کہ تپتے صحرا کی وسعتوں نے جو حق پرستوں کے خون سے

گلشنِ صداقت سجا دیا تھا

وہ اب بھی قائم ہے

اب بھی مظلومیت کے سائے

فراٹ کی لہر لہر سے ایسے مل رہے ہیں
 کہ جیسے عالم کی بگڑی تقدیر
 اب سنورنے کی آخری حد کو چھو رہی ہو
 سلام ان پر.....

شجاعتوں کے صدائقوں کے
 چراغ جو کر گئے تھے روشن
 وہ اب بھی قائم ہیں
 بجھ سکے ہیں.....

نہ بجھ سکیں گے“ (۸۲)

سلام..... سید محمد رضوان جعفری عاصم

خالق کون و مکاں ہے لاشریک و بے مثال
 اور محمدؐ مصطفیٰ ہیں رحمت و سر جمال
 سیدہ خاتونِ جنتؑ عصمتوں کا ہیں کمال
 اور حسنؑ عصمتِ امامت کا ہر اول اتصال

خالق و مخلوق کا ہر آخری بندھن حسین
 ہیکرِ اسلام کا دل ہیں علیؑ دھڑکن حسین

شان و سرکار وفا عباؑ ہے ابنِ علیؑ
 زینبؑ و کلثومؑ ہیں صحنِ طہارت کی گلی
 پارہٴ قائم ہر اک ہے رہنمائے ہر دلی
 بدلہٴ مختار ثقفیؑ ضوفشاں ہے ہر گلی

وارثِ کل انبیاءؑ ہے وارثِ نبینِ حسین
 ہیکرِ اسلام کا دل ہیں علیؑ دھڑکن حسین

ہیں محمدؐ، عونؑ، کسن کی شجاعت کا بیاں
 اصغرؑ معصوم ظلمِ اشقیاء کر دے عیاں

اور علی اکبرؑ پدڑ کے عزم کی ہیں داستاں
 اور حبیب ابن مظاہرؑ ہیں بصیرت کا نشاں
 جس احاطے میں ہے دین حق ہے وہ آگنِ حسینؑ
 ہیکرِ اسلام کا دل ہیں علیؑ دھڑکنِ حسینؑ
 رہروانِ صبر کے سالار زین العابدینؑ
 اور سکینہؑ سے ہیں شرمندہ سبیلانِ زمیں
 جونؑ ، عشقِ آلِ احمدؑ کی مثالِ تائیکیں
 انبیاءؑ بھی کربلا والوں کے ہم پلہ نہیں
 راہِ حق کے ہر ٹھہر کا تابگرِ چندنِ حسینؑ
 ہیکرِ اسلام کا دل ہیں علیؑ دھڑکنِ حسینؑ (۸۳)

سلام.....سید وحید الحسن ہاشمی

یہ اختیار کتنا وسیع و بلند ہے
 سارا جہاں حسینؑ کی مٹھی میں بند ہے
 بدلا ہے کربلا میں تقاضائے انقلاب
 نیزے پہ اب جو سر ہے وہی سر بلند ہے
 کیا ان کی ہمتوں پہ کوئی تبرہ کرے
 بچہ بھی جن کے گھر کا شہادت پسند ہے
 ہر قوم چاہتی ہے کہ ہو جائے خود اسیر
 اتنی حسینیت کی موثر کمند ہے
 ایوانِ انبساط میں جنت نہ کر تلاش
 یہ تو غمِ حسینؑ کے آنسو میں بند ہے
 دیکھے جہاں حسینؑ کی آغوش کا کمال
 ہے تیر پست گردنِ اصغر بلند ہے
 اب اس سے بڑھ کے رنگِ مساوات کیا ملے
 فرشِ عزا پہ پست نہ کوئی بلند ہے

یہ دل پہ منحصر ہے مبارک تمہیں ہنسی
مجھ کو غم حسین میں رونا پسند ہے (۸۴)

اردو سلام کی متنوع ہیئتوں کے حوالے سے جو چند مثالیں گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان سے محض یہی ثابت کرنا مقصود ہے کہ اردو سلام کل بھی اور آج بھی کسی ہیئت کا پابند نہیں ہے تاہم سلام نگاری کی روایت میں اردو سلام کو مہر و ماہ میر انیس اور میرزا دبیر نے غزل کی ہیئت کو اپنا کر اسے مقبولیت بخشی اور بعد میں آنے والے زیادہ تر شعراء کرام نے اسی طرز اور انداز پر سلام کہے۔ مگر بعض عظیم شعراء آج بھی سلام نگاری کے لیے ہیئت کی پابندی قبول نہیں کرتے۔ انہوں نے مختلف اصناف شعری میں سلام کہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی قدغن شاعر کے افکار کو محدود کر دیتی ہے اور اسے اپنے جو ہر دکھانے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ چنانچہ اس ضمن میں ان شعراء اور نقادان ادب کی آراء درج کی جاتی ہیں جنہوں نے اس قدغن کے خلاف آواز بلند کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلام کو کسی ہیئت کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا میدان اتنا وسیع ہے کہ اس کو آزاد نظم اور نثری نظم میں بھی کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس کا اختصار، رمزیت اور تغزل مجروح نہ ہو۔ سلام تو دراصل جذبوں اور عقیدتوں کا اظہار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر ہیئت میں ان جذبات و احساسات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ غزل کہنے والا اپنے جذبات کو غزل کی ہیئت میں اور مثنوی کہنے والا اپنے احساسات کو مثنوی کی ہیئت میں بیان کر سکتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اگر کوئی شاعر مثنوی میں طبع رواں رکھتا ہے اور غزل گوئی سے اسے کوئی شغف نہیں ہے اور وہ اہل بیت کی خدمت میں سلام لکھنے کا متنی ہے۔ اس طرح وہ اگر غزل کی ہیئت میں سلام لکھے گا تو اسے بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ پھر وہ اپنا مافی الضمیر غزل کی ہیئت میں اس طرح کھل کر بیان کرنے سے قاصر رہے گا جس طرح وہ مثنوی کی صنف میں روانی اور آسانی سے کر سکتا ہے۔

اسی بنا پر اگر باب نظر و شعراء نے سلام نگاری پر بھکتی پابندیوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھا ان کا موقف ہے کہ بھکتی پابندی شاعر کے افکار کے ابلاغ میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے یہ پابندی نہیں ہونی چاہیے لیکن اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ سلام نے چونکہ غزل کے مزاج و مذاق کو اپنا لیا ہے اس لیے سلام کیلئے غزل کی ہیئت ہی موزوں اور مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں سلام غزل کے علاوہ متنوع ہیئتوں میں لکھا جا رہا ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ سلام موضوعی اعتبار سے مرثیہ اور بھکتی لحاظ سے غزل کے قریب ہے تاہم ناقدین و محققین اس امر پر بھی متفق ہیں کہ طویل ارتقائی سفر کے بعد اب صنف سلام کا ایک مذاق و مزاج متعین ہو چکا ہے اور یہ صنف اپنے موضوعاتی حوالے سے دوسرے اصناف میں صاف شناخت کی جاسکتی ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس صنف کو ”موضوعاتی مطالعہ“ کریں اور ان محاسن کا کھوج لگائیں جو اس صنف سے مخصوص ہیں۔ اردو زبان و ادب کے بیشتر ناقدین و محققین تو کہہ دیتے ہیں کہ سلام کا مواد ہر اس خیال سے حاصل ہو جاتا ہے جس میں پاکیزگی، نفاست، لطافت، شرافت اور انسانیت کا ذہنی ارتقا ہو۔ سلام میں

خیالات سلفی اور اشارات و حرکات رکیک جگہ ہی نہیں پاسکتے۔ اگر ذہن میں اعتقادات صحیحہ اور دل میں جذبات نفیسہ نہیں تو کوئی بڑے سے بڑا شاعر سلام کی منزل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مولانا حالی نے غزل کو جب سنڈاس سے بدتر کہا تھا (۸۵) تو ان کا تصور یہی تھا کہ غزل کے اشعار پڑھ کر خیالات میں وہ پاکیزگی اور اعلیٰ و ارفع جمالیاتی احساس پیدا نہیں ہوتا جس کا تقاضا شرف انسانیت کرتا ہے۔ مواد کے سلسلے میں مولانا امداد امام اثر کا خیال ملاحظہ فرمائیے:

”..... سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیے۔ سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوقی رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آئے۔ عموماً سلام میں واقعہ کر بلا و شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسن و مصائب حضرت خاتون جنت و رحلت حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ و سلام علیہم انی یوم القیام کے مضامین داخل رہتے ہیں اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں اندراج پاتے ہیں۔ علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت متصور ہے منظوم کئے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کبھی کبھی غزلوں میں بھی باندھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعض اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں تو بے موقع یا بے محل معلوم نہ ہوں گے۔ میر انیس اور میر مونس کے بہت سے ایسے سلام ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں تو غزلوں کا وقار ترقی کر سکتا ہے۔“ (۸۶)

مولانا حالی نے اخلاقی، تمدنی اور مذہبی کے الفاظ استعمال کر کے سلام کی فضا کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔ اخلاقیات میں رواداری، استغنا، خاکساری، راست گوئی، قناعت، ثابت قدمی اور صفائے قلب کی خصوصیات شامل ہیں۔ تمدن میں سیاست، حکومت، عدل و انصاف اور دیگر معاشرتی امور بیان کئے جاتے ہیں۔ مذہب میں وحدت الہی، رسالت، امامت، قیامت، فرشتگان قرآن و حدیث اور فروغ دین شامل ہیں۔ غرض انسان کا انسان سے اور انسان کا خدا سے جس قدر تعلق ہے سب کے سب سلام کی زلف کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔

اردو سلام کا خمیر اگرچہ مرثیہ پر تیار ہوا تاہم اس میں محض حزن و ملال کا مواد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسداریب کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... سلام ضروری نہیں کہ رقت اور گریہ و بکا کے اہتمام کے لیے ہو۔ اس کو نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بھی لکھا جاسکتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بیان کی تاثیر سے مصائب کے ٹکڑوں پر زیادہ

بکا ہو جائے، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کی فضا پاکیزہ خیالات، تزکیہ نفس کے جذبات، سیرت و کردار کی تعمیر کرنے والے بیان، ناپائیداری حیات کے اظہار اور اتباع سیرت معصومین سے معمور ہوتی ہے۔“ (۸۷)

سلام میں موجود مواد کے حوالے سے علی جوادی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

”..... سلام کا خمیر جمالیاتی احساس توازن، خلوص، دردمندی، بلند بینی، معیار پسندی اور اخلاقی دوستی سے بنا تھا۔ غزل کے عروضی سانچے اور عام معتقداتی فضا نے اس پر کچھ مزید پابندیاں لگا دی تھیں۔ رندی کی گنجائش نہ تھی لیکن وہ سرمستی ضرورت تھی جو معیار پسندی اور دردمندی عطا کرتی ہے۔ موتی بھی پروئے جاتے تھے لیکن اس طرح کہ صنایع کا عنصر غالب نہ آنے پائے اور فنکارانہ خلوص مجروح نہ ہو۔ مضمون آفرینی ہو لیکن نہ ایسی کہ سلام کی جمالیاتی فضا دھندلی پڑ جائے۔ مدح، منقبت، والہانہ محبت، اخلاقیات عالیہ ان سب آہنگوں کو ملا کر تمکینی اور رنگینی کا امتزاج اس انداز سے کیا کہ غیر اعتقادی عناصر میں تقول کا رس محسوس کیا جانے لگا۔“ (۸۸)

وہ مضامین و موضوعات جن سے سلاموں کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے ان کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان میں اعتقادی اور اخلاقی دونوں قسم کے مضامین دکھائی دیتے ہیں۔ معتقدات میں حمد، نعت و منقبت سبھی آ جاتے ہیں۔ وحدت، عشق الہی اور ذکر الہی سے متعلق اشعار ہیں۔ نعت رسول اور معراج سے متعلق اشعار ہیں۔ دین اسلام رسول اور متعلقین رسول سے خصوصی وابستگی ہے۔ حضرت علیؑ کی شجاعت، سخاوت اور علم کا ذکر ہے۔ نجف اور خاک نجف سے قلبی وابستگی کا اظہار ہے۔ امام حسینؑ کی قوت عمل، طاقت صبر اور اعلیٰ قیادت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سلاموں میں اعزاک کی شہادت پر امام حسینؑ کی بے چینی یا غم انگیز کلمات کے زبان پر جاری ہونے کی بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ سلام گو شعراء واقعہ کر بلا کا بیان صرف رونے رلانے کے لیے نہیں کرتے بلکہ وہ اس عظیم سانحے کو درس ابدی مانتے ہیں اور اس سے اعلیٰ اقدار حیات اخذ کرتے ہیں۔ صبر و قناعت، استغناء، توکل، خاکساری و انکساری، راست بازی، ثبات قدم، صفائے قلب، سخاوت، شجاعت، ظاہر داری سے نفرت، کار خیر اور عمل خیر سے رغبت، قول کی پابندی، خاکساری کے باوجود غیر خدا کے سامنے سر جھکانے سے انکار، صرف خدا ہی کو تمکبان تصور کرنا، خود داری و خود اعتمادی کے ساتھ غرور سے کنارہ کشی اختیار کرنا، یہ وہ چند خطوط ہیں جن پر سلام گو شعراء اخلاقیات کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔

سلام اردو شاعری میں ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں حضرت محمد مصطفیٰؐ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آئمہ کرام اور اہل بیت کی سیرت اور ان کے زندہ جاوید کارناموں کی توضیح و تشریح اہل بیت کی قربانیوں کا تذکرہ اور تہذیب و اخلاق کی ان اعلیٰ اقدار کا بیان ہے جن سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے اور عمل خیر کی تبلیغ و اشاعت ہو۔ ڈاکٹر صفدر حسین بھی صنف سلام کے بارے میں

اس قسم کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اُردو شعروادب میں سلام ایک ایسی صنفِ سخن کا نام ہے جس میں غزل کی عروضی بیت میں رسول اکرمؐ آئمہ کرامؑ اہل بیت اطہارؑ اور خاصانِ خدا کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح و تصویر بیان کی جاتی ہے۔ خصوصاً کربلا کے ہیرو حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزہ و انصار کا تذکرہ پیش نظر ہوتا ہے۔ ان مقررانِ خاص نے چونکہ حق و صداقت اور دین کی حمایت میں دنیا کی عظیم قربانیاں پیش کی تھیں اس لیے ایسے موضوعات بھی شاعر کے دائرہ فکر میں آ جاتے ہیں جس سے اعلیٰ اقدار حیات اور محاسنِ انسانی کی تشریح و تبلیغ کا کام لیا جائے سکتا ہے۔ گویا سلام کے احاطہ خیال میں مسائلِ حیات و کائنات پر بھی تبصرے کی گنجائش ہوتی ہے تاکہ منجھائے الہی، اسوۂ رسول اور فکرِ اہل بیتؑ کی وضاحت کر کے عملِ خیر کی ترغیب دی جا سکے۔“ (۸۹)

سلام نگاری کے لئے زبان و بیان میں حسن آفرینی اور پذیرائی کو لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر سلام قادر الکلامی اور تخیل کی بوقلمونی کی مدد سے اسلوبِ بیان کی تازگی و شگفتگی کا مرقع بن جاتا ہے۔ الفاظ اور تراکیب کے موزوں استعمال سے معنی آفرینی اور خیال کی بے ساختہ ادائیگی کی بدولت مضمون کے حسن و خوبی کی دلائل و برتصویر کشی ممکن ہو جاتی ہے۔ سلام نگاری میں موضوع یا خیال کے موثر اظہار کے لئے مختلف الفاظ اور تراکیب سے کام لیا جاتا ہے۔ موزوں الفاظ سلام میں خوش سلیقگی اور شائستگی کو فروغ دیتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور دلکشی، بیان کی سلاست و روانی، معنویت کی شیرینی و لطافت خیال کی برجستگی و بے ساختگی، الفاظ میں عقیدت و احترام کی خوشبو، سلام کے عزائی تاثر کا عنصر پیدا کرنے میں تخلیقی جوہر کی اہمیت کی حامل ہے۔ جذبہ و خیال کا پر جوش آہنگ بیان کے لفظی و معنوی زیر و بم کا منطقی نتیجہ کے طور پر ابھرتا ہے۔ الفاظ کی موزوں ترتیب کی بناء پر سلام نگاری میں رنگینی بیان اور آرائش زبان کی سحر انگیزی و زوادر کی وجہ بنتی ہے۔

سلام نگاری میں خوبصورتی اور حسن کاری الفاظ و معانی کی آمیزش سے ابھرتی ہے۔ اسلوبِ بیاں کا حسن الفاظ اور ترتیب الفاظ سے اور معانی کا حسن فکر و تخیل کی ہم آہنگی سے نمایاں ہوتا ہے۔ معانی کا حسن سلام نگاری کی فکری خصوصیات نمایاں کرنے میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ حقیقت نگاری، فصاحت و بلاغت، تاریخی واقعات کا بیان، تخیل پروری، بے ساختگی اور فطری انداز، داخلیت و خارجیت کا اظہار محاکاتی انداز، بیان، ایجاز و اختصار، خلوص و آفاقیت، عینیت و ندرت، سوز و گداز اور جذبہ و خلوص کا اظہار، عقیدت و احترام کے پاکیزہ اور مقدس رجحان کو سلام نگاری میں معنوی حسن اجاگر کرنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ الفاظ کا حسن ظاہری دلکشی اور دلائل ویزی کا باعث بنتا ہے جو جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلوبِ بیان کی دلکشی انتخاب الفاظ، روزمرہ معادرات، ضرب الشال، تشبیہات و استعارات، صنائعِ لفظی و معنوی کے معنی خیز تاثر سے پیدا ہوتی ہے۔

الفاظ و معانی کا حسن نگاری میں خیال و فکر کو تسکین اور روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ فکر و شعور میں وسعت اور صداقت کا جو ہر اور موضوع کے اظہار میں معنویت کا تاثر ابھرتا ہے۔ لفظ و معانی میں ہم آہنگی، اسلوب بیان میں جامعیت اور لطافت کا باعث بنتی ہے۔ جس کی بناء پر سلام نگاری کی روایت پاکیزہ تقدس، عقیدت و احترام، تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ الفاظ و معانی کے باہمی ربط کی بدولت واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، جذبات کی تصویر کشی، رزمیہ واقعات اور دیگر نفسیاتی و احساساتی موضوعات سلام نگاری میں پختگی اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ لطافت و سخن کو برقرار رکھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

درج بالا اخلاقی قدروں کے علی الرغم یہ امر مسلمہ ہے کہ سلام نگاری نہ سفر نامہ ہے نہ صحافی کی رپورٹ نہ تاریخ نویسی ہے نہ فلسفیانہ موشگافیوں کی ادھیڑ بن نہ سائنس ہے نہ سائنس کا میکینیکل عمل یہ تو کامل طور پر ایک روحانی تجربہ ہے جس کی بنیاد حقیقت و صداقت پر مبنی جذبات عالیہ پر ہے اگر یہ کہا جائے کہ سلام نگاری محض الفاظ کی محتاج ہے کیونکہ اس کا بہر طور شاعری سے تعلق ہے تو یہ نظریہ بھی قابل قبول نہیں کیونکہ اول تو کوئی شاعری جذبے کے بغیر عالم وجود میں آئی نہیں سکتی دوم لغت کے الفاظ ایک ترتیب میں رکھ دینے سے بھی شعر ممکن ہے موزوں ہو جائے مگر اس کی حیثیت کاغذی پھول سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ سلام نگاری شاعری تو ہے مگر اس کی اساس تخیل اور احساسات و جذبات پر ہے۔ سلام نگاری قلب و روح کی مملکت پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ شعر میں شعریت اسی وقت پیدا ہوگی جب اس کا خمیر راستی اور ازلی وابدی صداقتوں سے اٹھایا گیا ہو۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خزاں کی زد پہ تھا دین رسول، ورنہ حسین
چمن کو لے کے نہ جاتے کبھی خزاں کی طرف (وزیر الحسن عابدی)

یوں بھی کعبے میں دعائیں مانگتے ہیں اہل شوق
رُخ بدرگاہ خدا دل سوئے دربار حسین (احسان دانش)

اصغر تمہارے جیسے سپاہی پئے وفا
نکلے ہنسی سے کام تو تلوار کیا کریں (مہدی نظمی)

نکل تو آئے گا ناوک گلوئے اصغر سے
مگر رہاؤں کے دل سے نکل نہیں سکتا (سید وحید الحسن ہاشمی)

یہ کہہ کے ڈوب گیا آفتاب عاشورہ
رہے حسین کی تا حشر روشنی باقی (آل رضا)

جنہیں ملا انہیں افتادگی سے اوج ملا
انہوں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے (انیس)

سر بلندی کی روایت سر کٹانے سے چلی
نبض ایماں تیری نبضیں ڈوب جانے سے چلیں (مظفر وارثی)

اسوۂ شبیرؐ میں ڈھونڈو تو کیا ملتا نہیں
جذبہٴ ایثار بھی ہے جوش قربانی بھی ہے (صبا اکبر آبادی)

سلام نگاری جذبہ بھی ہے تخیل بھی۔ یہ احساس بھی ہے صداقت بھی مگر اسے نعرہ بنا کر پیش کرنا یا اپنے عقیدے یا مسلک کو زبردستی کسی پر ٹھونسنے کوئی زیبا اور مناسب فعل نہیں۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے اس کی تبلیغ حقائق کے ادراک اور مسلمہ اصولوں سے کی جاسکتی ہے بشرطیکہ سلام نگاران تجربات سے گزر چکا ہو جہاں زمان و مکاں کے تمام خدو خال اور تمام بشارتیں نظر کے سامنے ہوں۔ شاعر کو ہر صورت میں اور ہر حال میں منصب شاعری سے منسلک رہنا چاہئے۔ دین کی اشاعت اور مذہب کی تبلیغ فرض ہے مگر اس کا طریقہ کار اس طرح ہونا چاہئے کہ سلام کی فضا اور اس کا فن مجروح نہ ہو۔ سلاموں سے تبلیغ دین کا کام نہایت خوبی اور احسن طریقے سے لیا گیا ہے کہیں کہیں تو ایسا بھی نظر آیا ہے کہ سلام کا ایک شعر مقرر کے ہزار لیکچروں پر بھاری ہوتا ہے مثلاً سلام کے یہ اشعار دیکھئے:

بہت سجاد کو ملت کی فکر رستگاری ہے
تری زنجیر سے جلاد یہ زنجیر بھاری ہے (نجم آفندی)

غم حسین کا مقصد بدل نہیں سکتا
خیام جل گئے پیغام جل نہیں سکتا (سید وحید الحسن ہاشمی)

خدا کا بندہ خداوند گار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو (غالب)

بدن پہ زخم بجے تھے نڈھال چہرہ تھا
فرات سامنے بہتا تھا اور وہ پیاسا تھا (اسرار زیدی)

سوچیں تو کھلیں صبر و رضا کے کئی پہلو
دیکھیں تو فقط واقعہ کرب و بلا ہے (اعزاز احمد آذر)

سلام میں تبلیغ دین کی کہیں خاموش کہیں مضطرب و متلاطم لہریں نظر آتی ہیں اگرچہ یہ خصوصیت مرثیے، نعت اور نوحے میں بھی ملتی ہے مگر سلاموں میں نعت کی جو عقیدت، مرثیے کا جو درد و گداز اور غزل کی جو شہرت اور ایجاز و اختصار ہے۔ سب کے سب سمٹ کر آگئی ہیں۔ سلام کی فضا ابتدائی سے رکیک جذبات اور بے ہودہ احساس و خیال سے بلند رہی۔ شاید اسی وجہ سے دین کی ترویج اور اس کی اشاعت کا کام سلام نے بڑھ چڑھ کر کیا۔ چند مثالیں اس دعوے کی دلیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

شیر نے کی دین کی تاریخ مکمل
کچھ دفتر ایثار کے اوراق تھے سادے (نجم آفندی)

قوت نمو دیکھی خون میں شہیدوں کے
نخل دین حق اس سے پھولتا ہے پھلتا ہے (خورشید انصاری)

رہتی دنیا تک زمانہ جس پہ سر دھتا ہے
زیر خنجر بھی خدا لگتی ہوئی کہتا ہے حق (ذابرت فتح پوری)

پھیر دو بڑھتے ہوئے طوفاں کا رخ
کشتی اسلام کے لنگر بنو (سید وحید الحسن ہاشمی)

اس غم کی رات میں بھی اُجلا اسی کا ہے
 ہے آسماں پہ جو بھی ستارا اسی کا ہے
 پیاسا کھڑا ہے وہ سر تسلیم خم کیے
 یہ جانتے ہوئے بھی کہ دریا اسی کا ہے (شہزاد احمد)

میان حق و باطل کربلا ہے اور کیا ہو گا؟
 مفصل ہو چکا ہے کیا دوبارہ فیصلہ ہو گا (آل رضا)

صحرائے کربلا بھی عجب ریگزار ہے
 جس سمت جائے گل تر کا پتہ چلے (مشکور حسین یاد)

خلوص و صداقت سلام نگاری کی بنیادی خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت ہے۔ قلبی واردات اور جذبات کے بیان میں اخلاص کا رنگ حقیقی اور شعوری طور پر معنی آفرینی پیدا کرتا ہے۔ ایسی معنی آفرینی سے سلام میں معجزانہ رنگ ابھرتا ہے۔ شہادت کے واقعات میں خلوص و صداقت کا عنصر ایک طرف سوز و گداز پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف خودداری اور خود اعتمادی کا جذبہ ابھارتا ہے۔ مشاہدات اور تجربات کے بیان میں خلوص خون جگر کا اثر رکھتا ہے۔ خلوص کی وجہ سے کلام میں سحر کا رانہ تاثر ابھرتا ہے۔ الفاظ کا حسن اور معانی کی لطافت بھی خلوص و صداقت کی بدولت قائم رہتی ہے۔ شہدائے کربلا سے عقیدت و احترام کے تقاضوں کو خلوص اور صداقت کے ذریعے ہی ضبط تحریر میں لانا ممکن ہے۔ اس سلسلے میں معروف محقق اور مشہور سلام گو سید وحید الحسن ہاشمی رقمطراز ہیں:

”..... سلام کی دنیا کا تعلق اخلاقی صفات اور انسان کے تزکیہ نفس سے ہے۔ انسان چونکہ عظمت الہی اور مکارم اخلاق رحمت کونین کا گرویدہ ہے۔ اس لئے اس کی بقا کا راز بھی انہی نعمتوں پر صبر و شکر کرنا ہے۔ سلام نگار کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس میں خلوص کی چاشنی راست گوئی کی مشاس اور صداقت کی شیرینی ہو چونکہ سلام جذبات اور احساسات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ان میں ذرا سا بھی دروغ گوئی کا عنصر شامل ہوگا تو اثر آفرینی کی لے مدہم ہی نہیں بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔“ (۹۰)

آپ مختلف عہد کے سلام نگاروں کے درج ذیل اشعار دیکھیے کہ اس میں خلوص و محبت کا کیسا جذبہ موجزن ہے۔

فرا ت خون جگر میں ڈبو کے نوک قلم
پیام درد مئے خاص و عام لایا ہوں (ناصر کاظمی)

جو خالق گلشن تھے وہی وقف خزاں تھے
دریاؤں کے مالک تھے مگر تشنہ دہاں تھے (احمد ندیم قاسمی)

وعدہ کر کے بھی نہیں ساتھ نبھانے والے
کتنے بیدرد ہیں یہ لوگ زمانے والے (شہزاد احمد)

عطر کردار سے جب اہل نظر مہکے ہیں
بستی بستی میں بہار آئی ہے گھر مہکے ہیں
یہ گلستان شہادت کا شرف ہے قیصر
کوئی پتہ نہ رہا پھر بھی شجر مہکے ہیں (قیصر بارہوی)

جس سے روشن ہے آج تک دنیا
خون شمیر کا اُجالا ہے (صبا کبر آبادی)

سچ کا سایا حُر کی صورت سامنے ہے
وہ ہر دل پر دستک دینے لگتا ہے (عطا الحق قاسمی)

آنکھوں میں کسی طور پہنچ ہی گیا پانی
دیتا رہا پہرہ کوئی لشکر لب دریا (عباس تابش)

سلام میں حقیقت نگاری جذبہ و خلوص اور عقیدت و احترام کے بیان کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ حقیقت کا بیان مقصد کے اظہار کو اثر اور جلا عطا کرتا ہے۔ سلام میں بیان کردہ واقعات اور حالات کو حقیقی رنگ میں پیش کرنے سے اخلاص

اور وفاداری کے رویے فروغ پاتے ہیں۔ حقیقت نگاری واقعات اور سلام کے دیگر متعلقات کو دیانت و صداقت کے رنگ میں پیش کر کے تعصب اور قیاسیت سے پاک کر دیتی ہے۔ حقیقت پسند شاعر سلام کے متعلقات کو حتی المقدور معروضی صحت کے ساتھ سچائی اور دیانتداری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ اگرچہ واقعات کے بیان میں رنگینی کا تاثر ابھرتا ہے۔ لیکن اس تاثر میں سلام کا حقیقی رنگ مدہم نہیں ہونے پاتا۔

حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ تخیل پر امر واقعہ کو ترجیح دی جائے۔ رونما ہونے والے واقعات کو من و عن بیان کرنا سلام کی حقیقی دلچسپی اور دلکشی کا باعث بنتا ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ خلوص ہی کے شجر سے حقیقت نگاری کی شاخیں نکلتی ہیں۔ حقیقت نگاری ایک خاص انداز فکر ہے جس کی بنیاد ذہنی توانائی اور شدت جذبات پر ہے اگر یہ دونوں عناصر اعتدال پر ہوں تو شعر فوری طور پر اثر کرتا ہے اور معنی کی کئی جہیں لے کر نمودار ہوتا ہے۔ ان تہوں کا اگر غیر متعصبانہ تجزیہ کیا جائے تو ان سے ذوق نظر اور جمالیاتی حس پر سکون، پر بہار اور پر مسرت ہوتی ہے۔ اخلاقی بلندی کے لئے مقصد کی بلندی لازمی ہے۔ اپنے مقاصد کو ارفع و اعلیٰ بنانے کے لئے واقعیت حقیقی سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔ سلام نگار کو وہی کچھ بیان کرنا چاہئے جو امر واقعہ ہے۔ ادھر ادھر کی غیر حقیقی معلومات اور سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے سلام کی پاک فضا کو ناپاک اور غیر شائستہ نہیں بنانا چاہئے۔ اب ذیل میں چند اشعار دیکھئے کہ سلام نگاروں نے کس طرح حقیقت نگاری کو اپنا مطمح نظر بنا کر سلام کو فنی اعتبار سے معتبر بنانے کی سعی بلیغ کی ہے۔

علی کے سامنے اژدر کا کیا افسانہ کہتے ہیں
ذرا سی بات کو بازیچہٴ طفلانہ کہتے ہیں (گہر جلالوی)

دنیا نے مل کے لاکھ بجھائے مجھے نہیں
ایسے چراغ دھر میں اب تک جلے نہیں (سہیل بنارس)

دل کی زینت دردِ حسینی، سر کی زینت پائے حسین
آنکھ کی زینت خالص آنسو، لب کی زینت ہائے حسین (آل رضا)

عالم پیری میں آئے کون پاس
اے عصا، گرتی ہوئی دیوار ہوں (میر انیس)

آ جاتی ہیں زلفیں، جو زربخ سرور دیں پر
دو چار گھڑی چھاؤں ہے دو چار گھڑی دھوپ (مرزا عشق)

گور ہے پیش نظر شام جوانی ہے تمام
رات بھر پھر کے ملا ہے مجھے گھر آخر شب (مرزا شوق)

غم حسین ہے معراج آدمیت کی
حسین ہی پہ نہ رویا تو آدمی کیا ہے (سید وحید الحسن ہاشمی)

سلام نگاری کے واقعات کی بنیاد تاریخی روایات سے وابستہ ہے۔ حضرت علیؑ کی شہادت اور سانحہ کربلا کے واقعات تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ سلام نگار شاعران تاریخی واقعات کو اپنے جذبات احساسات اور قلبی تاثرات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ان واقعات کے بیان میں رقت آمیزی سلام میں اثر انگیزی کا باعث بنتی ہے۔ سلام کی تعارفی اور تفصیلی بنیاد تاریخی واقعات پر ہی استوار ہوتی ہے۔ کربلا والوں کی کربلا میں آمد کے واقعات جنگ اور شہادت کے دلدوز حالات اور تاریخی روایات خلوص و صداقت اور احترام و عقیدت کے انداز میں اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ سلام کے بنیادی تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی کی گراں قدر رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... تاریخی واقعات کا تذکرہ سلام کی خصوصیات میں شامل ہے مگر ہر تاریخی واقعہ سلام کی نزاکت کے باغ کا خوشبودار پھول نہیں بن سکتا۔ تاریخ کا اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس تاریخی واقعے کا مزاج سلام کے مزاج کے ہم آہنگ ہے اگر تاریخی واقعات کی چھان پک نہ کی گئی اور اس کے منافع اور مآخذات کا پتہ نہ لگایا گیا اور سلام کے لباس میں اس کا پیوند لگا دیا گیا تو سلام کی روح منغض ہو جائے گی اور تاثیر شعر بے اثر ہو جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ سلام نگار اخلاق کی حد میں رہے اور رکیک و نامناسب خیالات سے سلام کا پر بہار چمن تاراج نہ کرے۔“ (۹۱)

اسی بات کو ایک دوسرے تناظر میں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر شاعر تاریخی واقعات کو محض حقائق کی صورت میں بیان کر دے تو وہ شاعری کم اور روداد زیادہ ہو جائے گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شاعر مواد تو تاریخی واقعات و حقائق سے لے تاہم اس میں اپنے جذبے اور شاعرانہ ایچ کے ذریعے نیا رنگ و آہنگ بھر دے۔ آپ درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے آپ دیکھیں گے کہ سلام نگاروں نے تاریخی حقائق کو شاعرانہ فکر کے ساتھ کس ہنر سے پیش کیا ہے۔

شاہؔ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آب فرات
ہم لٹا دیتے اگر چشمہ کوثر ہوتا (میر ضمیر)

جنہیں ملا انہیں افتادگی سے اوج ملا
انہی نے کھائی ہے ٹھوکر جو سراٹھا کے چلے (میر انیس)

بار بار آتی رہی بن بن کے دنیا سامنے
اور علیؑ مارا کئے ٹھوکر پہ ٹھوکر بار بار (مولانا مصطفیٰ جوہر)

ہمت معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر
یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ (جوش ملیح آبادی)

ضبط پر بالی سکنہ کے تڑپ اٹھتا ہے دل
کیا ذرا سی جان کو سمجھا دیا تھا اے حسینؑ (نجم آفندی)

افواج ہوئی شام کی ساری تہہ و بالا
میدان میں جو عباس دلاوڑ نظر آیا (نواب آصف الدولہ)

کربلا میں سیٹ پیغمبر وہ انساں لے گئے
حشر تک جو بندگی کی حد امکاں لے گئے (قیصر بارہوی)

لہجہ شبہ لولاک کے مانند کھرا تھا
پیا سا تھا سمندر کی طرح بول رہا تھا (نجیب احمد)

غزل کی طرح سلام کی بھی ایک اہم خصوصیت ایجاز و اختصار ہے۔ ایمائیت اپنا الگ ہی حسن اور نکھار رکھتی ہے جو کیف و تاثیر حسن پوشیدہ میں ہے وہ حسن ظاہری میں کہاں۔ سلام کہنے سے زیادہ سلام کہنے کا سلیقہ اہم ہے۔ سلام کا ہر شعر اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شعر کے دو مصرعوں میں دونوں جہانوں کو آباد کر دینا بڑے مشاق اور پختہ کار سلام نگار کا کام ہے۔ ایک شعر میں شاعر کی تمام فنی صلاحیتیں اور ذہنی کاوشیں بروئے کار لانا پڑتی ہیں تب کہیں جا کے حقیقت کا حسن آشکار ہوتا ہے۔ یہ وہ

میدان ہے جس کی زمین سپاٹ اور ہموار نہیں۔ اس میں کچھ اونچے نیچے مقامات بھی آتے ہیں۔ سپاٹ شعر کہنے والے شعر اس منزل سے گزر رہی نہیں سکتے۔ ایک شعر میں لطف کلام کو باقی رکھنا، انسانی تجربات کی عکاسی کرنا، حقائق سے روگردانی نہ کرنا اور شعر کے پاؤں میں تاثیر کی مہندی لگانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ رمزیت اور ایمائیت انسانی تخیل کے دریا کا وہ دھارا ہے جو دریا میں رہتے ہوئے اپنا الگ وجود رکھتا ہے۔ اگر سلام نگار اس فن سے آگاہی رکھتا ہے تو کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومنے کو تیار ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر اسداریب کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... غزل کا رمزی اور کنائی انداز بیان اس کا ایک وصف ہے جس میں گفتگو تشبیہوں اور

استعاروں کی مدد سے کی جاتی ہے جہاں تک بھی ممکن ہو ایجاز سے کام لیا جاتا ہے یہی کیفیت

سلام میں ہوتی ہے۔“ (۹۲)

آپ مختلف شعراء کے سلاموں کے درج ذیل اشعار دیکھئے کہ ان میں کس طرح ایجاز و اختصار سے کام لے کر سلام نگاروں نے کیسی کیسی عمدہ باتیں بیان کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ممکن ہے روز حشر خدا خود کرے سوال

آنسو کہاں کہاں پہ گرے ہیں بتوں کے (وحید الحسن ہاشمی)

سلامی! جادہ ملک بقا نہیں ملتا

مسافران عدم کا پتہ نہیں ملتا (میر مونس)

جو کربلا میں شاہ شہیداں سے پھر گئے

کعبہ سے منحرف ہوئے قراں سے پھر گئے (امیر مینائی)

تیر کھا کر تو ہنس دیا بچہ

اب بتاؤ کہ کون ہارا ہے (وصی الحسن نقاش)

یہ شہادت ہے اس انساں کی کہ اب حشر ملک

آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں (احمد ندیم قاسمی)

مرے حسین کا سر کیسے کوئی خم کرتا
جھکا کسی سے ہے کب لا الہ الا اللہ (افتخار عارف)

ہر ایک شخص کو ادراک ہو نہیں سکتا
یہ اہل درد سے پوچھو کہ کربلا کیا ہے (ناصر زیدی)

ہم سماجی شعور رکھنے والے مسلمانوں میں اپنے دور کے ان مناظر کو دیکھنا چاہتے ہیں جن میں انصاف اور ظلم کا مجادلہ ہو جن میں حق اور باطل کا مقابلہ ہو جن میں ایمان اور کفر کا مقابلہ ہو۔ پھر ہم اس نتیجے کو بھی دیکھنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں کہ کن وسائل کے بل بوتے پر صبر نے جبر کو شکست دے دی کس طاقت کے بحرو سے پر اقلیت اکثریت کو مغلوب کر لیتی ہے۔ عصری شعور و لفظ ہیں مگر یہ زمین و آسمان کے دو کنارے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ناظر حسن زیدی رقم طراز ہیں:

”.....خبر و شر کی آویزش، ظلمت و نور کی کشمکش اور حق و باطل کی ستیز اُسی وقت سے ہے جب

سے یہ کائنات خلق ہوئی۔ اُس لمحے سے آج تک یہ متصادم قوتیں ایک دوسرے کے خلاف

صف بستہ ہیں۔ اگرچہ بعض دیدہ وروں نے جو کثرت میں وحدت کا اور تضاد میں اتحاد کا جلوہ

دیکھتے ہیں ان دونوں قوتوں کو ذات واحد کی کرشمہ سازی سے تعبیر کیا لیکن جو لوگ تصوف اور

فلسفے کی موٹائیوں سے قطع نظر کر کے شرع و آئین کو مدبر کا سمجھتے ہیں وہ فکر و نظر کی ان بھول

بھلیوں میں داخل نہیں ہوتے اور حق و باطل کو دو مختلف و متضاد چیزیں سمجھ کر پہلی سے تمسک

کرتے ہیں اور دوسری سے اجتناب۔ ان دونوں گروہوں میں کبھی مفاہمت نہیں ہوتی۔ یہ ایک

دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور صرف اُس وقت قریب آتے ہیں جب ایک دوسرے کے

استیصال کا فیصلہ کر لیتے اور اُسے تباہ کرنے پر ٹل جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت

ان قوتوں کے پلے اُٹھتے جھکتے رہتے ہیں بلکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ساز و سامان اور تعداد کے

عناصر باطل کی طرف جمع ہو کر حق کے پہلو کو دبانے چاہتے ہیں لیکن مردان حق جن کا شوق ہمیشہ

”رقیبِ سر و سامان“ رہتا ہے بے برگی و قلت کے باوصف باطل کے خلاف صف آراء ہو کر

حقیقت و مجاز کا فرق دکھا دیتے ہیں۔ آدم و ابلیس، موسیٰ و فرعون، ابراہیم و نمرود، محمد و یوحنا انہی

قوتوں کے مظاہر ہیں جو اپنے اپنے زمانے میں ان متضاد عناصر کی نمائندگی کر گئے۔ دونوں کے

بحر و ہر زمانے میں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے اور یوں ہی اُلجھتے جائیں گے کیونکہ لطافت

کثافت کے بغیر ”جلوہ پیدا کر نہیں سکتی“ اور حق کا چراغ باطل کی ظلمت کے بغیر پوری ضو نہیں دے سکتا۔ شرار اور چراغ کی یہ آویزش بہت پرانی ہے۔ تاریخ مذاہب لکھنے والے اس کی ہزاروں داستانیں سناتے ہیں لیکن سب سے زیادہ صبر آزما اور ہمت آموز داستان وہ ہے جسے زمانے نے محمد عربی کی زبان سے سنا اور جسے اُس صاحبِ معراج کے اہلیتِ اطہار نے آزمائش و ابتلا کی خطرناک ساعتوں میں بہ آواز بلند سنایا۔ اس آواز کو دبانے کے لئے حکومتوں نے تمام تدبیریں کیں۔ جاہ و منصب کے سنہرے فرمانِ زہر ہلاہل کے شیشے، سیم و زر کی تھیلیاں، ملک و مال کے پروانے اور سب سے آخر میں خنجرِ خونخوار کی دھار لیکن ان تمام آزمائشوں میں اہل بیتِ اطہار پورے اُترے۔ نہایت سخت اور بے انتہا ہولناک وہ امتحان تھا جسے حیدرِ کراڑ کے شجاع و غیور بیٹے امام حسینؑ نے کر بلا میں دے کر غیرتِ انسانیت کی لاج رکھ لی اور جریدۂ عالم پر خون کی مہریں لگا کر حیاتِ دوام اور رضائے معبود کی سند حاصل کی۔“ (۹۳)

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کی فقط دو ہی قسمیں ہیں ایک قتل کرنے والے دوسرے قتل ہونے والے۔ سلاموں کا معتد بہ حصہ انہی دو گروہوں کے اعمال سے تشکیل پایا ہے۔ یزید کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور کے یزیدوں کے جبر و استیصال کا معائنہ کر کے اس کا پامردی سے مقابلہ کیا جائے اور حسینؑ کا تذکرہ اس لئے لازم ہے کہ حق و انصاف اور صبر و شکر کی منزلوں کا مشاہدہ کر کے شہادت گاہِ الفت میں جی داری، شجاعت، استحقاق، عبودیت اور تشکر کے ساتھ قدم رکھا جاسکے اور اپنے عمل سے مبروص سوسائٹی کے داغوں کو دھویا جاسکے۔ سلاموں میں معاشرے کی بڑی عمدگی سے تصاویر کھینچی گئی ہیں انہی تصاویر میں ہم اپنے ماضی اور حال کی کیفیتوں کا اندازہ بھی کر لیتے ہیں اور اپنے مستقبل کے بچاؤ کا لائحہ عمل بھی تیار کر لیتے ہیں۔ انیس و دہر نے عربی کرداروں کو جب مشرقی رسوم ادا کرتے ہوئے اپنے مرثیوں میں دکھایا تھا تو ان کے پیشِ نظر وہی عصری شعور کا ادراک تھا جس کا آج ہم تقاضا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی سلام نگار اپنی معاشرتی زندگی اور اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو سمجھ لے کہ وہ اندھوں سے روشنی کے بارے میں کلام کر رہا ہے۔ سلام نگار کو تو اپنے سلاموں میں غیر واعظانہ انداز میں حقائقِ زمانہ کے وہ مناظر دکھانے چاہئیں جنہیں ہم شب و روز دیکھتے ہیں۔ درج ذیل مثالوں سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

نُس سے مَس ہوگی نہ ہر گز لاش بے حس قوم کی

پھول برساتے رہو یا تیر برساتے رہو (ذابرتِ پوری)

میں اکثر سوچتا ہوں زندگی میں غم کے ماروں کو

نہ مل جاتا غم شہ کا سہارا گر تو کیا ہوتا (شاہد نقوی)

کہنے کو اطاعت کے سفر پر ہیں رواں ہم
لیکن نہیں معلوم بھٹکتے ہیں کہاں ہم (شہزاد احمد)

قربانیوں سے قوم کو اپنا بنا لیا
سب گھر ٹار کر دیا قربان آپ کے (نجم آفندی)

مظاہرہ حق و باطل کی آزمائش کا
جہاں حسینؑ نہیں ہیں وہاں نہیں ہوتا (سید وحید الحسن ہاشمی)

تو نے معنی ہی بدل ڈالے شکست و فتح کے
رسم ہستی اپنی ہستی کو مٹانے سے چلی (مظفر وارثی)

برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء سے ”انقلاب انقلاب“ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے بعد اس میں شدت پیدا ہوئی اور ۱۹۳۵ء کے بعد تو نظموں کا جو طویل سلسلہ شروع ہوا اس کے اثرات سے ادب کی کوئی صنف بھی محفوظ نہ رہی۔ غزل جیسی سکہ بند صنف بھی بغاوت کے لئے انگڑائیاں لینے لگی۔ اس دور میں جو ادب معرض وجود میں آیا اسے مزاحمتی ادب کا نام دیا گیا۔ لیکن انقلاب اور مزاحمتی ادب کے ہیر و اپنی آواز میں قوت و ہمت، جرأت و حوصلہ اور استمرار پیدا کرنے کے لئے سیاست یا مجبوراً کربلا کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ حسینی طاقت نے اس انقلاب کی بنا چودہ سو سال قبل ڈالی تھی اس کے اثرات دیر پا اور مستقل ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن رقمطراز ہیں:

”..... بیسویں صدی کا سورج نئے نظریات اور میلانات لے کر طلوع ہوا اور خصوصاً مغربی

اصناف کے حوالے سے اردو اصناف میں جدید افکار و نظریات کی ضرورت کا احساس پیدا

ہونے لگا۔ مغربی تہذیب نے اپنی رنگارنگی کی وجہ سے اہل مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا

تھا۔ یہی سبب ہے کہ سوچ اور فکر کے مروجہ معیارات بدلنے لگے۔ پرانے پیمانے بوسیدہ

قرار دیئے گئے اور اب نئے شعری پیمانوں میں جدید شراب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

شعر و ادب کا تعلق فرد سے زیادہ معاشرے سے جوڑا جانے لگا اور اجتماعی لب و لہجے کو اہمیت

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پوری دنیا میں عموماً اور مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستان میں خصوصاً اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا ایسے لائحہ عمل مرتب کیے جا رہے تھے جن سے معاشرتی سطح پر انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکیں (۹۵) اس حوالے سے مظلوم عوام کے اوپر کیے گئے مظالم کو مختلف سطحوں پر پیش کر کے سامراجی استبداد اور ظالمانہ حیثیت کو خوب ابھارا جا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد عوام الناس میں ایک انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لیے واقعہً کر بلا کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا (۹۶) اس رویے کو سلام گو شعرا بھی محسوس کر رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے سلاموں کا رخ واقعات کر بلا سے موڑ کر پیغام حسینی کی جانب پھیر دیا۔ آپ درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھئے کہ سلاموں کے ان اشعار میں کس طرح ایک نیا جذبہ اور نیا رنگ اُجاگر ہوا ہے۔

سلام ان پہ تہ تیغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو تو چاہے (مجید امجد)

موت سے پہلے نماز اور وہ بھی صحنِ حرب میں
اس شعور فرض اس سجدہ گزاری کو سلام (عبد الحمید عدم)

ملا ہے صبر مجھے تیرے عزم سے ایسا
کہ بے کسی میں بھی قائم ہے کروفر میرا (نوشی گیلانی)

جنگ بے شیر نے تسخیر کے در کھول دیئے
اک تبسم کو ملی قوت لشکر کیا کیا (قیصر بارہوی)

یہ اب تک کر بلا کی خاک سے آواز آتی ہے
بھلا بے آب مر جانا بڑا بے آبرو رہنا (جوش ملیح آبادی)

کر گئے کفر کے لب بند لبو دے کے حسین
پھر نبی زادوں سے بیعت کا تقاضا نہ ہوا (سید وحید الحسن ہاشمی)

آدمی ہو گا نہ کیا خواب سے بیدار کبھی
(حسن عسکری کاظمی) کیا نہ آئیں گے نظر صبح کے آثار کبھی

عزم وہ عزم کہ مقتل کو پسینہ آئے
(خاطر غزنوی) صبر وہ صبر کہ خود ظلم بھی شرما جائے

شاہ کہتے تھے لعینو مجھے روکو تو بھلا
(میر سوس لکھنوی) تم کئی لاکھ ہو اور یکس و تنہا میں ہوں

ہے تمہارے لیے پیغام حسین ابن علیؑ
(نشاط واسطی) زندہ رہنا ہے اگر دہر میں خوددار بنو

غم شبیر میں رویا کبھی جعفر طاہر
(سید جعفر طاہر) کبھی اُمت کے خیالات پہ رونا آیا

چھڑتی ہے جب بھی جنگ حصول حقوق کی
(اعجاز ثقلین بخاری) لگتا ہے ہر محاذ پہ نعرہ حسینؑ کا

عہد در عہد جو نافذ ہو وہ آئین وفا
(ڈاکٹر عاصی کرنالی) نامرتب تھا امام شہدا سے پہلے

ہر جگہ ظالم سے ہے اُبھی ہوئی
(وصی الحسن نقاش) کر بلا وہ اس قدر پھیلا گیا

وہ جس نے بو کر لبو کی بوندیں
(وزیر آغا) زمیں گلابوں سے ڈھانپ لی تھی

ہے اس کا ذکر شہر کی مجلس میں رہنا
اجڑے نگر میں حسرت تعمیر ہے حسینؑ (منیر نیازی)

باطل کی قوتوں سے جو خطرہ ہو دین کو
رتگین کر دو اپنے لہو سے زمین کو (مرضی برلاس)

عقیدہ اور سلام آپس میں لازم و ملزوم ہیں بلکہ راقم الحروف تو یہاں تک کہنے کو تیار ہے کہ سلام کی بلند و بالا عمارت کی پہلی اینٹ ہی عقیدت اور غیر متعصبانہ رویے پر رکھی گئی ہے۔ جب کوئی سلام نگار اپنی عقیدت کی میزبانی سے شریعت کے کشادہ بام پر آتا ہے تو اس کے قلب میں فیضان اور دماغ میں آگہی کے چودہ چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ عشق خدا عشق رسول اور عشق اہل بیت سلام کی کائنات کے سورج، چاند اور ستارے ہیں اور جب مودت کے جذبات الفاظ کا جامہ پہن کر سلام کی شکل میں آتے ہیں تو تاثیر کی کرنیں اپنی روشنی سے ہمارے عالم محسوسات و وجدان کو منور کر دیتی ہیں۔ یہی روشنی شعر کی صورت اختیار کر کے قرطاس ادب پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سلام کے ہر شاعر نے نہ صرف کربلا والوں کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا ہے بلکہ اس نے ہر انسان، ہر اس مقام، ہر اس دور اور ہر اس زمانے پر سلام بھیجا ہے جس نے حق کا ساتھ دیا۔ جس مقام پر حق کا معرکہ پیش آیا اور جس دور اور جس زمانے میں اہل حق کی اہل باطل کے ساتھ آویزش ہوئی۔ اس سلسلے میں یوسف حسن کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”انسانی سماج میں خیر و شر حق و باطل اور انسانیت و ملوکیت کی قوتیں سینکڑوں صدیوں سے ہر محاذ زیست پر باہم برسر پیکار ہیں۔ اس جدلی تاریخ میں خیر، صداقت اور انسانیت کی بقا کے لئے سید الشہدہ کی شہادت، مظلومیت اور عزیمت ایک ایسا عظیم المثال اور ہمہ گیر درجہ رکھتی ہے جس کی عظمت اور محبت زمان و مکان کی ساری حدود پر محیط ہوتے ہوئے نسل انسانی کی روح کا نامیاتی جوہر بن گئی ہے۔ خیر، صداقت اور انسانیت کے پرستار اس عظیم شہادت سے تحریک حاصل کرتے ہوئے ہر زمانے میں ملوکیت کی باطل قوتوں سے ٹکراتے رہے ہیں۔ سید الشہدہ اہل بیت اور ان کے جاں نثاریوں کی بے نظیر قربانی اور شاعری کا بھی مستقل اور زندہ موضوع ہے۔ عہد جدید سے ٹاپے میں رزمئے کا آہنگ برابر بلند ہوتا جا رہا ہے کیونکہ سماج کے تاریخی سفر میں ارتقائی تبدیلیوں کے باعث مظلوم عوام وہ شعور اور قوت حاصل کر رہے ہیں جن سے وہ مظلومیت اور ملوکیت کی اساس کو پہچانتے ہوئے اس کی بیخ کنی کر سکتے ہیں۔ آج وہ اسوۂ حسینؑ کی پیروی میں نئی ملوکیت کے استیصال اور انسانیت کی سر بلندی کے لئے اپنے عہد کے کربلا میں معرکہ آراء ہیں۔“ (۹۷)

اب اس موقف کی دلیل میں سلام کے شعرا کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے کہ شعرا نے نہایت سلیقے سے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے۔

تلخ ہے لیکن حقیقت ہے یہ گچی بات ہے
(عاصم گیلانی) دین کے کھکول میں شبیرؑ کی خیرات ہے

ہم اس کے نام لیوا ہے ضبط جس کا شیوہ
(عباس تابش) لیکن وہ جب بھی بولے نیزے پہ بولتا ہے

زندگی اس نے خریدی نہ اصولوں کے عوض
(قتیل شفقانی) کیونکہ وہ شخص محمدؐ کا نواسا بھی تھا

مجھے امام نے سمجھائے ہیں نکات حیات
(حفیظ تائب) سواد کفر میں جینا حرام جانتا ہوں

وہ جو نور چشم بتول تھا جو گل ریاض رسولؐ تھا
(احمد ندیم قاسمی) اسی ایک شخص کے قتل سے مری کتنی صدیاں اُداس ہیں

شرف کے صحن میں ہر بام و در حسینؑ کا ہے
(افتخار عارف) زمانے بھر کے گھرانوں میں گھر حسینؑ کا ہے

شاہد اگر قبول نہیں ہے یزیدیت
(افضل شاہد) چننا پڑے گا آپ کو رستہ حسینؑ کا

ہمیشہ حق کی ہوئی فتح بر ملا ساجد
(خوشی محمد ساجد) یزید مٹ گیا باقی رہا تو نام حسینؑ

اردو دنیا کا کوئی معروف شاعر ایسا نہیں جس نے سلام نہ کہا ہو اور اپنے سلاموں میں حسینی عزم و استقلال اور حوصلہ مندی کا ذکر نہ کیا ہو۔ شاعر چونکہ گہرے احساس کا مالک ہوتا ہے اس لئے اس کا ذہن الہام سے قبل ہی واقعات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور جب وہ کسی واقعے سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں ایک تحریک اور ایک زبردست تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ سلام نگار جب یہ محسوس کرتا ہے کہ حسینؑ تو حسینؑ ہیں ان کے ننھے ننھے بچے اور پردہ دار مستورات غم و الم کے طوفان میں جرأت و حوصلہ کا پہاڑ بن کر مقابلہ کر رہے ہیں تو اس کے دل میں حوصلہ مندی کا خون گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے قلم سے جرأت مندانہ اشعار ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں معروف شاعر اسرار زیدی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”اگر یہ سچ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو یہ بھی سچ ہے کہ جب بھی ظلم و جبر اور استحصال کی داستانیں دہرائی جائیں گی۔ سید الشہداء امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی عظیم الشان قربانی کی روایت بھی دہرائی جاتی رہے گی۔ سید الشہداء کی تاریخ ساز شخصیت اور کردار بلاشبہ تاریخ انسانی کے لئے ایک روشن ترین باب کی ترتیب و تشکیل کا سبب بنے ہیں۔ یہ قربانی تاریخ کا وہ اہم موڑ ہے جس نے باطل کی قوتوں سے بے سرو سامانی اور بھوک و پیاس کے عالم میں بھی ٹکرا جانے کا درس دیا۔ حسینؑ اور ان کے رفقاء کی قلیل تعداد نے یزید کے لشکر قہار کے بالتقابل جس طرح جی داری کے ساتھ اپنی جانیں قربان کیں ان کے اس جرأت مندانہ عمل سے آنے والی نسلوں کو یہ درس عظیم ملا کہ جب سچائی اور اس کے اصولوں کی بقاء کا معاملہ درپیش ہو تو تعداد کی کم و بیش کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ بقول جوش۔

یہ اب تک کر بلا کی خاک سے آواز آتی ہے

بھلا بے آب مر جانا برا بے آبرو رہنا

یہی وہ صدا ہے جو آج سے قریب قریب چودہ سو سال قبل کر بلا کے لہجے و دوق اور بے آب و گیاہ صحرا میں گونجی تھی۔ بے شک یہ ایک تین روز کے بھوکے اور پیاسے انسان کی صدا تھی جو اپنے آہنگ اور گھمبیر تا کے اعتبار سے اتنی توانا تھی کہ آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی بازگشت نہ صرف یہ کہ چار دانگ عالم میں سنائی دیتی ہے بلکہ اس پر محیط بھی ہے۔

یہ صدا اس شخص کی صدا نہیں ہو سکتی جو محض ایک جابر و قہار فرماں روا کے جبر کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا اور یوں محض مظلومی کی موت مر گیا ہو اس کے برعکس یہ اس شخص کی صدا تھی جو انتہائی نامساعد حالات میں ایک انتہائی قلیل سپاہ کی معیت میں یزید کے لشکر قہار کے خلاف نہ صرف یہ کہ سینہ سپر ہوا بلکہ اس جہاد میں داد و شجاعت دیتے ہوئے تاریخ میں اپنا نام

روشن کر گیا۔ یہ صدا ایک ایسے شخص کی صدا تھی جو پیغمبر نہ تھا لیکن اپنے عمل اور جہاد سے جس نے پیغمبری کی عظیم الشان روایات کو ہمیشہ کے لئے زندہ و درخشندہ کر دیا یہ صدا ایک ایسے شخص کی تھی جو عملاً صاحب اختیار نہ تھا لیکن جس کی قربانی آنے والی ہاشعور نسلوں پر بھی مکمل گرفت کا موجب بنی اور جب تک حق و صداقت کا پرچم سر بلند رہے گا یہ صدا پوری کائنات میں گونجتی رہے گی بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ صدا اپنے آہنگ کے اعتبار سے اور زیادہ بلند ہوتی جائے گی۔ حسین ابن علیؑ کی آواز دراصل قریہ قریہ گاؤں گاؤں، کلی گلی اور شہر بہ شہر پوری توانائی کے ساتھ ان بے سہارا لوگوں کے لئے تقویت کا باعث بنی رہے گی جو اپنے عہد کے جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

شاعری محض جذبوں کے اظہار کا نام نہیں بلکہ ہاشعور شعراء کے لئے ایک مضبوط ہتھیار کے مانند ہے۔ عصر جدید کے شعراء بالخصوص اردو زبان کے شعراء نے کسی حد تک اس حقیقت کو پالیا ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت عصر حاضر کے سلاموں میں با آسانی مل سکے گا۔ ان سلاموں میں یقیناً اس صدا کا عکس ملے گا جو کر بلا کے میدان میں چودہ سو سال قبل ظلم کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بلند ہوئی۔ عصر حاضر کے ہاشعور شعراء نے فی الواقع اس حقیقت کو جان لیا ہے کہ سید الشہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے محض ان کا سوگ منانا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے مشن کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہر عہد کے جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ ہر قسم کی قربانی، حتیٰ کہ جان تک دینے سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ ان تخلیقات میں پوری جذباتی وابستگی کے باوجود اس حقیقت کا پرتو بھی نظر آئے گا کہ حسینؑ محض ایک شخصیت کا نام ہی نہیں بلکہ ایثار و قربانی اور ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے ایک مستقل تحریک کا نام ہے۔ حسینؑ کی شخصیت ایک روشن استعارہ ہے، ایک مینارۂ عظمت و صداقت ہے جس سے کسب فیض اس صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی راہ پر گامزن ہوا جائے۔“ (۹۸)

سلام کے اسی قبیل کے اشعار نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے بلکہ حریت اور آزادی کی جوڑپ اس وقت برصغیر پاک و ہند میں پائی جاتی ہے سلام نگاری کے اس پر گہرے اور روشن اثرات ہیں۔ دیکھئے سلام نگاروں نے کس کس رخ سے اپنی قوم کی زمین میں حوصلہ مندی کی ختم کاری کی ہے۔

سرور پہ حسنؑ کی بدھوانے دو چاند کے ٹکڑے وار دیئے
بچے تو جیالے تھے ہی مگر ماما بھی بڑی دل والی تھی (نجم آفندی)

قتل شبیر سے بھی نہ بدلا ذرا مقصد مصطفیٰؐ موقف کر بلا
پہلے بھائی یہ کہتا تھا بیعت نہیں اب بہن کہہ رہی ہے کہ بیعت نہیں
(سید وحید الحسن ہاشمی)

کیسے آ سکتی تھی اسلام کے دل پر کوئی آج
علی اکبر کا جو سینہ تھا سناں سے آگے
(مشکور حسین یاد)

جو خون کا قطرہ تھا وہ تاریخ کی لو تھا
نیزوں پہ جو سر تھے ابدیت کے نشاں تھے
(احمد ندیم قاسمی)

شہادت ایسی کہ تاریخ جگمگا اٹھی
یہ باب اپنے لہو سے خود اس نے لکھا تھا
(اسرار زیدی)

آنکھ سے آنکھ تک فرات کا نم
دل سے دل تک یہ رنگ سا کیا ہے؟
(اشرف جاوید)

نکلے تھے حسینؑ اپنے گھر سے
خورشید طلوع ہو رہا تھا
(اطہر نفیس)

رواں دواں ہمیں رکھتا ہے سچ کے رستے پر
یہ ایک غم ہے جہاں میں تری قسم ترا غم
(توفیر عباس)

تا ابد روشن رہے گا وقت کے اوراق پر
حق کی خاطر خون سے جو فیصلہ لکھا گیا
(شفیق آصف)

مر نہیں سکے گا وہ حشر تک جئے گا وہ
جس کے دل میں نور حق لب پہ یا حسینؑ ہے
(شوذب کاظمی)

چھایا ہوا تھا خوف یزیدان وقت پر
لیکن بلا کا حوصلہ ان کمسنوں میں تھا (طاہر تونسوی)

سلام نگاری کے لیے فصاحت بنیادی خصوصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ فصاحت سے کلام میں تاثیر اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ (۹۹) فصاحت کے حوالے سے سلام کا تناظر حرنی، غرابت حرنی اور مخالفت قیاس لغوی سے مبرا ہونا ضروری ہے۔ نامانوس اور غیر متعارف الفاظ کے علاوہ قیاس کے خلاف لغوی و لفظی روایت سلام کے حسن بیان کو متاثر کر دیتی ہے۔ تناظر کلمات اور تنقید لفظی و معنوی سے پاک سلام فصاحت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے شعری روایت و اسلوب بیان کے مختلف پہلوؤں کو کمال و اعجاز جیسے بلند مقام سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ فصاحت کی بدولت سلام میں ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ دوراز کا رکتا بوں اور استعاروں سے سلام کا تقابلی معیار مجروح ہوتا ہے۔ فصاحت دراصل الفاظ کی موزونیت اور معنی کی تاثیر کا نام ہے لہذا فصاحت کا حامل سلام حسن ترتیب اور حسن تاثیر کی بہترین مثال قرار پاتا ہے۔ اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی کی وقیع رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... موقع اور ماحول کی مناسبت سے شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو قلب و ذہن پر وجدانی اثرات مرتب کر دیں فصاحت کہلاتی ہے۔ خیالات کو بوجھل اور اداق الفاظ میں بیان کرنا آسان ہے مگر ارفع خیالات کو کھل اور آسان لفظوں میں پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ سادہ اور کھل الفاظ کا انتخاب سامعین کے قلوب میں جاگزیں ہو کر قوت و توانائی، عظمت و دارائی اور حسن و جمال بخشتا ہے۔ شکوہ الفاظ سے مراد بھاری بھر کم اور ثقل الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ و ارفع خیالات کو صحیح اور مناسب طریقے سے برتنا ہے جس سے روح بشر سرشار ہو جائے۔ غیر متعارف اور غیر مانوس الفاظ انسانی ذہن کو غرابت کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں جبکہ سبک اور آسان الفاظ دلچسپی میں بھی اضافہ کرتے ہیں اور ان کا اثر بھی دیر پا ہوتا ہے۔ تناظر لفظی اسی لئے تو معیوب ہے کہ اس سے زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ دوراز کا تشبیہیں اور استعارے نامانوس اور نا فہم تراکیب، غیر ضروری اضافتیں شعر کو چیتاں اور بھول بھلیاں بنا دیتی ہیں۔ سلام میں شعراء کا عام رجحان فصاحت کی طرف ہی رہا ہے۔“ (۱۰۰)

اب آپ فصاحت کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کر بلا سے بڑھ کے اے رضواں تری جنت نہیں
قابل گل گشت ہے لیکن ہمیں فرصت نہیں (مرزا طاہر رفیع)

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
(میر انیس) قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

اب لڑیں گے جنگ اطمینان سے رن میں حسین
(قمر جلالوی) دفن کر دی میت بے شیر فرصت ہو گئی

صد حیف طے پیادہ روی اس کے پر کو
(میر حسن) کونین کی اقلیم کا جو تخت نشیں ہو

رکھ قبر میں سجاد نے اکبر کو کہا! آہ
(میر خلیق) یہ خاک میں صورت تو ملائی نہیں جاتی

جلتے ہوئے چراغ تھے اور سپاہ شام تھی
(گلزار بخاری) کرب و بلا پہ چھا گیا اک دیا بجھا ہوا

یہ کہہ کے ملک روتے ہیں قبر شہ" دیں پر
(مرزا دبیر) اب ہوویں گے پیدا نہ غریب الوطن ایسے

بلاغت کے حوالے سے سلام میں بیان شدہ واقعات و حالات متقصائے حال کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان واقعات و حالات کو احترام اور تقدس کے رنگ میں ایسے الفاظ کے ذریعہ قاری تک پہنچایا جاتا ہے جو غرابت اور تافہ سے پاک ہوتے ہیں۔ بلاغت کی رمز کی یہی بنیادی شرط ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو ایسی زبان اور لہجے کو اختیار کیا جائے جو واقعہ نگاری کے لیے موزوں ہو اور حقائق کی صحیح انداز میں ترجمانی کر سکے۔ اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

”..... ہمارے بعض نقادوں نے بلاغت شعری کو مبہم اور پر تکلف الفاظ کی بھٹی سے نکلے ہوئے

خیالات سے موسوم کر دیا ہے۔ اسی بنیاد پر میر انیس کو فصاحت اور مرزا دبیر کو بلاغت کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلاغت تو فصاحت سے دو قدم آگے والی غیر

مرکی اور پوشیدہ قوت ہے جو اگر سمجھ میں آ جائے تو شعر کا لطف دگنا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی فصیح شعر میں ایک اور بھی معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہی شعر کی جان ہوتا ہے لیکن اس کے لئے الفاظ بھی موزوں اور مددگار ہوں۔ لہجہ بھی مناسب ہو اور شعرواقعے کے عین مطابق ہو۔“ (۱۰۱)

سلام کی معنوی اور لفظی روایت بلاغت کے بنیادی تقاضوں کے مطابق توازن اور تاثر برقرار رکھنے میں جس طرح کامیاب رہی ہے اس کی مثال مختلف سلام نگاروں کے کلام میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ مختلف شعرا کے سلاموں میں بلاغت کی مثالیں دیکھئے:

اے بدخشان نبیؐ کے لعل احمر السلام
اے گلستان علیؑ کے لالہ تر السلام
(میر تقی میر)

دم اس کا جو گھٹنا تھا تو کہتی تھی سیکندہ
آہوں کا دھواں خانہ زنداں سے نکل جائے
(مصطفیٰ)

چڑھا جو خانہ زیر پر علیؑ کا ماہ منیر
ہلال زیر قدم کا رکاب کے بدلے
(مرزا دبیر)

اسفل و اعلیٰ کو یوں لازم ہے حفظ آبرو
چاہ دریا پر نہ جاتا ہے نہ دریا چاہ پر
(میر انیس)

نوجوان سینوں میں آج بھی دھڑکتا ہے
ایک ننھے بچے کی عمر مختصر کا دکھ
(محسن چنگیزی)

ان کی تنہا روی کے کیا کہنے
سینکڑوں قافلے غبار میں تھے
(شہرت بخاری)

یہ واقعہ عجیب ہے اے کربلا کی شام
دو آفتاب آج لہو میں نہا گئے
(شہزاد احمد)

حصارِ ظلم کی بنیاد کو اکھاڑ دیا
جہاں میں تجھ سا کوئی بھی تو فتح یاب نہ تھا
(سبط علی صبا)

کتنا عجیب نکلا دریا فرات کا بھی
لب تک نہ جا سکا تھا آنکھوں تک آ گیا ہے
(عباس تابش)

صرف جرأت ہی پہ موقوف نہیں سچائی
حق کے اظہار کو کچھ نام و نسب ہوتے ہیں
(سلیم کوثر)

جنگ بے شیر نے تسخیر کے در کھول دیئے
اک تبسم کو ملی قوت لشکر کیا کیا
(قیصر بارہوی)

آثار جوان بھائیوں کے
بہنوں نے زمیں سے چن لئے ہیں
(احمد ندیم قاسمی)

حسینؑ عظمت انساں کی لاج تھے ورنہ
یہاں ضمیر کا سودا کہاں نہیں ہوتا
(سید وحید الحسن ہاشمی)

سلام نگاری کے لئے تخیل ایک لازمی خصوصیت ہے۔ قلبی واردات اور احساسات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے تخیل کی بلندی درکار ہوتی ہے۔ واقعات اور حالات کو تخیل کی بدولت ہی حقیقت کے رنگ میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ سلام گو شعراء نے واقعات کو بلا کو بیان کرنے میں جہاں خلوص و صداقت، رمز و ایمائیت سے کام لیا ہے وہاں تخیل کی مدد سے ایسا انداز بیان اپنایا ہے کہ سلام فطری جذبات کی حقیقی تصویر بن کر قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ تخیل میں مبالغہ آرائی کلام کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ لیکن ظلم و ستم اور رنج و الم کا بیان سوز و گداز کی ایسی پختہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ جس سے تخیل میں عدم استحکام کا رنگ نمایاں نہیں ہونے پاتا۔ قمر جلالوی کی پرواز تخیل ملاحظہ کیجئے:

ہے نماز عصر شاہ دیں کی ناممکن نظیر
ایک سجدہ میں دو عالم کی عبادت ہو گئی

حامد لکھنوی کا رنگ تخیل دیکھیے:

یوں جان دی کہ خلق کو جینا سکھا گئے

شیر زندگی کی حقیقت بتا گئے

تخیل کے حوالے سے ایک بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگر شاعر کا تخیل محض ”ہوائی“ ہو جائے تو اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ آسمانی تخیل کے پاؤں بھی زمیں میں پھوست ہونے چاہئیں۔ عصر حاضر کے معروف نقاد سید وحید الحسن ہاشمی نے اسی تخیل یا تخلیقی اچھ کو ”تیور“ قرار دیا ہے ان کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

”..... کوئی سلام نگار اپنے خیالات و جذبات کو من و عن بیان نہیں کرتا اسے خوف رہتا ہے کہ اگر

اس نے اپنے دل کا حال یا قلبی کیفیت کو اسی طرح پیش کر دیا جس طرح وہ اس پر طاری ہوئی

ہے تو کہیں اس کا بیان سپاٹ نہ ہو جائے اس لئے وہ اپنے رازوں اور نکات حیات کی حقیقتوں کو

پرتائیر کرنے کے لئے تیور کا سہارا لیتا ہے۔ بات وہی ہوتی ہے مگر جب تیور میں ملفوف ہو جاتی

ہے تو شعر کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے مثلاً شاعر جو ارام مظلوم میں اپنے مزار کے لئے دو گز زمین

کا خواہش مند ہے۔ دیکھئے یہی اس کی خواہش تیور کا رنگ اختیار کر کے کس قدر حسین ہو گئی

ہے۔

در شیر پر بہر لہ دو گز زمیں مانگی

رسالت تو نہیں چاہی خدائی تو نہیں مانگی (شہید یار جنگ) (۱۰۲)

اب آپ تخیل کی کارگزاری کے حوالے سے مختلف شعراء کے سلاموں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سجاد سوچتے تھے محرومی شہادت

بیمار تھا اگر میں قاتل کو کیا ہوا تھا (مہدی نظمی)

کس طرح جگہ ملتی اغیار کو اس گھر میں

دھبہ نہیں آ سکتا تطہیر کی چادر میں (نجم آفندی)

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں

کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں (میر انیس)

تھی رن میں دم صبح، شہ دیں پہ کڑی دھوپ
پھر گلشنِ ایجاد میں ایسی نہ پڑی دھوپ

مثلی دو طفلِ شمس و قمر آئیں درس کو
زیر بغل کتاب لیے صبح و شام کی
(مرزا دہیر)

مرے لیے تو کربلا ہے روشنی کا مستقر
مگر ہے تیرے بخت میں سیاہ رات کربلا
(خورشید بیگ میلوی)

زمین کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جو اب بھی شجرِ حسینؑ کا ہے
(افتخار عارف)

نہر کے کنارے بھی جن کے ہونٹ پیاسے تھے
کاش ان تلک پہنچے یہ سلام پانی کا
(افضل گوہر)

زندگی آج وہی حسنِ عمل چاہتی ہے
کل سے بھی جیسے زیادہ ہو ضرورت اس کی
(توصیف تبسم)

ہوائے شام جو گزری ہے سسکیاں لے کر
ضرور اس نے سنی ہے حسینؑ کی آواز
(حسین سحر)

ماضی و حال اس کے خوں سے مستنیر
رہنمائے نسلِ آئندہ حسینؑ
(حفیظ تائب)

سلام میں داخلیت سے مراد باطنی کیفیات اور جذبات و احساسات ہیں جو شاعر کی ذہنی و فکری عکاسی کرتے ہیں اور جن سے کلام میں اثر انگیزی کا عنصر نمود ہوتا ہے۔ داخلیت میں واقعات سے متعلق رد عمل جذبہ و احساس میں متنوع پہلو اختیار کرتا ہے۔ سلام گو شعراء خارجی ماحول کو جذبات و احساسات کے رنگ میں ڈھال کر بیان میں تازگی، ندرت اور اجتماعی تاثر کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ سلام داخلی کیفیت کے بیان کا مرقع بن کر جاذبیت اور محویت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مبلغ صلاحیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ سلام نگار شعراء کی طبیعت زیادہ تر داخلی کیفیات، جذبات و احساسات اور قلبی واردات کے بیان کی طرف مائل رہتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو واقعات کے تاثراتی تجربات کی روشنی میں فکر و تخیل کی قوت کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ جن کی بناء پر انداز بیان موضوع کی ادائیگی اور لہجے کی دلکشی کے حوالے سے سلام نگاری میں عمومی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔

ارم لکھنوی کے سلام میں داخلیت کی مثال ملاحظہ ہو:

شامیو! اصغر نے خاموشی میں کیا کیا کہہ دیا
تم نے دیکھی تھی کہیں اس شان کی تقریر بھی
سید آل رضا کے سلام میں داخلیت کی مثال ملاحظہ کیجئے:

بڑے جلوے دکھائے تابش خون محمدؐ نے
سیاہی جس جگہ چھائی وہیں سے روشنی نکلی
انیس کے سلام کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

اللہ رے ناتوانی عابد کہ راہ میں
ایک اک قدم پہ بیٹھ گئے نقش پا کے ساتھ

سلام نگاری میں خارجی واقعات اور حوالوں کا بیان داخلی واردات کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ سلام گو شاعروں کی مخصوص طبع خارجی ماحول کی جانب مائل ہونے کی بدولت ہی داخلی کیفیت کے بیان کے قابل ہوتی ہے۔ بیرونی ماحول کا مشاہدہ اور خارجی عوامل کا مطالعہ سلام کے جزئیات کے بیان کو موثر انداز میں ادا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ سلام نگاری کے حوالے سے خارجیت کی اصلاح خارج بنیں اور خارجی زندگی کے مختلف لوازمات سے فنکارانہ تعلق و اظہار کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ سلام کے موضوعات اور دیگر متعلقات کو جذبات و احساسات کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس انداز بیان کی بناء پر خارجی لوازمات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ سلام نگاری ہمہ گیر تاثر اور آفاقیت جیسی خوبیوں کی بناء پر مقصدیت کے اظہار کے قابل ہو جاتی ہے۔

سلام نگاروں نے خارجی ماحول کے مختلف عناصر مثلاً صحرا، گرمی، آگ، پیاس، جنگ اور قتل و غارت گری کو بیان کر کے داخلی کیفیات کو موثر انداز میں قابل اظہار بنادیا۔

خارجیت کے حوالے سے آغا شاعر قزلباش کا سلام دیکھئے:

تکتے ہیں آسمان و زمین کو کھڑے حسینؑ

اک خون بے گناہ کا چلو لئے ہوئے

قمر جلالوی کے سلام میں خارجیت کا رنگ ملاحظہ ہو:

روئے فرزند پیہر کی زیارت ہو گئی

اک نظر میں پورے قرآن کی تلاوت ہو گئی

میر انیس نے تو محض مرچے کے متعلق کہا تھا کہ۔ مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے۔ تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مرچے میں سوز و گداز بنیادی اور لازمی امر ہے۔ سلام کا بھی چونکہ مصائب محمدؐ و آل محمدؐ سے تعلق خصوصی ہے۔ اس لئے اس میں درد انگیز اور رقت آمیز اشعار کہے جائیں۔ سلام کی یہی خصوصیت دل ہلا دینے والی تاثیر رکھتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک عام آدمی عیش و نشاط کی بزم اور محفل طرف و انبساط کی طرف توجہ نہ کرے مگر غمگین اور محزون انسان کو دیکھ کر ادھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا میں طریقہ انداز کے مقابلے میں المیہ انداز کی پذیرائی ہوتی رہی اور آج بھی ہو رہی ہے۔ سلام نگار کو اس کھلی اور عیاں حقیقت سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ ذیل کی مثالوں سے ہمارا مدعا مزید واضح ہو جائے گا۔

کوئی بھی ہدم دم آخر نہ تھا شبیرؑ کا

دیر تک حسرت سے منہ دیکھا کئے شمشیرؑ کا (میرزا عشق)

میں اس زمین کے کلزوں پہ دل بچھاؤں گا

اٹھا کے لاش گرے ہیں جہاں جہاں پہ حسینؑ (سید وحید الحسن ہاشمی)

کیا لٹ کے گئے کربل سے حرم جب آئی ہیں سکھیاں ملنے کو

جس مانگ کو دیکھا اجڑی تھی جس گود کو دیکھا خالی تھی (نجم آفندی)

خنجر شمر چلا عرش سے آواز آئی

فاطمہؑ تو نہ تڑپ ہم ہیں رگ جاں کے قریب (وزیر الحسن عابدی)

کونسی چشم ہے جاری نہیں جس سے آنسو

کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں جائے حسینؑ (میر انیس)

سلامی اشک سے یہ چشمِ مومنین تر ہے
کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے (صحفی)

ذکرِ حشر نے ہم کو یہ تہذیبِ غم بخشی رضا
سابقہ غم سے پڑا اور منہ سے نکلا ”یا حسین“ (آلِ رضا)

اردو سلام کی تاریخ میں یوں تو بے شمار سلام نگار ہیں جنہوں نے اپنے سلاموں میں حزن و ملال کو بڑی شائستگی اور سلیقے سے بیان کیا ہے تاہم میرزا دبیر کے سلاموں میں جو حزن و یاس کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے سلام نگار شاعر کے ہاں موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دبیر کے کلام میں موجود اسی الم انگیزی کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

”..... دانش مندوں کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی غم و نشاط سے عبارت ہے۔ انسان کی زندگی میں مجموعی طور پر غم کی فراوانی ہوتی ہے لہذا وہ حزنِ ماحول میں عمر بسر کر دیتا ہے۔ دبیر اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ ایک تو واقعہ کر بلا کی ہولناکی اور درد انگیزی اور دوسری جانب شاعر کا الم انگیز لب و لہجہ دونوں نے مل کر دبیر کے کلام میں غم و اندوہ کی ایسی کسک پیدا کر دی ہے جس کی آنچ سے آج بھی قارئین کے دل سلگ اٹھتے ہیں۔ مرزا دبیر اپنے کلام میں ملال انگیز فضا پیدا کرنے کے لیے کئی طریقے اور حربے اختیار کرتے ہیں۔ کہیں وہ مظلوم کرداروں کے اعمال و حرکات سے غم کی کیفیت ابھارتے ہیں، کہیں ظالموں کے مظالم پیش کر کے گریہ کا سامان پیش کرتے ہیں کہیں وہ درد انگیز مکالمات کے ذریعہ حزن و ملال اُجاگر کرتے ہیں اور جہاں انہیں موقع ملتا ہے وہ غم انگیز الفاظ کے استعمال سے فغاں کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔“ (۱۰۳)

اپنے موقف کو اُجاگر کرنے کے لیے راقم الحروف مرزا دبیر کا صرف ایک سلام پیش کر رہا ہے۔ آپ دیکھئے کہ فقط ایک سلام میں حزن و ملال کی کتنی شکلیں جلوہ گر ہو رہی ہیں:

سلام

جو کہ مصروفِ سلامِ شہدا رہتا ہے
گو وہ رہتا نہیں پُر نام سدا رہتا ہے

اے فلک! بعدِ فنا کائے گئے دستِ حسین
اک نہ اک ظلمِ ترے گھر میں نیا رہتا ہے

شر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبر کی
جس کا اک ہاتھ کلجے پہ دھرا رہتا ہے

شاہ دیں لاشہ اکبر پہ کھڑے کہتے تھے
ہوش اس جا نہیں انسان کا بجا رہتا ہے

شاہ کہتے تھے کیا ذائقہ تیر جفا
کہ لب زخم میں تا دیر مزا رہتا ہے

شر سے شہ نے کہا پاؤں نہ رکھا سینے پر
یہیں گنجینہ اسرارِ خدا رہتا ہے

کہا بانو نے میں زنداں میں ہوں اکبر زن میں
روح رہتی ہے جدا جسم جدا رہتا ہے

رو کے یہ قاصدِ صغریٰ سے کہا عابد نے
کہو! بھائی ترا محتاجِ دوا رہتا ہے

بولی زینب کہ نہیں خواب میں آتے اکبر
اور مرے دل کو خیال اُن کا سدا رہتا ہے

جنگے سر لاشے پہ میں اُس کے گئی تھی رن میں
شاید اس بات پہ وہ مجھ سے خفا رہتا ہے

جب سے زینب گئی انبوہ میں سر جنگے آہ!
تب سے سرِ خلد میں زہرا کا کھلا رہتا ہے

قطعہ

روکے یہ ہند کی بیٹی نے سکیٹ سے کہا
 سر ترا کس لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے؟
 وہ گلی کہنے قیمی کی نشانی ہے یہ
 کرتا بے وارٹے بچوں کا پھٹا رہتا ہے
 باپ مارا گیا بھائی موئے زنداں میں پھنسی
 اس مصیبت میں بھلا ہوش بجا رہتا ہے
 خواب میں آن کے عابدے یہ شہ نے پوچھا
 اے پر! قید میں کیا حال ترا رہتا ہے
 کہا سجاد نے اشک آنکھوں میں لب پر فریاد
 پاؤں زنجیر میں رسی میں گلا رہتا ہے

قطعہ

کہتی تھی قوم اسد شام سے تاوقت سحر
 حشر سا گنج شہداں میں پنا رہتا ہے
 بچے سر آتی ہیں خاتون قیامت زن میں
 نعرہ زن صبح تلک شیر خدا رہتا ہے
 ہے یہ شرمندگی پانی کے نہ پہنچانے کی
 نیزے پر بھی سر عباس جھکا رہتا ہے

قطعہ

رو کے یہ مادر قاسم نے کہا کبریٰ " سے
 تم اگر روک لو واری! تو بنا رہتا ہے
 گھر ترا لٹتا ہے اب شرم کہاں کی بی بی!
 کوئی اس وقت میں پابند حیا رہتا ہے

قطعہ

کہتے تھے اہل حرم گو کہ گرفتار ہیں ہم
ہم سے پُر دکھ شہ بے کس پہ سوا رہتا ہے
شام ہوئی ہے تو اُونوں سے اترتے ہیں ہم
اور سر شاہ تو نیزے پہ چڑھا رہتا ہے
کہتے تھے شاہِ نجف رن میں مرے گا عباس
اپنے بھائی پہ ابھی سے یہ فدا رہتا ہے
طوف کعبہ کا تجھے شوق ہے از بسکہ دیر!
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما رہتا ہے (۱۰۴)

اب آخر میں چند معروضات سلام کے اسلوب کے حوالے سے بھی پیش خدمت ہیں۔

سلام نگاری کے لیے سب سے اہم کام الفاظ کا مناسب انتخاب ہے۔ شاعری کی روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم وزن اور ہم معنی الفاظ زبان و بیان کی روانی اور سادگی برقرار رکھنے کے لئے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مناسب اور متوازن الفاظ کلام میں فصاحت اور بلاغت کا بھرپور رنگ جمادیتے ہیں۔ شعر میں موزونیت بامعانی الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر لفظ اقتضائے فطرت کے مطابق بلاغت کی خوبیوں کا حامل ہے تو معنویت اور تاثیر کا رنگ مکمل طور پر جلوہ گر ہو جائے گا۔ واقعات کے بیان میں محاکاتی عنصر الفاظ کی ترتیب کی بدولت ہی ممکن ہے۔ اقتضائے طبیعت کے عین مطابق الفاظ سیرت و کردار کے مختلف پہلوؤں کو بخوبی عیاں کر دیتے ہیں۔ موقع محل اور اقتضائے حال کے مطابق مناسب اور موزوں الفاظ سلام میں تاثیر معنویت اور عقیدت کے جذبات ابھارنے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ قرینے اور سلیقے کے ساتھ ہم معنی اور مترادف الفاظ کا استعمال زبان و بیان کا حسن نکھار دیتا ہے۔

سلام میں معانی اور تاثیر الفاظ کی موزونیت اور مناسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر الفاظ میں توازن نہ رہے اور انتخاب الفاظ میں موقع محل اور اقتضائے حال کو مد نظر نہ رکھا جائے تو کلام بے معنی اور مہمل بن کر رہ جائے گا۔ الفاظ کے انتخاب کی حقیقی اہمیت کے پیش نظر سلام نگار شعراء نے الفاظ کی مناسبت سے نکتہ رسی اور نکتہ شناسی کا خاص خیال رکھا۔ جن الفاظ کو سلام نگاری کے حوالے سے استعمال کیا گیا ان میں نصیب رحمت دوارِ مبتلائے درد و الم حصارِ اہل علم و ادب خدائے کون و مکاں گلِ حرام پڑمردہ نیرِ اعظم آلودہ غبارِ کاتب تقدیر حبیب گل چاک بلبل غمزہ پاس ادب گنج شہیداں ستم کشاں صبور کرب و بلا فلک کج مدار رونقِ بستان نبی عظمت صبر چارہ گردم باز پسین قلم معجز آفرین مکانِ عرش گلخن دل آتش غم شافع محشر چشمہ کوثر ششماہا سپاہی دیار ظلمات غریب الوطن بیت الحزن وغیرہ شامل ہیں۔ ان الفاظ کے علاوہ بے شمار الفاظ ذخیرہ انتخاب میں درج کئے جا

سکتے ہیں جنہیں بوجہ اندیشہ طوالت ضابطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

پر شکوہ الفاظ یا سادہ تراکیب دونوں کا برتنا آسان ہے لیکن بلندی افکار تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ بلندی افکار کے لئے الفاظ کی مناسبت کا خیال رکھنا ضروری ہے اگر لفظ کی مناسبت خیال سے ہے تو جیسا اہم خیال ہے اسی مناسبت سے الفاظ لائے جائیں ایسا نہ ہو کہ خیال عمدہ ہے مگر لفظ رکیک اور مبتذل استعمال ہو گئے ہوں ایسا کرنے سے شعر میں تاثیر باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر لفظ کی مناسبت لفظ سے ہے تو دیکھنا چاہئے کہ شعر میں نہ تناظر لفظی آجائے نہ تعقید ہو۔

سلام نگار کو غور کرنا چاہئے کہ سلام میں ایسے الفاظ آئیں جو فطرت سے قریب تر اور موقع محل کے مطابق ہوں۔ سادہ اور مترنم الفاظ شعر کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتے ہیں اکثر سلام نگار مصرع مکمل کرنے کے لئے حشو و زوائد سے کام لیتے ہیں اس سے شعر کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے اور خیال پر بھی زخم کاری لگتا ہے۔ رواں دواں اور پر تاثیر الفاظ شعر کا قد بلند کر دیتے ہیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ محبت کے لئے نرم اور غیظ و غضب کے لئے سخت الفاظ استعمال کئے جائیں لیکن تاثیر کا آگینہ چور نہ ہونے پائے۔ مناسبت لفظی کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

یہ سوچ کے گہوارے سے اصغر کو لیا ہے
کچھ کام کی شاید یہ امانت نکل آئے (کاظم بناری)

حق نے عباس کو پرچم دیا اصغر کو ہنسی
جس کا سن جیسا تھا ویسا ہی اسے کام ملا (فضل لکھنوی)

جوان و پیر کی کسن کی شیر خوار کی فوج
حسین آئے ہیں کس حسن انتظام کے ساتھ (تشنہ رامپوری)

جا سوئے قلب حضرت شبیرؑ جا مگر
اے تیر فاطمہؑ کی رگ دل کو دیکھ کے (شاعر لکھنوی)

کدھر تلاش کریں تم کو اے عدم والو
کہاں گئے کہ کہیں نقش پا نہیں ملتا (میرمونس)

روزمرہ کی بدولت اسلوب بیان کے نقطہ نظر سے سلام نگاری میں اثر پذیری، سلاست اور روانی پیدا ہوتی ہے اور موضوعاتی نکتہ رسی کے اعتبار سے معنوی بے ساختگی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان کی وسعت اور صحت بیان کی فصاحت و بلاغت روزمرہ کے صحیح استعمال سے ہی ممکن ہے۔ روزمرہ نہ صرف خوش اسلوبی کی ضمانت ہے بلکہ مطمح نظر کو وضاحت اور وسعت کے رنگ میں بیان کرنے کی صلاحیت پر قادر کرتا ہے۔ اہل زبان شعرا کے سلام میں الفاظ کا دروبست موضوعاتی کیفیات کو معنوی پہلوؤں کے حوالے سے بیان کر کے حقیقی رنگ نمایاں کر دیتا ہے۔ روزمرہ کی وجہ سے سلام نگاری شعوری کاوش اور آرد سے محفوظ رہتی ہے۔ اسلوب بیان کی پختگی کی بدولت فکری اور معنوی محاسن سے سلام نگاری آفاقیت اور حقیقت کی متوازن اور سنجیدہ روایت بن جاتی ہے۔

میر عبد اللہ مسکین کے سلام میں روزمرہ کا استعمال دیکھیے:

اے باد صبا مارا ہے جسے برب لب دریا

کہہ جا کے سلام اس کو جو ہے عباس دلاور

میر انیس کے سلام میں روزمرہ کی مثال ملاحظہ ہو:

کس طرح غم سے نہ ہو مجرئی کا دل پانی

نہ ملا شہ کو تہہ خنجر قاتل پانی

زبان و ادب میں محاورے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ محاورے کی وجہ سے زبان و بیان میں معنی آفرینی اور اثر پذیری پیدا ہوتی ہے۔ محاورات کا بر محل اور موقع کے مطابق استعمال بیان کی شگفتگی اور برجستگی کا باعث بنتا ہے۔ سلام نگاری میں محاورات مطمح نظر کو واضح کرنے اور مقصد کے اظہار میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اختصار کے لہجے میں مفصل بیان کا تاثر محاورات کی بدولت ہی ابھرتا ہے۔ محاورات قادر الکلامی کا بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ محاورات کے استعمال میں سلیقہ مندی، سلام نگاری کے محاکاتی عنصر کی وضاحت کے علاوہ عزائی تاثر کو بھی بہتر انداز میں ابھارنے میں مدد دیتی ہے۔ محاورات کا استعمال فصاحت اور بلاغت کا باعث بنتا ہے۔ کلام کی ظاہری دلکش و دلآویزی معنوی حسن کو بھی برقرار رکھتی ہے۔ معنوی وضاحت کے حوالے کے مطابق محاورات اور مقصدیت کے بیان کے درمیان جو تعلق قائم ہو جاتا ہے وہ سلام نگاری کے حسن عقیدت اور پاکیزہ تقدس، رجحان کو بلاغت سے ہمکنار کر دیتا ہے اور سلام نگاری حقیقت اور آفاقیت کی علمبردار بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے سید وحید الحسن ہاشمی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

”..... زمانہ جدید کے شعراء اب یہ کہنے لگے ہیں کہ خیالات کے اظہار کے لئے محاورات و

روزمرہ، قافیہ ردیف، بحر اور وزن کے پیمانے سب فرسودہ روایات کی باتیں ہیں وہ یہ بھول گئے

ہیں کہ اس تغیر پذیر زمانے میں کچھ وجدانی چیزیں موجود ہیں جن میں آج تک کوئی تبدیلی نہ آ

سکی آج بھی گلاب کی مہک اور پرندوں کی چہکار ہمارے دلوں کو دلکشی دیتی ہیں۔ قافیہ اور ردیف، محاورات اور روزمرہ ایک حسین دلہن کے زیورات کی طرح سنگھار کی چیزیں ہیں جن سے حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ جب ایک لفظ انسانی ذہن کو بے شمار خیالات عطا کر سکتا ہے تو محاورات اور روزمرہ سے کتنی ہی دنیا کی معرض وجود میں آ سکتی ہیں کیونکہ فکر انسانی کو ابھی تک مقید نہیں کیا جاسکا۔ اردو کے کسی بڑے شاعر کو لے لیجئے اس نے مقفی شاعری بھی کی محاورات کے پھولوں سے اپنی بزمِ سخن بھی سجائی اور روزمرہ کے رنگین شیشوں سے اپنی دکان شاعری کو مزین بھی کیا۔ اگر آج کل کی بے اسلوبی، بے ڈھنگی اور لولی لنگڑی شاعری کو شاعری کہا جاسکتا ہے تو پابند شاعری کو فرسودہ بیکار اور بے محل کہنے کا کیا جواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ریاضت سے جان چھڑا رہا ہے دوسرے فنون کی طرح شاعری بھی ریاضت چاہتی ہے مگر ہمارے شعر اس ریاضت سے گھبراتے ہیں۔“ (۱۰۵)

آپ بنظر غائر دیکھیئے کہ ان اشعار میں محاورات اور روزمرہ کے استعمال نے شعر کی زمین کو آسمان بنا دیا ہے آپ بھی درج ذیل مثالوں سے لطف اندوز ہوں:

زندہ ہر دور میں خمیر کا غم رکھا ہے
ہم نے طوفانوں میں کشتی کا بھرم رکھا ہے
(شاہد نقوی)

خوں سے عباسؑ نے پروانہ بخش لکھا
دو کئے ہاتھوں سے اُمت کا بہت کام چلا
(فضل نقوی)

یہ جی سے گزرنے والے تھے یہ بات پہ مرنے والے تھے
کب موت سے ڈرنے والے تھے سو بار کی دیکھی بھالی تھی
(نجم آفندی)

شوق سے فرد وفاداری پہ لکھ دینے کو نام
آ گیا لو ہاتھ ہی ہو کر قلم عباسؑ کا
(آرزو لکھنوی)

کس درجہ اعتماد نبوت علیؑ کو ہے
(سید وحید الحسن ہاشمی) تیغوں میں سو گئے ہیں نبیؐ کی زبان پر

کیا شہادت کی خوشی تھی شام کو
(میر انیس) زخم جو کھایا بدن پر کھل گیا

ان کے آگے صولت دنیا کا ذکر او ابن سعد
(جوش ملیح آبادی) کھیلتی ہے جن کی ٹھوکر تاج سلطانی کے ساتھ

ادھر باطل پرستوں نے اٹھائے سر تکبر سے
(کسریٰ منہاس) ادھر سر سے کفن باندھے ہوئے نکلے خدا والے

کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
(مصطفیٰ خاں بکریگ) دھو ہاتھ زندگی سے مہمان کر بلا

سلام نگاری میں استعارے کی روایت غیر معمولی حیثیت کی حامل ہے۔ استعارہ شاعرانہ جدت طبع اور قوت فکر کی علامت ہے۔ لطیف اور نازک خیالات کے علاوہ پیچیدہ اور دقیق افکار جو عام زبان میں بیان نہ کئے جاسکتے ہوں استعارے کے حوالے سے موثر انداز میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔ استعارہ کلام میں حسن اور ادائیگی میں جاذبیت و دلکشی کا باعث بنتا ہے۔ سلام نگاری میں تخیل، محاکات اور موضوع کے عزائی تاثر کو دلکش انداز میں استعارہ کی بدولت ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ استعارہ غور و فکر اور نکتہ نچی کے مختلف رویوں کو فروغ دیتا ہے۔ معانی میں بلاغت کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ سلام نگاری میں رمز و ایمائیت کا جوہر استعارے کی بدولت ہی نکھرتا ہے۔ ایجاز و اختصار کا حسن استعارے کی بدولت ہی ممکن ہے جو سلام نگاری کے مجموعی تاثر کو نکھارنے کا سبب بنتا ہے۔ اس مجموعی تاثر سے سلام نگاری میں وسعت اور بلاغت کا جوہر نمایاں ہوتا ہے۔

استعارے سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے بدخشان نبیؐ کے لعل احمر السلام

اے گلستان علیؑ کے لالہ تر السلام

(لعل احمر اور لالہ تر استعارہ حضرت حسینؑ کیلئے)

میر احسان علی احسان کے سلام میں استعارہ کا استعمال دیکھئے:

ماہی سے یہ مہہ کہتا دریا میں نظر کر کے
پانی میں نظر آئے دو کیسے ستارے ہیں

(ستارے استعارہ حضرت مسلم کے دونوں بیٹوں کیلئے)

زبان و بیان میں حسن آفرینی، اثر پذیری اور وضاحت تشبیہ کی بدولت بھی پیدا ہوتی ہے۔ تشبیہ سے شاعرانہ ندرت، تخیل اور قوت ایجاد کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ذریعے لطیف احساسات، نازک جذبات اور قلبی واردات بلیغ اور آسان انداز میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔ سلام نگاری کی مستحکم روایت لطیف و دقیق تصورات و افکار کی حامل رہتی ہے۔ ان تصورات و افکار کو تشبیہ کے ذریعے ہی بیان کرنا ممکن ہے تاکہ سلام نگاری کی بنیادی اور تاثراتی کیفیت سے آگاہی ہو سکے۔ تشبیہ کی بدولت سلام نگاری میں حسن اور معنویت کا عنصر ابھرتا ہے۔ تشبیہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خون میں ڈوبے ہوئے اصغر ہیں شہ کی گود میں
اے قمر کیا چاند سی صورت کی صورت ہو گئی (قمر جلالوی)
اس شعر میں اصغر کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے۔

مثل بوئے گل سفر ہو گا مرا
وہ نہیں میں جو کسی پہ بار ہوں (میر انیس)

حرم کی گود میں اس طرح بوتراٹ آئے
نبی کے قلب پہ جیسے کہ الکتاب آئے (وحید الحسن ہاشمی)

مچکتے ہیں جو آنسو ہم انہیں موتی سمجھتے ہیں
فضائے دل کا فیض ابر نیساں دیکھتے جاؤ (آل رضا)

مثال شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے
نہال عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا (میر انیس)

شاعرانہ روایت کے پیش نظر صنائع لفظی و معنوی کو سلام نگاری کے حسن کی تخلیق کا ذریعہ سمجھا گیا۔ صنائع لفظی و معنوی سلام نگاری میں صوتی اور معنوی تاثر کے مربوط رجحان کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ عقیدت و احترام اور سوز و الم کی کیفیت جو سلام نگاری کی بنیادی غایت ہے صنائع لفظی و معنوی سے مستحکم اور بلاغت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ سلام کا حسن لفظ و معنی کے جملہ لوازم اور روابط کے ساتھ نکھرتا ہے۔ الفاظ کی فنِ ترتیب علمِ بدیع (صنائع لفظی و معنوی) کی بنیاد ہے جس کی بدولت سلام نگاری کے داخلی و خارجی حسن کو نمایاں کرنے کا موقع ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راقم الحروف کو اردو سلاموں میں صنائع بدائع کی بے شمار اقسام ملی ہیں تاہم طوالت کے خوف سے ان تمام محاسن کی مثالیں پیش کرنے سے عہد اگریز کیا جا رہا ہے۔ صرف نمایاں صنعتوں کی مثالیں دیکھئے۔

(۱) صنعت مراعاة النظر

تاریکیاں یہ شامِ غریباں کی اے قمر
تارے بھی چھپ گئے فلک کج مدار کے (قمر جلالوی)

(۲) صنعت تکرار

حال صغریٰ نے جو پوچھا تو یہ زینب نے کہا
دُکھ پہ دُکھ غم پہ غم آزار پہ آزار ملے (مرزا دبیر)

(۳) صنعت حسن تعلیل

ہنوز اسکی فضا میں ہے صدائے العطشِ گونجی
کہ موجیں علقہ کی کھا رہی ہیں بچ و تاب اب بھی (ڈاکٹر صفدر حسین)

(۴) صنعت لف و نشر (مرتب)

دیکھو سر و پیشانی و ابرو کا قرینہ
یہ عرش ہے یہ لوح یہ قدرت کا قلم ہے (مرزا دبیر)

(۵) صنعت تابع

علیؑ کو حق نے اتارا تو عینِ کعبہ میں
کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا (انیس)

(۶) صنعت تنسیق الصفات

قامت ہے وہ قامت کہ حضور اس کے شرف سے
انگشت سے کم سروِ گلستانِ ارم ہے (مرزا دبیر)

(۷) صنعت تضاد

گزر گیا ہے کوئی دن دعائے صبر کے ساتھ
گزر گئی ہے کوئی شب دیا بجھائے ہوئے (قمر رضا شہزاد)

(۸) صنعت جمع و تقسیم

شہید و بے کس و مظلوم و بے دیار و غریب
ہر ایک لفظ یہ شیر کے خطاب میں ہے (مرزا دبیر)

(۹) صنعت ترصیح

مرحب بڑھا ادھر سے ادھر سے خدا کا شیر
آتے ہی اس نے ضرب لگائی حسام کی (مرزا دبیر)

(۱۰) صنعت مبالغہ

اس رخس کا سایہ ہے ہما، جست ہے بجلی
سیماب پینہ ہے ہوا گرد قدم ہے (مرزا دبیر)

(۱۱) صنعت سیاق الاعداد

علی کی تیغ دو سر سے عدد جو چار ہوئے

یہ ایک وصف تھا اس میں کے دو کے چار ہوئے (دبیر)

اس معروضہ کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ واقعہ کر بلا نے محض انسانوں ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اصنافِ شعر و ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ برصغیر کی تہذیب و ثقافت میں پروان چڑھنے والے عزائی ادب میں واقعہ کر بلا کے متنوع پہلوؤں کو جس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے عالمی ادب میں بھی اس کی نظیر ملنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ واقعہ کر بلا کے اثرات یوں تو ہر صنفِ نثر و شعر میں تلاش کیے جاسکتے ہیں تاہم مرثیہ، سلام اور نوحہ کی تشکیل و ترتیب اسی واقعہ کی مرہونِ منت ہے۔ مرثیہ اور نوحہ کی نسبت سلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسے تمام معروف شعرا کا فکری و فنی تعاون حاصل رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے اندرونی مذاق و مزاج کی تشکیل کے ساتھ ساتھ اس صنف کی ہیئت کا تعین بھی جلد ہی ہو گیا اور اس کے لیے غزل کا پیکر مناسب خیال کیا گیا۔ یہاں یہ بات باور کرنا یقیناً ضروری ہے کہ صنفِ سلام کے لیے غزل کی ہیئت پسندیدہ ضرور قرار دی گئی لازم نہیں۔ یہی سبب ہے کہ قدیم و جدید شعرا نے اپنی پسندیدہ ہیئتوں میں بارگاہِ سید الشہداء میں سلام نیاز پیش کیے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے سلام کے محاسن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے مختلف خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نظریہ بھی قائم کیا ہے کہ اپنے مذاق و مزاج کے لحاظ سے سلام دیگر اصناف

سے ایک جدا صنف ہے۔ خاص طور پر عزائی ادب میں جو قبولیت سلام کو حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید شعرا نے غزل کے بعد جس صنف کو لائق اعتنا سمجھا ہے وہ سلام ہے۔ اس باب میں ہم نے برصغیر پاک و ہند کے متنوع نامور شعرا کے سلاموں کی پیش بہا مثالیں پیش کر کے اپنے موقف کو مزید مضبوط بنا دیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ صنف سلام کے تمام مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس صنف کا ادبی لحاظ سے بار دیگر فکری و فنی وقیع مطالعہ کیا جائے اور اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی جائے۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں مزید کوتاہی برتی تو ہم اپنے قابل فخر ادبی سرمائے سے کما حقہ استفادہ نہیں کر پائیں گے۔

حواشی

(اُردو سلام..... فنی مباحث، ہیئت، خصوصیات)

- (۱) مجتبیٰ حسین پروفیسر ”مرثیہ اور عہد جدید“ مشمولہ جدید مرثیہ نگاری از سید وحید الحسن ہاشمی لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۳
- (۲) گوپی چند نارنگ ”ساختہ کر بلا بطور شعری استعارہ“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء، ص ۲۰
- (۳) محمد حسن ڈاکٹر ”ادبی سماجیات کے نقطہ نظر سے مرہیے کا مطالعہ“ سہ ماہی ”رنگائی ادب“ کراچی، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۱۱
- (۴) سلیم اختر ڈاکٹر ”وحید الحسن ہاشمی کے مرہیے“ مشمولہ ”الطش“ (جلد سوم) لاہور: الحبيب پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۵
- (۵) خواجہ محمد زکریا ڈاکٹر ”قدیم نظمیں“ لاہور: بک ورلڈ ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۱
- (۶) سجاد باقر رضوی ڈاکٹر ”معروضات“ لاہور: پولیمر پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء، ص ۳۷
- (۷) سجاد باقر رضوی ڈاکٹر (مقدمہ) ”ظاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی)“ لاہور: سفینہ پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء، ص ۱۰
- (۸) وزیر آغا ڈاکٹر ”اردو شاعری کا مزاج“ لاہور: جدید ناشرین ۱۹۶۵ء، ص ۹
- (۹) سلیم اختر ڈاکٹر ”ادب اور کلچر“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء، ص ۳۱۱
- (۱۰) احتشام حسین پروفیسر مقدمہ ”معراج فکر (نجم آفندی)“ لکھنؤ: سرفراز پریس ۱۹۶۰ء، ص ۲۸
- (۱۰-۱) شبیہ الحسن ڈاکٹر ”اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ“ لاہور: ماہنامہ ”شام و سحر“ ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۲۶
- (۱۱) سہیل احمد ڈاکٹر ”طرفیں“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء، ص ۱۱
- (۱۲) حالی الطاف حسین مقدمہ ”شعر و شاعری“ لاہور: کشمیر کتاب گھر، ص ۸۵
- (۱۳) مسیح الزمان ڈاکٹر ”اردو مرہیے کا ارتقا“ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، بار دوم ۱۹۹۱ء، ص ۹
- (۱۴) فرمان فتحپوری ڈاکٹر ”میرانیس حیات اور شاعری“ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۵

- (۱۵) صفدر حسین ڈاکٹر (مقدمہ) تجلیات انیس (مرتبہ: یوسف حسین شائق لکھنوی) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء، ص ۹
- (۱۶) شارب ردولوی ڈاکٹر "تنقیدی مطالعے" لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۶
- (۱۷) فرمان فتحپوری ڈاکٹر "میر انیس حیات اور شاعری" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۵
- (۱۸) علی جواد زیدی "انیس کے سلام" دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸
- (۱۹) وحید الحسن ہاشمی سید "تغلب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴
- (۲۰) صفدر حسین ڈاکٹر (مقدمہ) تجلیات انیس (مرتبہ: یوسف حسین شائق لکھنوی) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء، ص ۹
- (۲۱) امداد امام اثر "کاشف الحقائق" (جلد دوم) لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۰
- (۲۲) ضمیر اختر نقوی ڈاکٹر "نوادرات مرثیہ نگاری" (جلد دوم) کراچی: مرکز علوم اسلامیہ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۰
- (۲۳) شارب ردولوی ڈاکٹر "تنقیدی مطالعے" لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۶
- (۲۴) فرمان فتحپوری ڈاکٹر "اردو لغت" کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۸۲
- (۲۵) سید احمد دہلوی مولوی "فرہنگ آصفیہ" (جلد سوم) لاہور: مکتبہ حسن، ۱۸۹۸ء، ص ۸۷
- (۲۶) وارث سرہندی "علمی اردو لغت" (جامع) لاہور: علمی کتاب خانہ، سن ۹۱۶
- (۲۷) منشی چرغی لال "مخزن المحاورات" لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳۱
- (۲۸) عبد المجید خواجہ "جامع اللغات" (جلد دوم) لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۵۵
- (۲۹) نشتر چاندھری عبدالحکیم خاں قائد اللغات لاہور: ایم آر برادرز، ۱۹۶۹ء، ص ۵۸۷
- (۳۰) نسیم امروہوی "نسیم اللغات" لاہور: شیخ غلام اینڈ سنز، ۱۹۵۵ء، ص ۵۶۷
- (۳۱) وحید الزماں علامہ "لغات اللہ" کراچی: نور محمد اصح المطالع و کارخانہ تجارت کتب، سن ۱۴۳۳
- (۳۲) ظہور الحسن ناظم "اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا" لاہور: حیدری پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۴
- (۳۳) فیروز الدین مولوی "فیروز اللغات" لاہور: فیروز سنز، سن ۴۰
- (۳۴) حامد علی خاں مولانا "اردو جامع انسائیکلو پیڈیا" لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۷۷۱
- (۳۵) فضل الہی عارف "فرہنگ کارواں" لاہور: مکتبہ کارواں، سن ۴۴۳
- (۳۶) شان الحق حقی "فرہنگ تلفظ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، ص ۶۳۰
- (۳۷) نائب حسین نقوی "فرہنگ انیس" (جلد دوم) دہلی: مکتبہ جامعہ لمینڈ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۲۹
- (۳۸) تصدق حسین رضوی سید "لغات کشوری" لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۶
- (۳۹) نور الحسن نیر مولوی "نور اللغات" (حصہ سوم) لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ۳۵۰
- (۴۰) اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۱۱ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، سن ۱۲۳

- (۴۱) فرمان فتح پوری ڈاکٹر ”میر انیس حیات و شاعری“ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۳ء، ص ۱۷۵
- (۴۲) مہذب لکھنوی ”مہذب اللغات“ (جلد ششم) لاہور: نائی پریس، سن ۱۹۷۵ء
- (۴۳) شبلی نعمانی علامہ ”موازنہ انیس و دبیر“ آگرہ: مفید عام پریس، ۱۹۰۷ء، ص ۲۲۱
- (۴۴) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“ دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء، ص ۱۷
- (۴۵) تقی عابدی ڈاکٹر ”سلک سلام دبیر“ لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۸
- (۴۶) وحید الحسن ہاشمی سید ”تشنہ لب ہے حسین“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶
- (۴۷) علی رضوی سید ”حسین پر سلام“ کراچی: میر انیس اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۳
- (۴۸) نواز حسن زیدی سید ”نجم آفندی کلروفن“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶۴
- (۴۹) اسداریب ”نقد انیس“ لاہور: جدید بک ڈپو، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰
- (۵۰) شبلی نعمانی علامہ ”موازنہ انیس و دبیر“ آگرہ: مفید عام پریس، ۱۹۰۷ء، ص ۲۲۱
- (۵۱) حفیظ صدیقی ابوالاعجاز ”کشاف تنقیدی اصطلاحات“ اسلام آباد: سن مقتدرہ قومی زبان، ص ۱۰۲
- (۵۲) فرمان فتح پوری ڈاکٹر ”میر انیس حیات اور شاعری“ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۵
- (۵۳) سید صفدر حسین ڈاکٹر ”تجلیات انیس“ (مرتبہ یوسف حسین شائق لکھنوی) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء، ص ۹
- (۵۴) شارب رودلوی ڈاکٹر ”تنقیدی مطالعے“ لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۴
- (۵۵) علی رضوی سید ”حسین پر سلام“ کراچی: میر انیس اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۳
- (۵۶) اسداریب ”نقد انیس“ لاہور: جدید بک ڈپو، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰
- (۵۷) شیخ چاند ”سودا“ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۴ء، ص ۳۰۶
- (۵۸) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“ دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء، ص ۲۵
- (۵۹) فرمان فتح پوری ڈاکٹر ”میر انیس حیات اور شاعری“ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۵
- (۶۰) وحید الحسن ہاشمی سید ”تشنہ لب ہے حسین“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹
- (۶۱) شارب رودلوی ڈاکٹر ”تنقیدی مطالعے“ لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۵
- (۶۲) وحید الحسن ہاشمی سید ”تشنہ لب ہے حسین“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶
- (۶۳ تا ۶۸) عبدالرؤف عروج ”اردو مرثیے کے پانچ سو سال“ کراچی: شارق پبلی کیشنز، سن ۱۹۸۵ء، ص ۶۱ تا ۶۹
- (۶۹) شبیہ الحسن سید ڈاکٹر (مرتبہ) ”باقیات آل رضا“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۷
- (۷۰ تا ۸۱) خالد احمد عمران منظور (مدیران) ماہنامہ ”بیاض“ لاہور: مارچ تا جون ۲۰۰۳ء، سلام نمبر ص ۳۳ تا ۶۸
- (۸۲) شبیہ الحسن ڈاکٹر (مدیر) ماہنامہ ”شام و بحر“ لاہور: جون ۱۹۹۴ء، محرم نمبر ص ۳۶

- (۸۳) محمد رضا عابدی (مدیر) ہفت روزہ "رضا کار" لاہور: ۲۸ تا ۲۳ فروری ۲۰۰۴ء، سید الشہد انمبر ص ۱۰۲
- (۸۴) وحید الحسن ہاشمی سید "تشنہ لب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۷۸
- (۸۵) حالی الطاف حسین "مقدمہ شعر و شاعری" لاہور: کشمیر کتاب گھر، سن ۵۸
- (۸۶) امداد امام اثر "کاشف الحقائق" لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۱
- (۸۷) اسد اریب "نقد انیس" لاہور: جدید بکڈ پوٹ، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱
- (۸۸) علی جواد زیدی انیس کے سلام دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء، ص ۳۲
- (۸۹) صفدر حسین سید ڈاکٹر "رزم نگاران کربلا" لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص ۱۶۷
- (۹۰) وحید الحسن ہاشمی سید تشنہ لب ہے حسین لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۹
- (۹۱) وحید الحسن ہاشمی سید تشنہ لب ہے حسین لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱
- (۹۲) اسد اریب "نقد انیس" لاہور: جدید بکڈ پوٹ، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰
- (۹۳) ناظر حسن زیدی ڈاکٹر (مقدمہ) جلوہ تہذیب (سید صفدر حسین) لاہور: بارگاہ ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۱۵
- (۹۴) شبیر الحسن سید ڈاکٹر "اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۸
- (۹۵) حامد حسن قادری پروفیسر "مختصر تاریخ مرثیہ گوئی" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۰
- (۹۶) شجاعت علی سندیلوی تعارف مرثیہ الدآباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۸۶
- (۹۷) یوسف حسن (رائے) مشمولہ: کربلا کر بلا حسین حسین (مرتبہ اسرار زیدی) لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵
- (۹۸) اسرار زیدی (مرتبہ) کربلا کر بلا حسین حسین لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵
- (۹۹) حالی الطاف حسین "مقدمہ شعر و شاعری" لاہور: کشمیر کتاب گھر، سن ۶۸
- (۱۰۰) وحید الحسن ہاشمی "تشنہ لب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷
- (۱۰۱) وحید الحسن ہاشمی سید "تشنہ لب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۰
- (۱۰۲) وحید الحسن ہاشمی سید "تشنہ لب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۴۱
- (۱۰۳) شبیر الحسن سید ڈاکٹر "اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۶۲
- (۱۰۴) تقی عابدی سید ڈاکٹر (مرتبہ) "سلک سلام دہر" لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۱
- (۱۰۵) وحید الحسن ہاشمی سید "تشنہ لب ہے حسین" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۶

باب دوم

اُردو سلام قیام پاکستان سے قبل

اردو سلام قیام پاکستان سے قبل

سلام کی روایت۔ دکن، دہلی اور لکھنؤ میں سلام نگاری

اردو میں سلام نگاری کی روایت

اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر درود و سلام بھیجنے کا جو حکم صادر فرمایا اس پر عمل کرتے ہوئے علمائے سلف نے منظوم سلام بھی لکھے۔ یہ سلام اردو شاعری کا سرمایہ ہیں۔ ان منشور اور منظوم سلاموں میں محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ ساتھ جدا انبیاء حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل کو بھی شامل کر لیا گیا۔ مابعد اسی روایت کے تسلسل میں آل رسولؐ خصوصاً شہدائے کربلا پر سلام بھیجنے کی باقاعدہ کوششوں کا آغاز ہوا۔ یوں بالواسطہ طور پر ذکر محمدؐ اور آل محمدؐ اردو ادب کی باقاعدہ صنفِ سخن سلام کی صورت میں ڈھل گیا۔

سلام اپنے مخصوص اصطلاحی معنی میں ہمارے پیش نظر ہے۔ امداد امام اثر (۱) علی جواد زیدی (۲) اور سید علی رضوی (۳) کے نزدیک سلام غزل اور سہرے کے قبیل ہی کی ایک صنف ہے البتہ ڈاکٹر صفدر حسین سلام میں سیرت پاک کے بیان کو بھی شامل کرتے ہیں۔ (۴) تاہم سیرت نبی اکرمؐ کا ذکر خواں کسی بھی ہیئت یا صنفِ سخن میں کیا وہ نعت ہی کہلائے گا۔ (۵)

جہاں تک سلام نگاری کی روایت کے آغاز کا تعلق ہے تو محققین کے ہاں اس بارے میں واضح اختلاف رائے پایا جاتا ہے تاہم سلام ایک جداگانہ صنفِ سخن کی حیثیت سے نہ تو عربی شاعری میں موجود تھا نہ فارسی شعرا کے ہاں اس کا وجود نظر آتا ہے۔ علی جواد زیدی سلام نگاری کے تاریخی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

”..... سلام کی صنف ان اصنافِ شعر میں سے ہے جو صرف اردو میں پھولی پھلی، عربی میں

متفرق اشعار جو سلام سے موضوعاتی ربط رکھتے ہیں اس زبان کے قصائد میں مل جائیں گے

لیکن جداگانہ صنف کے طور پر سلام کا عربی میں وجود نہیں۔ (۶)

فارسی شاعری میں سلام مرثیے سے مربوط ہے۔ گویا یہاں بھی اس کی جداگانہ حیثیت مشکوک ہے۔ چونکہ ایرانی شعرا

مرثیہ نگاری کی جانب متوجہ رہے اس لئے سلام کی صنف فروغ نہ پاسکی البتہ اردو شاعری نے سلام کو ایک مذہبی صنف کے طور پر اپنایا اور اس روایت کی پاسداری میں سلاموں کا ایک ضخیم ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ (۷)

اردو میں سلام نگاری کا ارتقا کئی صدیوں کو محیط ہے۔ اس لئے اس باب کو ایک تو زمانی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی اردو سلام نگاری قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد سے تاحال۔ دوسرے اس کی تقسیم علاقائی اعتبار سے ہے کہ مورخین زبان و ادب کے ہاں یہی روایت نظر آتی ہے۔ چنانچہ دکن میں سلام نگاری کی روایت پھر شمالی ہند اور پھر لکھنؤ میں سلام نگاری کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دکن میں سلام نگاری

(۱) قطب شاہی و عادل شاہی دور: (۱۵۰۸-۱۶۸۶)

سلطان محمد تغلق کی دکن پر گرفت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی اور یوں ۱۳۴۷ میں بہمنی حکومت قائم ہو گئی۔ (۸) اس حکومت کے خاتمے (۱۵۲۵) سے کچھ عرصہ قبل ایران سے جو علماء یہاں آئے وہ اپنی تہذیب و ثقافت بھی ساتھ لیتے آئے۔ فارسی سرکاری زبان تھی اس لئے ان علماء کو سرکاری طور پر بلند مقام و مرتبے سے نوازا گیا۔ اہل دربار کی ایرانی معتقدات سے دلچسپی دیکھتے ہوئے عوام بھی ایرانی ثقافت کی جانب مائل ہونے لگے چنانچہ بہمنی سلطنت کے زوال سے قبل شیعہ اعتقادات یہاں اپنے قدم جما چکے تھے۔

بہمنی سلطنت کے زوال پر دکن میں مسلمانوں کی پانچ شاہیہ سلطنتیں قائم ہو گئیں (۹) جن میں احمد نگر میں نظام شاہی (۱۳۹۰-۱۶۳۵) گولکنڈہ میں قطب شاہی (۱۵۰۸-۱۶۸۷) اور بیجاپور میں عادل شاہی (۱۳۹۰-۱۶۸۷) تادیر قائم رہیں۔

ان خود مختار ریاستوں کو ایرانی عقائد ترکے میں ملے تھے اس لئے ان ریاستوں کے حکمران بھی شیعہ تھے اور ان کی افواج کی کثیر تعداد میں ایرانیوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ احمد نگر میں قائم ہونے والی نظام شاہی حکومت نے شیعہ عقائد کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس دور میں ایران سے آنے والے معروف عالم شاہ طاہر نے دنیا بھر سے شیعہ علماء کو احمد نگر مدعو کیا اور یوں دکن میں شیعہ عقائد پھیلنے پھولنے لگے۔ تاہم اہل دکن نے شیعہ مذہب و ثقافت میں اپنی جانب سے اضافے بھی کئے اس لئے کہ ایران کے صفوی دور سے قبل وہاں محرم کے مخصوص مراسم اور عزاداری کا رواج نہ تھا۔ چنانچہ صفوی دور میں جو علماء ایران سے دکن آئے انہوں نے محرم کی مخصوص رسومات اور عزاداری کو یہاں رواج دیا جس میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ان دکنی ریاستوں میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی حکمران عقیدہ کے اعتبار سے شیعہ تھے جو اپنے لائٹسکرسمیت ایران سے ہندوستان آئے تھے اور اپنے ساتھ اپنی ثقافت لے کر آئے تھے اس کے علاوہ ایران سے آنے والے علماء کے ساتھ محرم کی مخصوص رسومات بھی دکن میں منتقل ہو چکی تھیں۔ چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور میں شاہی عاشور خانے تعمیر کئے

گئے۔ محرم کے مہینے کو سرکاری طور پر تعز یہ داری کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ایام عاشور میں نوبت و نقارہ مدفوف رہتے اور تمام رعایا مشمول ہندوؤں کے ان رسومات میں شرکت کرتی (۱۰) بقول نصیر الدین ہاشمی:

”گو لکندہ اور بیجا پور میں شاہی عاشور خانے موجود تھے۔ جہاں ایام عاشور میں مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ جہاں عزائی شاعری پیش کی جاتی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ سیاہ لباس میں ننگے پاؤں ماتمی جلوس میں شامل ہوتا تھا۔ (۱۱)

محرم کو نہایت عقیدت و احترام سے منایا جاتا اور عزاداری کی جملہ رسومات کا سرکاری طور پر اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر مجالس بھی منعقد ہوتیں۔ مجالس میں مرثیے اور سلام نہایت توجہ سے سنے جاتے۔ مرثیے سے قبل سلام بھی پیش کیا جاتا اور یوں سلام مرثیے کے دیاچے کے طور پر مد توں لکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ”سلام“ کو مرثیے پر تاریخی اعتبار سے تقدم حاصل ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین ”سلام“ کی غرض و غایت اور اس کی ابتدا کے بارے میں فرماتے ہیں:

”مرثیہ نگار منبر پر پہنچ کر اول چند رباعیات پڑھتا پھر سلام کے اشعار سے سامعین کے ذوق کو ایک نئے پہلو سے آمادہ سماعت کرتا اور جب سب ہم تن گوش ہو جاتے تو آخر میں اپنی بھرپور کاوش ادب کا ثمرہ مرثیہ کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ہم سلام کو مرثیہ کا پیش لفظ کہہ سکتے ہیں۔“ (۱۲)

سلام نگاری کی ضرورت اور آغاز کے بارے میں ڈاکٹر شارب ردو لوی کا بیان ملاحظہ کیجئے:

”..... اول یہ کہ کسی محفل میں مرثیہ پڑھنے کے لئے ایک فضا بنانے کی ضرورت تھی تاکہ سامعین اپنے ذہن کو ایک طویل بیانیہ نظم سننے کے لیے تیار کر سکیں..... سلام کہے جانے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں شعری نشستوں اور شاعروں کا انعقاد عام تھا..... لیکن ایام عزاکے احترام میں عشقیہ شاعری یا غزلوں کا کہنا سننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لئے اس زمانے میں غزل کے بدل کے طور پر سلام کہے جاتے تھے اور مشاعروں کے بجائے مسالہوں کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔“ (۱۳)

دور حاضر کے معروف مرثیہ گو اور سلام نگار سید وحید الحسن ہاشمی اردو سلام نگاری کی ضرورت و اہمیت اور آغاز کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”..... اردو سلام نگاری کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب مجالس کی ابتدا ہوتی تھی اور مرثیہ خواں منبر پر رونق افروز ہوتا تھا تو پہلے سلام کے کچھ اشعار پڑھتا تھا۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہوتا تھا کہ سامعین جو ادھر ادھر منتشر ہیں اپنی اپنی نشست گاہوں پر بیٹھ

جائیں اور آداب مجلس کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ شاعر کی طرف موڑ لیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ شاعر کو سلام کی ادائیگی سے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سامعین کی مزاجی کیفیت کیا ہے۔ اور ان میں شعر فنی کی کتنی صلاحیت ہے تاکہ اس کا آئندہ پیش ہونے والا کلام مجروح نہ ہو اور مجلس کا میاب رہے۔ (۱۴)

اہل علم و فن کی درج بالا آرا کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ سلام نگاری کا آغاز دکن میں ہوا۔ مرثیے کے پیش لفظ کے طور پر ہوا اور غزل کے بدل کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس طرح غزل کے فنی لوازم بھی سلام میں مستعمل ہو گئے۔ مزید برآں سلام کی مقبولیت مخصوص انداز سلام خوانی کے باعث بڑھنے لگی۔ چنانچہ جب سلام خوش الحانی سے آغاز مجلس میں پڑھا جاتا تو اسے ذوق و شوق سے سنا جاتا یوں جلدی ہی سلام کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا اور مرثیے کے ساتھ ساتھ سلام نگاری کی مستحکم روایت نے جنم لیا۔ جو آج تک نہ صرف قائم ہے بلکہ مسلسل ارتقا پذیر ہے۔

جہاں تک پہلے سلام نگار کا تعین کرنے کا تعلق ہے تو محققین اور مورخین کے نزدیک گوکلندہ کی قطب شاہی ریاست کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ پہلا سلام نگار ہے بقول ڈاکٹر رشید موسوی:

”محمد قلی کے کلیات میں کچھ مرثیے نوے اور سلام بھی شامل ہیں۔“ (۱۵)

مزید برآں قلی قطب شاہ ہی کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے تاہم قرین قیاس یہی ہے کہ جو پہلا مرثیہ نگار ہوگا وہی پہلا سلام نگار بھی ہوگا اس طرح قلی قطب سے کہیں پہلے شاہ برہان الدین جانم مرثیہ لکھ چکے تھے جبکہ قطب شاہی دور میں وجہی قلی قطب شاہ سے ۲۰ برس قبل کا شاعر ہے اور برہان الدین جانم وجہی سے بھی ۸۰ برس قبل کا شاعر ہے اس طرح بقول ڈاکٹر رشید موسوی:

”وجہی کو ہم قطب شاہی دور کا پہلا مرثیہ نگار شاعر کہہ سکتے ہیں اس سے پہلے صرف برہان

الدین جانم کا مرثیہ ملتا ہے۔“ (۱۶)

یوں برہان الدین جانم کو پہلا مرثیہ نگار ہونے کے ناتے پہلا سلام نگار بھی ہونا چاہیے لیکن ایسا اس لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ جانم نے مجلس میں پڑھنے کے لئے مرثیہ نگاری نہیں کی اور یوں بھی اس کا صرف ایک ہی مرثیہ دستیاب ہوا ہے جبکہ وجہی محمد قلی کا معاصر مرثیہ نگار ہے اور اس دور میں مجالس کا سرکاری طور پر اہتمام کیا جاتا تھا جس میں سامعین کی کثیر تعداد موجود ہوتی تھی اور ان مجالس میں مرثیے سے قبل سلام پڑھا جاتا تھا اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ وجہی کو پہلا سلام نگار تسلیم کیا جائے اور محمد قلی قطب شاہ کو دوسرا سلام نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔

وجہی کے سلام کا مطلع ملاحظہ کیجئے:

حسین کا غم کرو عزیزاں
انجو نین سوں جھڑو عزیزاں (وجہی)

قلی قطب شاہ کے کلیات میں پانچ مراثی اور ایک قصیدہ بعنوان ”یا علی“ موجود ہے۔ ان مراثی کو سید وحید الحسن ہاشمی ”سلام“ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

”قلی قطب شاہ کا جو دیوان دستیاب ہوا ہے۔ اس میں چند سلام ملے ہیں جنہیں نقادان فن

نے غلطی سے مرعے کے ذیل میں شمار کیا ہے۔“ (۱۷)

پروفیسر ڈاکٹر مظفر عباس بھی ان مرثیوں کو ”سلام“ کی صف میں شامل کرنے کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

”اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں کل پانچ مرعے

شامل ہیں۔ ان مرثیوں میں ہیئت کے علاوہ مرعے کے دیگر لوازم خطیبانہ لہجہ، گھن گرج،

منظر نگاری رزم و بزم آرائی بھی موجود نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں انہیں سلام کہا جائے تو

زیادہ مناسب ہوگا۔“ (۱۸)

قلی قطب شاہ کے دیوان میں شامل مرعے جنہیں بعض محققین و ناقدین سلام قرار دیتے ہیں، ملاحظہ کیجئے:

(۱)

محرم مہینے میں آیا اماں کا سو غم پھر کر

زمیں ہوو آساں میانے بھریا سر تھے الم پھر کر

زمیں پر کیا بلا کیا شور کیا غوغا ہوا پیدا

یتا کج دل میں دکھ داتیا نہ نکلے غم تھے دم پھر کر

اماں تم سورج جلجل ہوا ہے آگ کا شعلہ

جلایا ہے اپس کوں کوئلے نمے پنم پھر کر

مسلماناں ندیاں سارے بھراؤ اپنے انجھواں تھے

کہ آیا ہے اماں کا بلا سر تھے ستم پھر کر

محرم کا نہ لیو نادوں کد تم اے مسلماناں

قیامت ہو قیامت کا اُچایا ہے علم پھر کر

نہ تھا دکھ درد حوراں کوں کد ہیں جنت منے یک تل

حسیناں کے دکھوں ماتم پکڑتے ہیں جنم پھر کر

(۲)

لہو روتیں ہیں بی بی فاطمہ اپنے حسناں تیں
 اولھو لالی کا رنگ سا تو گنگن اپراں چھایا ہے
 اماں پر ہوا سو دکھ نکو پوچھ مسلماناں
 ہریک ایمام پر یک دکھ بہت گھاتاں بسایا ہے
 ظلم کیسا ہوا ہے آہ دنیا میں اون اوبر
 یتا ظلم و بلا سب فاطمہ خاطر ملایا ہے
 اگاہ مینے کے نئے محرم کیوں نہیں ہے توں
 سبھی مینے میں خوشیاں کرتے توں اب دکھ بسایا ہے
 کیا ہے میہانی یوں اماں کا محرم توں
 جنگل میں کر بلا کے سب بلایاں کو بلایا ہے
 مسلماناں کوں نہیں ہے اس برابر کوئی بلا جگ میں
 کہ انجھواں کے لہو سیتیں پیالے بھر پلایا ہے
 اماں تھے مٹے قولوں سوشامی شومی کافر
 ہوئے بے قول تو اُن تیں خدا دوزخ بنایا ہے
 کئے ہیں مومنناں کسوت حسن کے زہر تھے ہریا
 سو اس کے چھاو تھے اسان اپنا رنگ بھرایا ہے
 خدایا قطب شہ کو بخش توں حرست اماں کی
 کہ اُن کی مدح کا حلقہ مرے کن میں سہایا ہے
 مدد کرنے ملک آوے قبولے نیں امام اُن کو
 کہ جیدر ہات تھے جبار دنیاں سر گرایا ہے
 سورج جلتا ہے سارے ماتمیاں کے آہ تھے سب دن
 چندا اس شرم تھے گل کر سو اپنا سر نوایا ہے
 یزید و سب یزیدیاں مرگ بن ہوشیار نہ ہوئیں
 دنیا کے مال تھے اُن کا سوکھ کہہ یہی پھرایا ہے

یزیدیاں کا سو وقت آیا کرو لعنت یزید اوپر
 سور کے گوہ میں داڑی موچیاں سر پھیں ڈبایا ہے
 یزیدیاں کا سو قصہ ظلم کا کوئی نا سکے کہنے
 کہ جانن پن تھے شیطان ان کئے تعلیم پایا ہے
 یزید و شر کے کاماں نہ کرسیں کوئی شیطان بھی
 ہزاراں لعن ہے اس پر جن ایسا پوت جایا ہے

(۳)

یتیمآں آہ ہور درواتے ہے ہور کچا جلتا
 اوی تھے دو جہاں تیں ٹیل کا کسوت پناہ ہے
 اماماں بارہ کوں آ کر قلم سوں دکھ دیئے کافر
 اسی تھے قاطمہ کا کھ لہو سیتیں دھلایا ہے
 یتیمآں واہ پیاسے واہ پیاسے کر رویں مل کر
 اسی دکھ درد تھے انجھو گلا اُن کا سکایا ہے
 اے جیونا جانتوں دیوے نمں اس دکھ تھے جلتا کر
 پریاں حوراں اپس اکھیاں تھے لہو انجھو چوایا ہے
 اماماں کا قصہ کہنے نہیں ہے جیب کوں طاقت
 شہیداں کے غماں تھے درد بادل جگ پہ چھایا ہے
 خدایا داد لے ہور داد لے اس ظالماں کن تھے
 کہ جد نہیں سو یتیمآں پر جفا ہور ظلم دھایا ہے
 اگر دعوے دھریں ایمان کے تم سب مسلماناں
 روؤ دم دم کہ دوزخ اگ تھے تمنا کو چھڑایا ہے
 اماماں کی دعا تھے قطب شہ کو دے شفا یارب
 شہیداں دوستی تھے سب شہاں سیانے سراپا ہے

(۴)

آؤ مل کر ماتمیاں سب اس غماں تھے لہو روویں
 دا اماماں یا اماماں یاد کر کر دل کھویں!
 آہ ہمارے درد تھے دریا کوں سب جوش آدتا
 ماتمیاں کے لہو بنداں تھے آگ سب بج جادتا
 سب دکھاں کوں انت ہے اس دکھ کے تائیں انت نہیں
 فاطمہ کے پوت بن اس جگ منیں نیں نور کیں
 فاطمہ دکھ تھے عرش کرسی تھے غم انجھوٹے
 ساتوں اسماں ہور زمیں میں آگ کی بھڑکی اٹھے
 مصطفیٰ کے باغ کے پھولاں کوں بن پانی سکائے
 مصطفیٰ ہور مرتضیٰ ہور فاطمہ کا دل دکھائے
 نل کپڑے پٹنیں ہیں پیغمبراں اس غم ستیں
 دشمنی پکڑے یزیداں مال و ہور خاتم ستیں
 جیوں نییاں میں مصطفیٰ ہیں تیوں اماماں میں حسین
 کفر کے تئیں بھان کر اسلام کیجے ہیں حسین
 دوستاں رو رو لہو غم تھے اسرہے ہم امیر
 باپ نیں ماں نیں حسین ہے کربلا بن میں اسیر
 اپنے پوتاں کوں کہے چند بند پو تم چپ رہو
 میرے بعد از پیاس میرا میرے لوگاں کوں کہو
 ظلم بے حد کیجے بابا ظالماں کن دادیو
 تم غضب کا تیغ سب یزیدیاں کے سر پر دیو دیو
 دین دنیا کے شاہ رکھ قطب زماں کو اب پناہ
 تمہیں بخشاؤ خدا کن لطف سوں میرے گناہ

(۵)

دو جگ اماں دکھ تھے سب چیو کرتے زاری واے واے
 تن روں کی لکڑیاں چا لکر کرتے ہیں خواری واے واے
 سا تو سگن آٹھو جنت سا تو دریا سا تو دھرت
 اکیس تھے ایک آپس میں اپ دکھ کرتے کاری واے واے
 کالا کیا کسوت مکا دیکھو اماں دوک تھے
 ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تھے بھاری واے واے
 لوح، ہور قلم، کرسی، عرش، قدسیاں، ملک، غلمان سب
 بجلیاں بدل اڑاوتے ہیں رات ساری واے واے
 اسمان جھج جالا ہوا سورج اگن والا ہوا
 چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ آپاری واے واے
 پنکھی ٹے ہیں سب پراں رو رو بھراے سمدراں
 چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری واے واے
 کالے ہوئے دکھ تھے منگل سر پر شیں مائی منگل
 تو پڑے اس دکھ تھے جنگل ہے بیقراری واے واے
 پھولاں سکے سب دکھ ستی کھ موندے بلبل تھکھ متی
 کونل حسینا دکھ ستی بن بن پکاری واے واے
 دیکھو تمہیں اے مانساں دانے چریں ناچکیاں
 دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بپاری واے واے
 دو جگ خراباں ہو رہے جیواں کباباں ہو رہے
 سدر سراہاں ہو رہے نا ہوئے جاری واے واے
 دکھ آگ سوں جگ بن جلے آکاس تا دھرتی ہلے
 کھن پر فرشتے کھیلے سٹ اختیاری واے واے
 حضرت نبی کے گیسواں دونو اماں کے پگاں
 جبریل جلاوے اپ ہتاں آ رات ساری واے واے

حضرت علیؑ کے دو ہتاں کاندھے نبیؐ کر اٹھائیں
 تس پر چڑھے دوشہ جواں اس دھات ساری واے واے
 شہزادے کے سب کے اوٹاں نمے پکارے اُس زماں
 عصف نبیؐ ٹکوں سناں کے دوی باری واے واے
 جبرئیلؑ آ کر کہے تسری براں جو عف کئے
 اس غنوتے جگ پائے گا سب رستگاری واے واے
 دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دکھ
 لہو میں لڑے پیاسے بھکے دیکھو یہ خواری واے واے
 یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے فخر
 کافر کئے کیسے قہریو زخم کاری واے واے
 دکھ بات کو تو جیب جٹے لکھنے قلم بی نا چلے
 دل جیوں شے جل تلے سد کی ہماری واے واے
 قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مد منج بیخ تن
 راکھے خدا منجگو جتن دشمن کو خواری واے واے
 قطبا کو ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد

تو منج مد حیدر ولد بیریاں کو زاری واے واے (۱۹)

دراصل دکنی عہد میں مرثیے 'نوحے' یا سلام کی کوئی معین ہیئت موجود نہ تھی اس لئے ان اصناف کے تعین میں مشکلات کا سامنا رہا ہے چونکہ زیادہ تر تحقیقی کام مرثیے ہی پر ہوا اس لئے محققین اور ناقدین نے سلاموں کو بھی مرثیے ہی کی صنف میں شامل کر دیا دوسرے یہ کہ اردو میں سلام نگاری کی روایت پر بنجیدگی سے تحقیق کا کام نہیں ہوا اس لئے بھی سلام اور مرثیے میں فرق واضح نہیں ہو سکا چنانچہ سلام کو بھی مرثیہ اور کبھی نوحہ قرار دے کر تحقیقی ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ چنانچہ سید علی رضوی اس حوالے سے بیان کرتے ہیں:

”.....رثائی ادب میں ہمیں جو مواد ملتا ہے اس کی چھان بین اور تحقیق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غزلوں کی عروضی ترکیب سلاموں کے علاوہ مثلث اور رباع میں بھی کثرت سے سلام موجود ہیں۔ یہ سلام عام طور پر عزا خانوں اور امام بارگاہوں میں مجلس سے قبل اور مجلس کے اختتام پر نوحہ خوانی کے کام آتے تھے..... سلام کی کوئی ہیئت مقرر نہ تھی۔ لوگ حصول ثواب

کی غرض سے رونے اور رلانے کے لئے مثلث اور محسّس، مسدّس یا غزل کے اسلوب میں کچھ شعر کہہ لیا کرتے تھے جن میں ہر شعر اور ہر بند اکائی کا درجہ رکھتا تھا۔ کسی ربط یا تسلسل کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔“ (۲۰)

صاحب بحر الفصاحت مولوی نجم الغنی کا موقف ہے:

”جو مرثیہ غزل یا قصیدے کے طور پر لکھا جائے اسے سلام کہتے ہیں۔“ (۲۱)

نجم الغنی کا یہ قول دکنی عہد کے عزائی ادب پر کہیں زیادہ صادق آتا ہے اس لئے کہ دکنی عہد کے شعرا نے جو مرثیے تخلیق کئے ان میں سے بیشتر مرثیے کے اجزائے ترکیبی سے محروم اور غزل یا قصیدے ہی کی ہیئت میں تھے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ دکنی عہد کے تمام مرثیے سلام ہیں تاہم یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ دکنی عہد کے گوکلنڈی اور بیجاپور کے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے معروف مرثیہ نگار شعر اسلام نگار بھی تھے اور ان شعرا کے سامنے مختتم کاشی اور مقبل بی کا فارسی کلام نمونے کے طور پر موجود تھا چنانچہ امداد امام اثر کا یہ کہنا کہ

”..... سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ

باندھتے ہیں۔“ (۲۲)

درست نہیں اس لئے کہ بقول علی جواد زیدی:

”..... صنف سلام کا ارتقا بتدریج ہوا اکثر جن ”واردات قلبیہ“ کا ذکر کرتے ہیں وہ ابتدائی

سلاموں میں نظر نہیں آتے۔ شروع کے سلاموں میں بس ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی ہے اور

زبان و بیان تک کی حیثیت ثانوی ہے۔ مدوح کے لئے عقیدت اور والہانہ جہت کا اظہار ہی

اصل محرک ہے۔ گوکلنڈہ کے معروف سلام نگاروں میں خواصی، قلی قطب شاہ، وجہی، لطیف، فائز،

مرزا اور نوری کا نام شامل ہیں۔ (۲۲۔ الف)

یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ میں بیجاپور کو صدر مقام قرار دے کر عادل شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی یہ حکومت ۱۶۸۷ تک

قائم رہی۔ برہان الدین جانم (۱۴۸۱) کو اولین عزائی ادب تخلیق کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کا تعلق بھی بیجاپور ہی سے تھا۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی (۱۵۸۰-۱۶۲۷) کے دور میں اردو ادب کی روایات مستحکم ہونے لگیں اور فارسی کی جگہ اردو سرکاری

زبان قرار دی گئی۔ بقول سید مبارز الدین رخصت:

”بہمنی سلطنتوں کے وال کے بعد گوکلنڈہ اور بے جاپور کی سلطنتوں نے دکنی زبان کو سرکاری

درجہ دے دیا۔“ (۲۳)

شاہی صاحب دیوان شاعر بھی تھا اس نے مرثیہ اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت

میں عزائی ادب اردو میں تخلیق کیا جانے لگا چنانچہ نوری (۲۴) جو جاتم اور وجہی کے بعد اہم مرثیہ نگار شاعر کہلاتا ہے جسے گارساں دتاسی دکن کا پہلا مرثیہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ (۱۵۸۰-۱۶۲۷) کے دربار کا شاعر تھا (۲۵)۔ محمد عادل شاہ (۱۶۲۷-۱۶۵۷) اور اس کے بعد علی ثانی (۱۶۵۷-۱۶۷۲) کے عہد حکومت میں عزاداری کے لئے مرثیے لکھے جاتے رہے۔ اس دور کا معروف مرثیہ نگار مرزا ہے۔ مرزا نے مرثیے کے ساتھ ساتھ سلام کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے مرثیے میں جدید مرثیے کے بعض اجزائے ترکیبی مثلاً گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف اور رجز کو شامل کیا۔

مرزا کو نصیر الدین ہاشمی گوکنڈہ کے قطب شاہی دور کا شاعر قرار دیتے ہیں (۲۶) جبکہ ڈاکٹر رشید موسوی کے مطابق مرزا کا تعلق بیجاپور سے تھا اور وہ علی ثانی کے دربار کا شاعر تھا۔ (۲۷)

بیجاپور کے مرثیہ نگاروں میں ہاشمی قابل ذکر شاعر ہے۔ ہاشمی نے مرثیہ کے علاوہ سلام بھی کہے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کو اردو مرثیہ اور سلام نگاری کا تشکیلی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے عزائی ادب کی تخلیق میں رونے رلانے کا عنصر غالب رہا اور سارا کلام معتقدات کا مقدس لباس پہنے ہوئے ہے۔ بقول عبدالرؤف عروج:

”دکن میں ایسے شعرا کی کثرت تھی جن کا تمام تر کلام نوحہ ماتم، سلام اور مرثیے تک محدود ہے۔“ (۲۸)

ذیل میں اس عہد کے معروف سلام نگاروں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جنہیں مرثیہ کی صف میں شامل سمجھا جاتا ہے ان میں سے ”نوری“ اور ”مرزا“ کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی کا موقف ہے۔ دکن میں درج بالا تخلص کرنے والے دو شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح نوری اور مرزا گوکنڈہ جبکہ دوسرے نوری اور مرزا کا تعلق بیجاپور سے تھا۔“ (۲۹)

چنانچہ وجہی، غواصی، لطیف، کاظم، افضل، شاہی، مرزا کا تعلق گوکنڈہ جبکہ نوری بے جاپوری، ہاشمی اور مرزا کا تعلق بے جاپور سے تھا۔

دستا نہیں کروں کیا وہ بیان کربلا کا
پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
دکھ سر ملک لئے ہیں ماتم زدہ ہوئے ہیں
رو رو دریا کئے ہیں اسان کربلا کا (غواصی)

حسین کا غم کرو عزیزاں
انجھو نین سوں جھڑو عزیزان (وجہی)

اے اہل درد اٹک سوں آنکھیاں کو تر کرو
 نکلا ہے پھر یو ماہ محرم نظر کرو
 ہے ڈر اگر تمن کو قیامت کی دھوپ کا
 سایہ کو اہل بیٹ کے سر کا چھتر کرو (لطیف)

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی ولی
 بے تاج سرداراں کی خبر لو علی ولی
 نیزوں اپہ سراں کی خبر لو علی ولی
 ظلم و ستمگراں کی خبر لو علی ولی (کاظم)

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا
 ولے سب تعصب دیا ہم منا
 شروع میں کیا نظم کل واقعات
 وہم تک کا احوال سارا لکھا
 میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا
 عجب حال عاشور خانہ میں تھا (نوری)

الوداع و الوداع شاہ شہیداں الوداع
 الوداع ابن علی دو جگ کے سلطان الوداع
 ہر محرم میں حسین کے درد کے تازے ہزار
 دل اپہ مرزا کو ہوتے ہیں یو داغاں الوداع (مرزا)

دلہند مصطفیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
 فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
 سلطان دو جہاں کا سردار اولیا کا
 مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں (بے جا پوری)

قطب شاہی اور عادل شاہی ریاستیں داخلی اختلافات کے باعث رو بہ زوال ہوئیں اور مرہٹہ سردار سرابھار نے لگے ان حالات میں اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۵۸ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۶ء میں گولکنڈہ توفیق کر کے مغل حکومت کا حصہ بنادیا اور اورنگ آباد کو صدر مقام بنایا اور یوں گولکنڈہ اور بیجاپور کے اہل علم و فن اورنگ آباد میں جمع ہونے لگے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے دکنی شعرا کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور نصیر الدین ہاشمی کے بقول:

”عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکنی شعرا کی قدر دانی کی اور نصرتی کو ملک اشعرا کے خطاب

سے شرف کیا۔“ (۳۰)

چنانچہ شعروادب بدستور ارتقائی منازل طے کرتا رہا اور ۱۶۸۷ء تا ۱۷۲۲ء تک دکن پر مغلیہ حکومت کے دور میں مرثیہ اور سلام نگاری کی آبیاری بھی ہوتی رہی۔ جن شعرا نے مرثیہ اور سلام میں طبع آزمائی کی ان میں سید شاہ حسن ذوقی، سید اشرف اشرف، ندیم، تیم احمد کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے چند کے سلاموں سے منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے:

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
سنتے ہو تم اے مومنات شہ کی شہادت کا بیاں
سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں (ذوقی)

اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیر ماتم شہ دل منے کاری
شہید کر بلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا (اشرف)

اس دور میں دکن کے معروف غزل گو دلی دکنی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا البتہ حصول ثواب کی خاطر سلام کہا ہے جو غزل ہی کی ہیئت میں ہے۔ سلام ملاحظہ کیجئے:

جب سوں گئے وہ شہاں آہ درینا درینا
غم میں ہے دونوں جہاں آہ درینا درینا
جب سوں دو نور العیاں جگ سوں ہوئے ہیں پنہاں
تب سوں یہ غم ہے عیاں آہ درینا درینا

عابد دیندار کوں واقف اسرار کوں
 درد ہے آہ و فغاں آہ درینا درین
 دین کے شہہ پاک کوں صاحب ادراک کوں
 دکھ دیئے دو مگر ہاں آہ درینا درین
 شاہ کے ماتم کا بار سب پہ ہوا بے شمار
 تو ہوا خم آساں آہ درینا درین
 دین کے گلزار میں گلشن اسرار میں
 آئی کہاں سوں خزاں آہ درینا درین
 غم میں دلی ہے مدام شاہ کا کتر غلام
 ان کیا ورد زباں آہ درینا درین (۳۱)

دلی دکنی کا ایک اور معروف سلام جو زبان زد خلق ہے:

اس نور مصطفیٰ پر بولو سلام یاراں
 محبوب مرتضیٰ پر بولو سلام یاراں
 اس پاک پارسا پر حیدر کے دل ربا پر
 اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں
 یو جی ولی فدا کر اس شاہ کربلا پر
 اس لائق ثنا پر بولو سلام یاراں (۳۲)

۱۷۲۳ء تک قلی قطب شاہی، عادل شاہی اور مغل دور حکومت میں دکن میں لکھے جانے والے سلاموں کی اہمیت اور

خصوصیات کے بارے میں سید وحید الحسن ہاشمی کہتے ہیں:

”زبان و بیان کے اعتبار سے دکنی سلاموں میں ایک تو قدیم اردو کے نمونے مل جاتے ہیں
 دوسرے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے شعراء حقیقت اور اصلیت سے سرمو انحراف کرنا درست
 نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے سلاموں سے ان کے دلوں کی سچائی، قلب کا سوز اور عقیدت کی تپش
 صاف نمایاں ہوتی ہے۔“ (۳۳)

تاہم عزائی ادب کی یہ ترقی دکن کے فرمانرواں کی ادب دوستی اور اپنے عقائد سے والہانہ محبت کا نتیجہ تھی۔ اسی لئے قطب شاہی دور کے حکمرانوں کی ادب نوازی اور شعر دوستی کے حوالے سے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ

”محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۱۱) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵) عبداللہ قطب شاہ

(۱۶۲۵-۱۶۷۲) ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۲)..... یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں

کے بڑے مربی اور قدردان تھے۔ (۳۳)

اورنگ زیب عالمگیر دکن پر قبضے کے باوجود شورشوں پر قابو پانے میں ناکام رہا اس کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد مغل دربار سازشوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ تخت نشینی کے لئے کوئی واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے شہزادے باہم برسر پیکار رہے۔ اس لئے مغل حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دکن کے نواب قمر الدین نظام الملک نے جو دکن میں مغل حکومت کا وزیر کبیر تھا خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۱۷۲۳ء میں اورنگ آباد کو صدر مقام قرار دے کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی (۳۵) اور دکن کا اولین نظام قرار پایا (۳۶)۔

ابتداء میں سرکاری طور پر فارسی کی سرپرستی کی گئی اس لئے اردو کی جانب زیادہ توجہ نہ دی جا سکی تاہم نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۷۶۲ء-۱۸۰۳ء) کے دور میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو بھی ذریعہ اظہار کے لئے استعمال ہونے لگی۔ اس دور میں ارسطو جاہ جو ایرانی النسل تھے وہ دیوان مقرر ہوئے تو قطب شاہی دور کی عزاداری اور محرم کی رسومات پھر سے ادا کی جانے لگیں اور مجالس کے لئے مرثیے اور سلام بھی کہے جانے لگے۔ اس دور کے اہم شعرا میں درگاہ قلی خاں درگاہ کاظم علی خاں کاظم رضی الدین رضی آماہی ہاشم علی نے مرثیے اور سلام لکھے۔ عزاداری کی روایات دیگر علاقوں مثلاً میسور تک بھی اثر انداز ہوئیں اور مرزا زین العابدین عابد جو پہلے گولکنڈہ اور بیجاپور میں مقیم تھے اب میسور میں سرکاری ملازمت اختیار کر چکے تھے انہوں نے بھی مرثیہ اور سلام میں طبع آزمائی کی (۳۷) ان سلام نگاروں کے سلاموں سے منتخب چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

غم سوں ہے بے قرار میرا دل
دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضی (رضی)

کیوں نہ ہو پر غبار میرا دل
آج غم ناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں چمن کے گل
جب سنی شر کی بات مجلس میں
جل بجھے شمع انجمن کے گل (رومی)

فریاد کر کے شاہ شہیداں کہے خدا
چھوٹے بڑے شہید ہوئے کوئی نہیں رہا
جینا ہے تلخ ہائے نہیں زندگی روا
ہیگا وداع اہل حرم سخت اب بلا (درگاہ)

محشر میں جب محمد شاہ زمن انھیں گے
سب انبیاء و مرسل پر غم حزن انھیں گے
حیدر علی لہو سوں آلودہ تن انھیں گے
لیتے لہو کے ہلکاں ہے ہے حسن انھیں گے (امامی)

سن سوز کربلا کا ٹکڑے ہوا جگر سب
ہر اک سینے میں یاداں گویا کہ دن کھلے ہیں (عابد)

انیس اور دبستان انیس ودبیر کے اثرات دکن کے عزائی ادب پر بھی پڑنے لگے چنانچہ آصف جاہی دور حکومت میں
انیسویں صدی کے وسط میں دکن محرم کی مخصوص مذہبی رسومات، عزاداری اور عزائی ادب کی تخلیق کے حوالے سے امتیازی
خصوصیات کا حامل رہا۔ ناصر الدولہ کا عہد حکومت (۱۸۵۷ء) تک قائم رہا اس عہد میں شعراء عزائی ادب کی تخلیق میں مصروف
رہے۔ تاہم شمالی ہند سے بھی شعرا کا دکن میں آمد کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ ارسطو جاہ کے دور میں سکندر، جعفری اور بیان وغیرہ دکن
میں آئے۔ (۳۸) مختار الملک سرسالا جنگ کے زمانے میں پہلی مرتبہ مرثیہ گو میر محمد ذکی بلگرامی (شاگرد دبیر) حیدر آباد آئے۔
لکھنؤ میں انیس ودبیر کو مرثیہ اور سلام گوئی میں مستند درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس لئے حیدر آباد (دکن) میں محرم کی مجالس
میں انیس ودبیر کے مرثیے پڑھوائے جاتے۔ ۱۸۷۱ء میں حیدر آباد کے نواب سالار جنگ محمد تراب علی خان بہادر کی جانب سے
میر انیس کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی گئی ازاں بعد تیور جنگ نے بھی میر انیس کو دکن آنے کی دعوت دی۔ تیور جنگ کی دعوت
پر انیس گھوڑا گاڑی کے ذریعہ حیدر آباد آئے۔ (۳۹)

انیس اور معاصرین انیس کی مرثیہ اور سلام گوئی کے اثرات یقیناً دکن کی عزائی شاعری پر مرتب ہوئے اور حیدر آباد میں
موجود شعراء کے مرثیوں اور سلاموں میں یہ اثرات نظر آنے لگے۔ چنانچہ سید اصغر ناجی (۱۸۳۹-۱۸۸۶) نے مرثیوں کے علاوہ
سلام میں بھی طبع آزمائی کی۔ ڈاکٹر رشید موسوی کے درج ذیل بیان سے ان کی سلام گوئی کی تصدیق ہوتی ہے:

”وہ زیادہ تر سلام‘ نوے اور قصیدے لکھتے تھے لیکن انہوں نے کچھ مرثیے بھی لکھے تھے جو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کے نوحوں اور سلاموں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ (۴۰) ناجی کا ایک معروف سلام ملاحظہ کیجئے:

سلام..... اصغر حسین ناجی

اللہ ثنا خوان حسین ابن علی ہے قرآن میں خودشان حسین ابن علی ہے
 رضوان گلستان جنان کہتے ہیں جس کو اک روح جنان حسین ابن علی ہے
 جبریل وہ ہے خادم دیرینہ شہر میkal وہ دربان حسین ابن علی ہے
 اصغر کے میں قرباں علی اصغر کے تصدق وہ گل ہے یہ ایمان حسین ابن علی ہے
 محشر میں نہ دیکھے گا کوئی مہر مہیں کو کیا سایہ دامان حسین ابن علی ہے
 خلاق دو عالم کے مہابات کے قابل ہر کار نمایان حسین ابن علی ہے
 گر عرش و فلک گلشن جنت ہر گوہر دندان حسین ابن علی ہے
 دیتا ہے اسے اجر خدا طوف حرم کا سو جاں سے جو قربان حسین ابن علی ہے
 طالب وہ نبی کا ہے وہ طالب ہے خدا کا دنیا میں جو خواہان حسین ابن علی ہے
 اللہ نے شاہوں کا کیا ہے انہیں سرتاج کیا قدر غلامان حسین ابن علی ہے
 دنیا ہے بخیر اس کی بخیر اس کی ہے عقبا جو تابع ہے فرمان حسین ابن علی ہے
 ناجی ہے گلستان جنان تیرا نشین

تو بلبل مستان حسین ابن علی ہے (۴۱)

نصیر الدین ہاشمی نے بھی ناجی کے سلام نگار ہونے کی تصدیق کی ہے:

”سید اصغر حسین المستخلص بہ ناجی ۱۲۵۶ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ تفضل حسین عطا سے تلمذ تھا۔ تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ تھا۔ مرثیہ اور سلام وغیرہ کہا کرتے تھے۔“ (۴۲)

ناجی کے ایک شاگرد دلاور علی دانش (۱۸۲۶ء پ) مرثیہ کے علاوہ سلام بھی کہتے تھے۔

میسور میں میر رضا علی رضا (۱۸۸۷ء وفات) نے مرثیوں کے علاوہ سلام و نوے بھی لکھے تھے لیکن سارا کلام تلف ہو

گیا۔ (۴۳)

مرزا غلام مہدی مہدی میسور کے معروف مرثیہ نگار تھے جو مرزا زین العابدین عابد کے فرزند تھے وہ ۱۸۲۶ء میں پیدا

ہوئے۔ کئی مرثیے، سلام اور نوے ان کی یادگار ہیں (۴۴) یہ مرثیے اور سلام غیر مطبوعہ اور کیا اب ہیں۔
میر مظہر حسین مظہر مہدی کے ہم عصر مرثیہ گو تھے انہوں نے نوحہ اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی۔ وہ غمگین تخلص بھی کرتے تھے۔

”ان کے نوے اور سلام میسور کی بعض محفلوں میں آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔“ (۴۵)
انہیں کے بعد فرزند انیس میر خورشید علی نقی دبیر کے فرزند مرزا جعفر حسین اوج، میر انیس کے نواسے رشید اور میر نفیس کے نواسے عارف کے علاوہ نواب مولس، مہر علی انس، سید مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید، خورشید حسن، دولہا صاحب، عروج کی شہرت لکھنؤ سے نکل کر دکن پہنچ چکی تھی۔ میر انیس کی دکن میں آمد اور مرثیہ خوانی کی بدولت دکنی مرثیے میں گریہ کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی آبیاری کا سامان بھی بہم پہنچنے لگا۔ ان مہمان شعرا کی آمد سے دکنی عزائی ادب پر مثبت اثرات مرتب ہوئے اور یہاں کے شعرا کے مرثیوں اور سلاموں میں ادبی رنگ جھلکنے لگا چنانچہ میر عابد علی عابد (۱۸۵۷ء) سرفراز علی خاں سرفراز اور میر مہدی علی خان مہدی (۱۸۶۰ء) کے مرثیوں اور سلاموں میں جدت کا احساس نمایاں ہے۔ میر مہدی علی خاں مہدی حیدر آباد کے نامور مرثیہ نگار اور سلام نگار تھے۔ بقول ڈاکٹر رشید موسوی:

”مرثیوں کے علاوہ سلام، رباعی، قصائد، قطعات، نوے، مخمس اور ترجیع بند بھی موجود ہیں۔“ (۴۶)

شائق حسین سفیر بھی سلام کہتے تھے بقول ڈاکٹر رشید موسوی:

”سفیر کا ایک مطبوعہ دیوان موجود ہے جس میں مرثیوں کے علاوہ نعت، قصیدے اور سلام شامل ہیں۔“ (۴۷)

میر مہدی حسین خاں آلم (۱۸۶۷ء) نے پانچ مرثیے اور سلام بھی کہے (۴۸) مرزا علی جعفر (۱۸۸۳ء) نے ۴۴ سال عمر پائی۔ انہوں نے بہت سے مرثیے، نوے اور سلام لکھے ان کی وصیت کے مطابق ان کے مرثیے وغیرہ کے مسودات ان کے ساتھ قبر میں دفن کر دیئے گئے۔ نصیر الدین ہاشمی جعفر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”۱۳۰۰ھ میں تولد ہوئے..... بچپن سے شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ نوحہ، سلام، قصائد، رباعی

اور مرثیاتی موزوں کرتے تھے..... ناجی کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار تھا۔“ (۴۹)

جعفر کے سلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

آواز دے نہ جبر کا رنج و ملال کھینچ	نزدیک اپنے اے اسد حسن کے لال کھینچ
معمور ہو چکا ہے جہاں ظلم و جور سے	اب ذوالفقار کو مرے مولا نکال کھینچ
جعفر خدا سے مانگ نہ کر غیر سے طلب	درگاہ بے نیاز میں دست سوال کھینچ

دہلی سے سید عابد حسین عابد جعفری (۱۸۸۶ پ) حیدر آباد میں آ کر آباد ہو گئے۔ شاعری میں اوج کے شاگرد تھے انہوں نے مرثیہ کے علاوہ سلام، قصیدے اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ (۵۰)
مدرسہ میں خواجہ محمد صادق شریف (۱۸۶۰ پ) نے مرثیوں اور نوحوں کے علاوہ کثیر تعداد میں سلام بھی کہے۔ بقول ڈاکٹر رشید موسوی:

”..... ”باب السلام“ کے نام سے ان کے سلاموں کے تین مجموعے ملے ہیں اس میں سے ایک مجموعہ ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوا جس میں سلام اور نوے شامل ہیں۔ دوسرے مجموعے کا سنہ طباعت ۱۳۰۹ھ اس مجموعے میں دو قصیدے سلام اور رباعیاں ہیں۔ تیسرا مجموعہ ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوا اس میں سلاموں کے علاوہ نوے اور زاریاں شریک ہیں۔“ (۵۱)

نواب میر محبوب علی خاں غفرانی مکاں آصف جاہ سادس اور ان کے جانشین سلطان العلوم میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع نے بھی سلام نگاری میں طبع آزمائی کی۔ نواب میر محبوب علی خاں داغ کے شاگرد تھے۔ (۵۲) میر عثمان خان نے بھی دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ اردو سلام بھی کہے ہیں۔ ذیل میں پہلے نواب میر محبوب علی خاں بختلص آصف اور پھر ان کے جانشین میر عثمان علی خاں کے ایک ایک سلام نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے

سوئے قتل جو شہ تشنہ جگر آتے ہیں لشکر جن و ملک پینٹے سر آتے ہیں
شاید اب ماتم سرور کا زمانہ ہے قریب جگر و دل مرے بے تاب نظر آتے ہیں
ہائے کیا نام ہے شبیر کا اے صلی علی درد مندوں کے دل اس نام سے بھر آتے ہیں
خون دل نے مرے اشکوں کی بدل دی صورت پہلے کچھ اور تھے اب اور نظر آتے ہیں
شرکت محفل ماتم کوئی آسان نہیں لوگ تھامے ہوئے ہاتھوں سے جگر آتے ہیں
دل میں ہو داغ محبت تو ملے دل کی مراد پھول کے بعد درختوں میں ثمر آتے ہیں
کیا تصور میں ہے قوت کہ جگر بند رسولؐ بن کے تصویر مرے دل میں اتر آتے ہیں
کیا تماشہ ہے ترستی ہے نظر جن کیلئے
جلوہ افروز وہی دل میں نظر آتے ہیں (۵۳)

سلام میر عثمان علی خان

یہ کرنا عرض اے باد صبا سبطِ پیہر سے کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدہ تر سے
کہوا شک و فغاں سے ذکر ہوتا ہے شہیدوں کا گر جتنا ہو جسے گر جے برسنا ہو جسے بر سے

خدا کی شان یک قطرہ نہ پہنچا حلق تک شہ کے مگر ہے تیغ کا پانی کہ اونچا ہو گیا سر سے
 جودل کے سخت ہیں وہ بھی غم سرور میں گریاں ہیں عجب تاثیر ہے پانی نکل آتا ہے پتھر سے
 سے حب علی میں رات دن ہم مست رہتے ہیں نہ خم سے ہے غرض ہم کو نہ شیشے سے نہ ساغر سے
 قیامت ہو گی برپا اور میدان قیامت میں انہیں گے ہم جو آنسو پونچھتے دامان محشر سے
 وہ ہیں اشک عزّا اپنے بدولت جن کی اے عثمان

چکھایا ساقی کوثر نے ہم کو جام کوثر سے (۵۴)

میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کی یاد میں اگست ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ دکن قائم کی۔ اس جامعہ کی تخصیص یہ تھی کہ
 یہاں تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم اردو قرار پایا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدر آباد دکن کی علمی و ادبی فضا پر مثبت اثرات مرتب
 ہوئے۔

انیسویں صدی کے آخری دور کے سلام نگار شعرا میں میر محمد علی مسرور (۱۸۷۷ء) بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید موسوی
 کے مطابق:

”اپنی شعر گوئی کی ابتدا انہوں نے ”سلام“ سے کی۔ کچھ دن بعد غزلیں کہنے لگے لیکن طبیعت کا

روحان زیادہ تر قصیدہ، نوحہ، سلام اور مرثیہ نگاری کی طرف رہا۔“ (۵۵)

نصیر الدین ہاشمی نے بھی مسرور کی سلام نگاری کی تصدیق کی ہے اور سلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”مرثیہ، سلام، نوحہ کے علاوہ رباعیات اور قصیدہ کی کافی مشق تھی۔“ (۵۶)

حضرت عباسؑ پر سلام کے چند اشعار دیکھئے جس میں مدح کا رنگ غالب ہے۔

کی زیادتی ہوتی ہے باپ بیٹے میں نظر میں اصل ہی آتی ہے دیکھ کر تصویر

کہاں علیؑ کی ساری اولاد اور کہاں عباسؑ ضرور چاند وہ سب ہیں مگر یہ ماہ منیر

دکھایا حضرت عباسؑ نے جمال پدر علیؑ نے پائی ہے آج اپنی تیسری تصویر (۵۷)

دکن حیدر آباد کے درج ذیل شعرا نے بھی سلام کی صنف میں طبع آزمائی کی:

”سید کاظم حسین واثق (۱۸۹۸ء) واثق مرزا علی جعفر سے مشورہ کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی

توجہ زیادہ تر سلام کی طرف رہی۔“ (۵۸)

سید علی جعفر نصرت: (۱۸۹۹ء)

”ابتدا میں کچھ عرصہ تک غزل کی مشق جاری رہی اس کے بعد وہ سلام، نوحہ، قصائد اور مرثیہ

نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔“ (۵۹)

کاظم علی خاں کاظم: (۱۹۰۴ء)

وہ غیور اور طباطبائی سے غزلوں اور سلاموں پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ مرثیہ پر کسی سے اصلاح

نہیں لی۔ (۶۰)

میر سعادت علی رضوی صادق: (۱۹۰۸ء)

”ابتدا میں حصول ثواب کی خاطر سلام لکھتے رہے لیکن بعد میں مرثیے بھی کہے۔۔۔۔۔ صادق نے

مرثیوں کے علاوہ بے شمار سلام اور نوے بھی کہے۔“ (۶۱)

میر عابد علی سعید شہیدی:

”سعد کے بے شمار نوے اور سلام ہیں۔۔۔۔۔ ان کے سلاموں اور نوحوں کی خصوصیت یہ ہے کہ درد

وغم میں ڈوبے ہوتے ہیں۔“ (۶۲)

نواب مہدی علی شہید یار جنگ شہید (۱۸۸۴ء): شہید نے صرف ایک مرثیہ کہا۔ وہ شروع میں نوحہ اور سلام کہتے

رہے۔ (۶۳) اولاً نوحہ اور سلام موزوں کرتے اور پیارے صاحب رشید لکھنؤ سے اصلاح لیتے رہے (۶۴) شہید کا ایک سلام

نمونہ کلام کے طور پر پیش خدمت ہے:

سلام شہید یار جنگ

در شہر پر بحر لحد دو گز زمیں مانگی	رسالت تو نہیں چاہی خدائی تو نہیں مانگی
رہ سرور میں جو چلتے رہیں ایسے قدم چاہے	ترے بعدے میں جو جھکتی رہے ایسی جبین مانگی
وہب سے ساتھ لے جانے کا جنت میں لیا وعدہ	نشانی کے لئے زوجہ نے بس اک آستین مانگی
کیا پانی طلب سرور نے یہ باور نہیں آتا	امان مانگی کبھی شہر نے ہرگز نہیں مانگی
مرے نانا کی اُمت کو الہی بخش دینا تو	دعا شہر نے یہ ایک وقت واپس مانگی
تبرک گھر کا جو لوٹا گیا تھا وہ تو مانگا تھا	کوئی شے اور نہ نبت نے ستم گر سے نہیں مانگی
خبر ہے ایک بچی ہے کہ جھوٹی ہے خدا جانے	لحد کو پائنتی بھائی کے خواہر نے زمیں مانگی
دم آخر لب شہر ملتے تھے تو کیا مطلب	دعا مانگی خدا سے شاہ نے اور بالقیں مانگی
دیا شہر نے اور تھی طلب متغیر حق سے	وہ کیا شے تھی جو راہب نے کہیں پانی کہیں مانگی
اگر میں آساں بھی مانگتا تو لے کے کیا کرتا	زمیں مانگی لحد کو اور سرور کے قریں مانگی
کہا عباس سے سرور نے اب کوئی نہیں میرا	اجازت تم نے بھی مرنے کی مجھ سے نہ جیں مانگی

یہ جھلا کر کہا نہ بٹ نے اپنے دونوں بچوں سے علم مانگا گیا مرنے کی رخصت کیوں نہیں مانگی
کفن کے واسطے زہرا کی چادر مانگتا کیونکر غم شبیر کے اشکوں کی خاطر آستیں مانگی
چلا ہوں کر بلا کو پھر شہید اللہ کی رحمت
یہ وہ جنت ہے خالق سے یہیں پائی یہیں مانگی (۶۵)
میر محمد باقر امانت خانی باقر: (۱۹۰۷ء)

”باقر امانت خانی کوئی چالیس برس سے شعر کہہ رہے ہیں اب تک کوئی ۳۵۰ سلام ۷۵۰ انوئے
۷۵۰ قصیدے ۲۲۰ مسدس ۱۷۰ ارباعیات ۲۲۲ قطعات ۱۰۹ تاریخی قطعات ۷۵ غزلوں کے
علاوہ ۱۵ مرثیے لکھے چکے ہیں۔“ (۶۶)

باقر کے سلاموں کا ایک مجموعہ ”تصویر بعد رسالت“ کے عنوان سے ۱۳۷۵ھ میں شائع ہوا جس میں ان کا نام باقر
رضوی امانت خانی درج ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ایک طویل سلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:
بن گئے جب بلبل باغ ثنائے مرتضیٰ
شاخ سدہ پر ہمارے آشیاں بنتے گئے
ذبح جس دم ہو چکے عاشور کو رن میں حسین
خواب ابراہیم کے اک داستان بنتے گئے
حضرت عباس جب دریا سے پلٹے تشنہ لب
نقش پا ان کے وفا کے آستان بنتے گئے
بے زبان اصغر نہ کر سکتا تھا اظہار عطش
رفتہ رفتہ ضعف کے تیور زباں بنتے گئے
جتنی بیتیں تو نے باقر مدح و ثناء میں نظم کیں
اتنے ہی فردوس میں تیرے مکاں بنتے گئے (۶۷)

اب آخر میں ایک ایسے سلام نگار شاعر کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس کا تعلق اکبر آباد سے تھا تاہم انہوں نے شاعر دربار کے
طور پر نواب شجاع کے دربار میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس لئے اکثر مورخین انہیں شعرائے حیدر آباد میں شمار کرتے ہیں۔ (۶۸)
نجم آفندی (۱۸۹۳ء-۱۹۷۵ء) ۱۹۳۰ء میں حیدر آباد آئے اور کم و بیش چالیس سال تک یہیں قیام کیا۔ انہوں نے
صرف دو مرثیے معراج فکر اور فتح مبین کہے لیکن کثیر تعداد میں سلام کہے ان کے سلاموں کا مجموعہ ”نجم آفندی کے سلام“ سے شائع
ہو چکا ہے۔ ان سلاموں میں بیسویں صدی کے آغاز کے مسائل کی بوجاس اور اصلاحی انداز نمایاں ہے۔ بقول سید نواز حسن زیدی:

”ان کی سلام نگاری کا ایک مقصد قوم میں وہ جذبہ عمل پیدا کرنا بھی تھا جس سے کام لے کر وہ

اس قعرِ ملت سے باہر آسکیں۔“ (۶۹)

ذیل میں نجم آفندی کے سلاموں کے مجموعہ کلام سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

بہت پیام ملیں گے مرے سلام میں نجم نگاہ غور سے اگر نقاد نے دیکھا

ہم گود کے بچوں کو بے کر دیتے ہیں شامل جب تکملہ قوت لشکر نہیں ہوتا

جان دے کر ذہن انسانی کو روشن کر دیا اے شہید ابن شہید۔ اے کریم ابن کریم

دامن فکر سخن کو درد کی دولت ملی شاعری میں جان آئی اسوۂ سجاد سے

علیؑ نے یہ بتایا دوش احمدؑ پر رکھ کر قدم کہ سرتابی نہ کی ہم نے کبھی حکم پیمبرؐ سے کبھی (۷۰)

محمد حبیب اللہ المتخلص بہ وفا: (۱۸۸۱ء) اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے رہے۔ انہوں نے مرثیہ، قصیدہ،

مثنوی کے علاوہ سلام نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ نصیر الدین ہاشمی نے وفا کے سلام کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

کیا داغ دل کے سینہ روشن کے پھول ہیں

فحل غم حسین کے گلشن کے پھول ہیں

رنگ بہار خون شہیداں ہے گل فشاں

مجرع سرستاں یہ ہے آہن میں پھول ہیں

دل بوئے عشق ساقی کوثر سے مت ہے

اس سے کے قطرے ساغر روشن کے پھول ہیں (۷۱)

نجم آفندی کی سلام نگاری کے تذکرے کے ساتھ ہی دکن میں قلی قطب شاہ (۱۵۶۹-۱۶۱۱ء) کی سلام نگاری سے شروع

ہونے والا طویل دور مکمل ہو جاتا ہے اور انیس و دہریہ کی سلام نگاری کے اثرات اور معاصر حالات و واقعات کے تقاضوں سے

اردو سلم نے بھی دیگر اصناف سخن کی طرح معاشرتی اور اخلاقی مسائل کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ ادبی اعتبار سے سلام ایک

منفرد اور معتبر صنف سخن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ دکن کے عزائی ادب تخلیق کرنے والے شعرا مرثیے

کے بجائے اب سلام نگاری کی جانب زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ نجم آفندی ہی کو دیکھئے جنہوں نے صرف دو مرثیے فتح مبین اور

معراج فکر کہے جبکہ ان کے سلام کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اردو سلام نگاری کا دکنی دور اس صنف

کے بہتر امکانات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اب سلام محض رونے رلانے کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ سلام اخلاق و کردار کے اصلاح کا

معتبر اور موثر ذریعہ بن چکے ہیں۔ فنی اعتبار سے سلام میں غزل سے انحراف کی کیفیت باقی نہیں رہی۔

اُردو سلام۔ شمالی ہند میں

اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد دکن کی خود مختار ریاستیں عظیم مغل حکومت کا حصہ بن گئیں۔ اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو صدر مقام بنایا تو گولکنڈہ بیجاپور اور احمد آباد کے اہل علم و فن یہاں جمع ہو گئے اور شعر و سخن کی تخلیق جاری رہی چنانچہ محرم کی رسومات اور عزا داری کے لئے مرثیہ نوحہ اور سلام تخلیق کئے جاتے رہے۔ مغلوں نے قطب شاہی محرم کے رسم و رواج کو پورے طور پر ختم نہیں کیا البتہ ان میں بعض چیزیں باقی نہ رہ سکیں (۷۲) تاہم مغلوں کے دکن پر قبضے (۱۶۸۷) کے بعد بھی سید حسن شاہ ذوقی، سید اشرف اشرف، سید شاہ ندیم اللہ حسینی ندیم اور تیم احمد عزائی ادب مشمول سلام تخلیق کرتے رہے۔ عوام محرم کی بعض رسومات ادا کرتے اور مجلسیں منعقد ہوتیں جن میں مرثیے اور سلام پڑھے جاتے۔

جو مغل سپاہی دکن میں موجود تھے وہ محرم کی ان رسومات میں شریک ہوتے۔ مقامی امام بارگاہوں میں منعقد ہونے والی مجالس جن میں مرثیے اور سلام پیش کئے جاتے ان میں بھی یہ سپاہی دلچسپی لیتے۔ اس دور میں افضل اور اشرف کا کلام زبان زد عام تھا۔ ولی دکنی کے دیوان کے دہلی پہنچنے کے بعد دلی کے شعراء اردو زبان میں شاعری کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے اس لئے جب دکن کے سپاہی دہلی پہنچے تو ان کی زبان سے دکنی مرثیے اور سلام سن کر یہاں کے شعرا بھی عزائی ادب کی تخلیق پر آمادہ نظر آنے لگے۔ اگرچہ اردو میں شاعری کرنے والے شعرا کو ابتدا میں تمسخر کا نشانہ بننا پڑا لیکن اس منفی رویہ کی کوکھ سے مثبت انداز فکر نے بھی جنم لیا اور خان آرزو جیسے فارسی پسند شاعر بھی اردو شاعر کے متاثر ہونے والے شعرا نے ایہام گوئی کی بنیاد رکھی اور ایہام گوئی ایک مقبول تحریک بن کر ملک کے طول و عرض کو متاثر کرنے لگی تاہم بقول انور سدید کے ایہام نے بہت جلد ایک ادبی تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اس تحریک ہی سے تازہ گوئی کی صبح صادق طلوع ہوئی۔ (۷۳)

گویا مغل حکومت کے دکن پر قبضے کے بعد اردو زبان و ادب دہلی میں بھی مقبول ہونے لگا۔ تاہم اورنگ زیب کے دور کے بعد محمد شاہ کے دور حکومت میں جب ہر طرف محافل و مجالس منعقد ہونے لگیں اور عقائد پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں تو محرم کی رسومات اور عزا داری گھر گھر ہونے لگی چنانچہ اردو سلام نگاری کی روایت جو دکن سے دہلی منتقل ہوئی وہ محمد شاہ کے دور حکومت (۱۷۱۹-۱۷۵۸) میں پھولی پھلی اور اس عہد میں عید میلاد النبیؐ اور محرم کی عزا دیوں میں سلام پڑھے جانے لگے چنانچہ علی جواد زیدی کی تحقیق کے مطابق دہلی میں اردو سلام نگاری کا آغاز محمد شاہ ہی کے عہد میں ہوا:

”اردو کے قدیم ترین سلام جو شمالی ہند میں میری نظر سے گزرے ہیں وہ محمد شاہ رگھلا کے عہد

حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصد سرکاری رسالت میں نذرانہ خلوص و احترام پیش کرنا ہے یا

پھر امام سے اظہار عقیدت اور سوغواروں سے اظہار تعزیت ہے۔ اول الذکر سلام جشن عید

میلاد النبیؐ کے سلسلے میں پڑھے جاتے تھے اور موخر الذکر ایام عزائم میں۔ ہدف اور طریق کار

دونوں کا ایک ہی تھا۔ (۷۴)

اس دور میں مصطفیٰ خاں یک رنگ جو معروف ایہام گو شاعر تھے اور شریف الدین مغمون (۱۷۳۴ء) کے ہم عصر تھے انہوں نے اردو سلام نگاری کو رواج دی۔ یک رنگ کے سلام اس حوالے سے اہم ہیں کہ ان میں ادبی چاشنی بھی موجود ہے چند اشعار یک رنگ کے دیکھیے:

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمان کربلا
اندھیر ہے جہاں کہ اب شامیوں کے ہاتھ ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا (۷۵)
دلی میں وتی کے سلاموں کی دھوم تھی چنانچہ مرثیہ نگاروں کے علاوہ غزل گو شعرا بھی حصول ثواب کی خاطر سلام کہہ لیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ دکن میں وتی کے ہاتھوں اس روایت کی بنا پڑ چکی تھی۔ ایسے ہی ایک شاعر جو مرثیہ گو نہیں تھے لیکن ان کے دیوان میں سلام موجود ہیں وہ شاکر ناجی (۱۷۴۷ء) ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے مطابق شاعر ناجی محمد شاہ کے ایک وزیر عمدۃ الملک امیر خاں کے ہاں ملازم تھے (۷۶ء) ناجی نے اپنے سلاموں میں سلام کی جگہ ”فاتحہ“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو سلام ہی کے مترادف ہے۔ دراصل درود و سلام اور فاتحہ کا تعلق معتقدات سے ہے اس لئے محافل میلاد اور مجالس عزائم میں فاتحہ اور سلام دونوں ہی مستعمل ہیں شاید اسی لئے شاکر ناجی نے ”سلام“ کو ”فاتحہ“ سے بدل دیا ہے ان کے نزدیک فاتحہ پڑھنا اور سلام بھیجنا ہم معنی ہیں۔ ناجی کے درج اشعار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ولی دکنی کی سلام نگاری سے حد درجہ متاثر ہیں:

ولی کا ”سلام“

اس نور مصطفیٰ پر بولو سلام یاراں
محبوب مرتضیٰ پر بولو سلام یاراں
اس پاک پارسا پر حیدر کے دل ربا پر
اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں
یو جی ولی فدا کر اس شاہ کربلا پر
اس لائق ثنا پر بولو سلام یاراں (۷۷)

شاکر ناجی کا ”سلام“

دل بند مصطفیٰ کے اُپر فاتحہ پڑھو
فرزند مرتضیٰ کے اُپر فاتحہ پڑھو
سالار اصفیا کے اُپر فاتحہ پڑھو
سرتاج اولیا کے اُپر فاتحہ پڑھو (۷۸)

دہلی کے مسکین نے مرغی کے ساتھ سلام بھی کہے۔ علی جواد زیدی نے مسکین کے ”سلام“ کے چند نمونے مہیا کئے ہیں:

اگر سلام کہوں میں تمام قدرت کا ادائے حق نہیں شاہا تیری طبیعت کا
سلام لفظ مرکب ہے چار حرف سیتیں میں اس میں کیا کہوں کچھ حق تری حقیقت کا
یا شاہ جتے تن ہیں تمہیں کرتے ہیں سلام کیا روح کیا بدن ہیں تمہیں کرتے سلام (۷۹)
عبدالرؤف عروج نے شاہ میر مسکن کا درج ذیل سلام تلاش کیا ہے:

اے مدینہ کے ستارے السلام کربلا کے سر اتارے السلام
صبح فطرت کے جمال آفتاب شام غربت کے ادارے السلام
نور احمد نیر برج اسد ماہ دیں کے تم ہو تارے السلام
منزل تسلیم کے نازل ہوئے اور رضا میں اپنے مارے السلام
خنجر خونخوار کے مہماں غریب حلق پیاسے بن ادھارے السلام
تجھ گلے اوپر چھری جس دم چلی شیر حق نے نعرے مارے السلام
میں ہوں مسکین تم ہو شاہ دو جہاں دین و دنیا کے سہارے السلام (۸۰)
محمد شاہ رنگیلا کے دور میں ایسے شعرا بھی موجود تھے جو مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ سلام بھی کہتے تھے۔ ان میں خادم
دہلوی اور جانفشاں دہلوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ خادم کے سلام کے کلام کا نمونہ دیکھئے:

(۱)

اے راضی حکم رضا السلام اے مقتول تیغ جفا السلام
امام ذکیٰ بے ل سرخ پوش شہنشاہ گلگوں قبا السلام
کرو اپنے خادم کی خدمت قبول یہ کہتا ہے نت سر نو السلام (۸۱)
(۲)

مومناں دل میں کہو دین کے سلطان پر سلام بے ل تیغ ستم شاہ شہیداں پہ سلام
اولاً بھیج کے خادم تو پیہر پر درود کہو حسین بن علی شاہ شہیداں پہ سلام
علی جواد زیدی نے جانفشاں کے سلام کا بھی ایک شعر پیش کیا ہے:

اے شہنشاہ دو عالم السلام ہے شہید تیغ ظالم السلام (۸۲)
سلام نگاری کی جانب شعرائے دہلی کی توجہ کا آغاز دراصل اس ”عاشور نامہ“ کے بعد کی بات ہے جسے روشن علی
(م ۱۶۸۸) نے لکھا اور سعید حسین خاں نے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ شمالی ہند میں عزائی ادب کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ مسعود

حسین خاں لکھتے ہیں:

”شمالی ہند میں قدیم ترین مربوط اردو نظم کا نمونہ ہے جو تاحال دریافت ہو سکا ہے۔ محمد افضل
افضل کی تصنیف بکٹ کہانی (بارہ نامہ) ہے جو سترہویں صدی عیسوی کے اوائل کا ادبی نقش
ہے۔ بکٹ کہانی کے بعد دوسری طویل نظم روشن علی کی تصنیف ”عاشور نامہ“ ہے جو ماہ صفر
۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۸ء میں سپرد قلم کی گئی۔ مراٹھی ریختہ بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں جن
کا مآخذ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء کی لکھی ہوئی ایک بیاض ہے..... عاشور نامہ یقیناً شمالی ہند کی
قدیم ترین ذخیرہ ادب کی ایک اہم دستاویز ہے۔“ (۸۳)

روشن علی کے عاشور نامہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے قبل شمالی ہند میں عزائی ادب
کی تخلیق کا آغاز ہو چکا تھا اور محمد شاہی دور میں یہ ادب تیزی سے مقبول ہونے لگا۔ اسی دور میں ”کرمل کتھا“ کے مولف اور مترجم
فضل علی فضل نے بھی سلام کہے۔ فضل کا اختصار یہ ہے کہ انہوں نے ”رہ مجلس“ المعروف بہ کرمل کتھا (مثنوی) کو نثر کے قالب
میں ڈھالا ہے۔ (۸۴)

فضل اور ان کے بھائی کرم علی دونوں ہی سلام نگار تھے۔ فضل کی سلام کا ایک شعر نمونہ کے طور پر دیکھئے:

کیا ہے صرف جو عمر اپنی تجھ محبت میں مواظبت تھی اسے اے فلک جناب سلام (۸۵)
”سلام“ کے بارے میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے محض حصول ثواب کے لئے کہے جاتے تھے اور مجلس میں آنے والے
ان سلاموں کو نقاد کی نگاہ سے نہیں اعتقاد کے کانوں سے سنتے تھے چنانچہ سلام نگار سلام تخلیق کرتے وقت ابلاغ کے تقاضوں کو
مقدم رکھتے تھے اور اظہار کا براہ راست انداز اپناتے تھے یہ صرف عقیدے کا اعجاز تھا کہ ادبی چاشنی نہ ہونے کے باوجود بھی یہ
صنف نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس نے ارتقائی منازل بھی طے کیں۔

میر و سودا جہاں اردو شاعری اور بالخصوص اردو غزل کا سنہری دور کہلاتا ہے وہاں اردو سلام نگاری کے حوالے سے بھی
اس کی اہمیت ہے۔ اس دعوئی کی بنیاد سودا کی وہ تنقید ہے جو انہوں نے اپنے ہم عصر میر محمد تقی گھاسی تقی کے مرثیے اور سلام پر کی۔
سودا نے تقی کے سلام کو لفظی اور معنوی دونوں حوالوں سے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر و سودا کے زمانے
تک آتے آتے ”سلام“ ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور نقادوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔
تنقید کے خوف اور اعتماد کی فضا نے اردو سلام کی پرداخت میں کلیدی کردار ادا کیا چنانچہ بیان کی ناہمواری رفتہ رفتہ معدوم ہونے
لگی اور زبان میں نکھار آ گیا۔ اس دور میں جو اہم سلام نگار سودا کی ناقدانہ نظر کا شکار ہوئے ان میں اہم شخصیت میر غلام حسین
ضاحک تھے جو میر حسن کے والد خلیق کے دادا اور انیس کے پردادا تھے۔ (۸۶)

میر ضاحک نے مرثیے بھی کہے ہیں (۸۷) ضاحک نے اپنے عہد کے سلام نگاروں میں سب سے زیادہ سلام (۳۵)

سلام) لکھے۔ یہ سلام دو طرح کے ہیں ایک وہ سلام جن میں سلام درود فاتحہ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جبکہ ایسے سلام بھی موجود ہیں جن کا انداز قدیم عہد کے مرثیوں کا ہے اور جو آئندہ ان سلاموں کے پیش رو ہیں جو سوز خوانی کے لئے پڑھے جاتے ہیں۔ ضاحک کے سلام کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے:

غریب بے کس، شہید بے بس، ستم رسیدہ چہ غم کشیدہ
ذبح بے کس کی بے بسی پر درود واجب سلام سنت
وطن سے باہر دہن سے تشنہ شکم گر سنہ میچشم گریاں
اب اس کی تشنہ لبی کے اوپر درود واجب سلام سنت (۸۸)

ضاحک کے سلاموں میں اس عبوری دور کا پتہ چلتا ہے جب سلام پر منقبتی رنگ گہرا ہو رہا تھا اور سلام نگاری کی ایک نئی روایت کا آغاز ہو رہا تھا اسی لئے سلام اور منقبت ہم معنی اصناف شمار ہونے لگی تھیں۔ عقیدت کی فضا اور حفظ مراتب کا خصوصی خیال رکھا جانے لگا تھا تاہم ہنوز ادبی حیثیت مشکوک تھی۔ میر ضاحک کے سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

(۱)

امام سیوم کا سیوم آج ہے جہاں سب اسی غم سے تاراج ہے
کریں شہر بانو یہ رو رو کے بین الم تیر ہے سینہ آماج ہے
(۲)

قلم نے لوح پہ جب مصطفیٰ کا نام لکھا وحی شاہ کے اس مرتضیٰ کا نام لکھا
انہی کے پاس لکھا اسم حضرت زہرا انہیں پہ عصمت و عفت کو اختتام لکھا
انہی کے پاس حسن کو لکھا بہ خلق حسن شہ سریر زہر جذبہ احترام لکھا
جو چاہا نام مبارک حسین کا لکھے قلم سے خون بہا، چہرہ لالہ فام لکھا (۸۹)
میر و سودا دونوں نے غزل کے علاوہ سلام کی صنف کو بھی اعتبار بخشا۔ اگرچہ میر غزل اور سودا قصیدہ کے حوالے ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ کلیات سودا میں شامل ۱۲ سلاموں میں سے چند سلاموں کے مطلعے ملاحظہ کیجئے:

ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام
قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام (۹۰)

میں بھیجتا ہوں تجھے فاطمہ کے لال سلام
علی کے باغ کے اے سرو نونہال سلام (۹۱)

کہیں ہیں ساکن جنت بزیب و زین سلام
تری جناب میں یا حضرت حسینؑ سلام (۹۲)

حسینؑ تجھ کو یہ عرش بریں کرے ہم سلام
وہاں سے آن کے روح الامیں کرے ہے سلام (۹۳)

مرزا سودا کا مشہور نمائندہ سلام ہے:

کہیں ہیں ساکن جنت بزیب و زین سلام
تری جناب میں یا حضرت حسینؑ سلام
علیؑ کے لخت جگر اور نبیؐ کے نور بصر
ہماری حضرت زہراؑ کی دل کے چین سلام
کہے ہے ناز سے حوراں بہشت سے آ کر
مرے محمدؐ عربی کے نور عین سلام
ہمیشہ مشرق و مغرب سے ماہ اور خورشید
رسوخ دل سے کریں ہیں زجاہیں سلام
امام ہر دوسرا شاہ شش جہت تم ہو
شفیع روز جزا تم پہ فرض عین سلام
تمہیں سلام کریں پہلے تو دے پاویں نجات
اوس سے فرض ہوا ہے بمدہمیں سلام
امیدوار شفاعت کا تم سے ہے سودا

قبول ایک سے ہو اس کا تاہ عین سلام (۹۴)
میر تقی میر کے چونتیس مراثی اور پانچ سلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان پانچ سلاموں کے مطلع ملاحظہ کیجئے۔ میر کی غزل کا
تغزل اور عقیدت ان سلاموں میں یکجا نظر آتی ہے۔

اے بدخشاں نبیؐ کے لعل احمد السلام
دے گلستان علیؑ کے لالہ تر السلام (۹۵)
اے شہ عالی مقام تجھ پہ درود سلام
بعد ہزاراں سلام تجھ پہ درود و سلام (۹۶)

- ساقی کوثر کے پیارے السلام
 (۹۷) تشنہ لب سید ہمارے السلام
 اے گل خوش رنگ گلزار شہادت السلام
 (۹۸) تیری مظلومی کی سب دینگے شہادت السلام
 اے شہ اقلیم شوکت السلام
 (۹۹) رونق تخت خلافت السلام

میر تقی میر کا درج ذیل ”سلام“ بہت مقبول ہوا:

- اے بدخشاں نبیؐ کے لعل احمر السلام
 اے گلستان علیؑ کے لالہ تر السلام
 ایک ساعت ہی میں امت پھر گئی نانا کی سب
 کیا قیامت لائی تیرے سر کے اوپر السلام
 بوند بھر پانی نہ دریا پر تجھے پینے دیا
 اے تمنائے دل ساقی کوثر السلام
 سب کنارے لگ گئے تو بحرِ خوں میں غرق ہے
 اے کنار مصطفیٰؐ کے ناز پرور السلام
 تو تو شاہ دیں تھا ایسا ہو کے بیکس کیوں ہوا
 اب نہ تن پر سر رہے نہ سر پر ہے افسر السلام
 بات کو بے پردہ کہیے کس طرح اب ہائے ہائے
 ہیں حرم کے لوگ اب محتاج چادر السلام
 کیا ستم کشیاں بیاں تیری کرے دل خستہ میر
 نام تیرا سن کے آنکھیں ہوتی ہیں تر السلام (۱۰۰)

میر و سودا کے سلام نگاری کے حوالے سے علی جوادی ری رقطراز ہیں:

”میر و سودا کے ہاتھوں میں پہنچ کر دوسرے اصناف کی طرح اس صنف کی بھی ادبی حیثیت سنورتی ہے..... ان استادوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر سلام قصیدے کی بلند آہنگی اور غزل کے گداز کی آمیزش کے ساتھ ساتھ بے جھول اور صاف ستھرا انداز بیان اختیار کر لیتا ہے۔ یہ

صورت صرف انہیں استادان فن کے یہاں نظر نہیں آتی بلکہ دوسروں کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔“ (۱۰۱)

میر محبت علی محبت بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے البتہ انہوں نے دہلی کے سلام نگاری کے ابتدائی دور میں ”سلام“ کی صنف کی آبیاری کی چنانچہ ان کے سلام میں غزل کا سالوچ اور گداز موجود ہے۔ ان کے منقبتی سلام کے دو شعر دیکھئے:

جو دیکھوں روضہ حضرت رسولؐ آنکھوں سے چڑھاؤں اشک کے قطروں کے پھول آنکھوں سے
ہر اک محبت کو بلاشبہ حج اکبر ہے کرے زیارت سرور حصول آنکھوں سے

شیخ قائم چاند پوری (م ۱۷۹۳) بجنور میں پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں اپنے بھائی کے پاس دہلی چلے گئے۔ انہوں نے ۱۷۵۷ء تک دہلی میں قیام کیا۔ درد اور سودا سے اصلاح لیتے رہے انہوں نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ مرثیے اور سلام بھی کہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

”وہ اول درجے کے شاعر ہونے کے باوجود اپنے دور میں میرؔ و سوداؔ اور دردؔ کی صف میں کھڑے نہیں ہوتے لیکن اس دور کے دوسرے شاعروں میں ان کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔“ (۱۰۳)

قائم چاند پوری کے سلاموں میں جدید سلام نگاری کی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔ درد اور سودا کی غزل اور قصیدے کے اثرات ان کے ہاں جھلک رہے ہیں۔ قائم چاند پوری کے کلیات میں چار مرثیٰ اور چار سلام موجود ہیں۔ ان کے چاروں سلاموں سے ایک ایک شعر نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

اے صبا! کہو مرا ابن پیہر کو سلام
داور دنیا و دیں شیر و شہر کو سلام (۱۰۴)

خدا سے آئے ہیں جن کی طرف مدام سلام
کہے ہے واں کے غلاموں کو یہ غلام سلام (۱۰۵)

قلم کی لوح پہ جس دم نبیؐ کا نام لکھا
صلوٰۃ ثبت کی ساتھ اس کے اور سلام لکھا (۱۰۶)

نہ مہرباں کے پڑھے بن قبول ہوں قائم
اگرچہ سلک گھر کے تھے یہ تمام سلام (۱۰۷)

شاہ عالم کے میرؔ شی میرؔ علیؔ سیدؔ کے سلام بھی زبان و بیان کے حوالے سے متوازن خصوصیات کے حامل ہیں البتہ یہ لہجہ کے اعتبار سے ان سلاموں سے جاملتے ہیں جو سوز خوانی کے لئے لکھے جاتے تھے۔ سیدؔ کے سلام کے دو شعر ملاحظہ کیجئے جن میں

لکھنؤ کے سلاموں کا رنگ جھلکتا ہے:

مُر یہ کہتا تھا شہ کے قدموں پر
سر فدا اس غلام کا ہو گا
تفنگی شہ کی آئے گی جب یاد
دیدہ پر آپ جام کا ہو گا (۱۰۸)

اسی عہد میں اردو سلام کی ادبی تراش اور پرداخت کی جانب توجہ دی جانے لگی تھی اور سلام کی صنف اساتذہ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مہربان خاں رند قائم کے سلام پڑھتے تھے۔ میر درد کی محافل میں بھی مرثیے اور سلام پڑھے جانے لگے تھے گویا مجالس سے صوفیوں کی محافل تک عزائی ادب کی رسائی ہو چکی تھی۔

اردو میں سلام نگاری کی ابتدا مرثیے کے پیش لفظ کے طور پر ہوئی تھی گویا سلام مرثیہ ہی کی توسیع تھا اور اس کی جداگانہ حیثیت مسلم نہ تھی لیکن سودا اور ضاحک تک آتے آتے سلام باقاعدہ ادبی صنف کی شکل اختیار کر چکا تھا چنانچہ سودا کے کلیات میں موجود سلام اس بدلتی ہوئی ادبی صورت حال کی غمازی کر رہے ہیں۔ ادب، سلام نگار، سلام اور السلام کے الفاظ کی جگہ سلامی، بحرانی یا بحرئی اسے کے الفاظ صرف ایک مرتبہ استعمال کرتا تھا۔

ازاں بعد تنہا طلب کا یہ انداز بھی متروک ہو گیا۔ اسی عہد میں ایسے شعرا بھی پیدا ہوئے جنہوں نے سلام اور مرثیے کے مابین واضح حد فاصل کھینچ دی۔ چنانچہ میر، مرزا، سودا، سکندر پنجابی اور احسان وغیرہ نے طویل مرثیے مسدس ترکیب میں تحریر کئے اور یوں رفتہ رفتہ مرثیے کے لئے مسدس ترکیب بند اور سلام کے لئے منفردہ غزل اور قصیدہ کی ہیئت مخصوص ہو گئی۔ اب سلام کو مرثیے کے مقابلے میں ایک ثانوی صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ البتہ ایک مثبت تبدیلی جو سلام نگاری کے حوالے سے نہایت اہم اور قابل ذکر ہے کہ جس طرح ”غزل“ کے بغیر کسی شاعر کو شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اسی طرح استاد کہلانے کے لئے ”سلام“ کہنا بھی ضروری قرار پایا۔ (۱۰۹)

اساتذہ دہلی کے طبقہ متاخرین سے تعلق رکھنے والے سعادت یار خاں رنگین، غلام ہمدانی مصحفی اور قلندر بخش جرات کا شمار بھی سلام گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان شعرا کی پہچان ان کی غزل کا نیا پن تھا چنانچہ اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار ان شعرا کے سلام بھی منفرد خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں۔

غلام ہمدانی مصحفی (۱۸۲۳ء) علی گڑھ میں پیدا ہوئے اگرچہ انہوں نے عمر کا آخری حصہ لکھنؤ میں گزارا لیکن ابتدائی بارہ برس دہلی میں بسر کئے اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

”شعری مزاج کے اعتبار سے مصحفی دلی والے تھے بلکہ دلی ہی میں صاحب دیوان بھی ہو چکے

تھے۔“ (۱۱۰)

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مصحفی کو دبستان لکھنؤ میں شمار کیا ہے جس کی وجہ مصحفی کا لکھنؤ میں مستقل قیام ہے۔ تاہم ڈاکٹر رام بابو سکسینہ انہیں دہلی کے متاخرین اساتذہ میں شمار کرتے ہیں (۱۱۱) ذیل میں مصحفی کے سلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

سلامی! اشک سے یہ چشم مومنین تر ہے
 کہ جس سے فرش ہے نمناک اور زمیں تر ہے
 یہ پر ہوئے ہیں شہیدوں کے خون سے تھالے
 کہ قتل گاہ کی دو دو وجب زمیں تر ہے
 پرد کی ہے جو قاسم نے وقت رخصت کے
 وہ اشک گریہ کبریٰ سے آستیں تر ہے
 پسینہ تن سے جو عابد کے پونچھے تھی زینب
 دھوم بھی نم ہے جو رومال اولیں تر ہے
 لکھنؤ میں حال شہیدوں کا مصحفی کب تک

کہ دیدہ قلم معجز آفریں تر ہے (۱۱۲)

اس دور کے دوسرے بڑے سلام نگار جرأت ہیں۔ قلندر بخش جرأت (م ۱۸۱۰) بھی دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے جرأت کی سلام نگاری کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے:

”دیوان میں غزلیات، فردیات، رباعیات، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، اسوخت، تاریخیں،
 جہو، سلام مرعے سب کچھ ہیں۔“ (۱۱۳)

جرأت کے سلام کا انداز دیکھئے:

سلام اس پہ کہ جس نے قدم جدھر رکھا
 تو آسماں نے بھی اودھر زمیں پہ سر رکھا
 سلام اس پہ کہ جس نے رہ مصیبت میں
 رضائے حق پہ قدم اپنا بے خطر رکھا
 اس سے نور بھر تو طلب کر اے جرأت

نشان جس نے مٹا اپنا نام کر رکھا (۱۱۴)

علی جواد زیدی نے رنگین کے سلام کا ایک شعر بھی پیش کیا ہے۔ نواب سعادت یار خاں رنگین سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد پہلے لاہور اور پھر دہلی میں سرکار کے ملازم ہوئے۔ رام بابو سکسینہ نے انہیں بھی شعرائے دہلی کے متاخرین میں شمار کیا ہے۔ (۱۱۵)

مدام جھک کے یہ کرتا فلک ہے جس کو سلام

وہی امام ہے کیا امام ابن امام (۱۱۶)

مغل حکومت کے آخری دور میں جن شعرا نے "سلام" کی صنف میں طبع آزمائی کی ان میں اسد اللہ خاں غالب، بہادر شاہ ظفر، عارف، مولوی محمد باقر، افسوس سالک، ظہیر دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں ان شعرا کے سلاموں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ روایت داغ تک جا پہنچی ہے اس لئے داغ کا سلام بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو	تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ نہ سلطان یہ کیا ستائش ہے	کہو کہ خامس آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی	کہو کہ رہبر راہ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ خداوند دگار بندوں کا	اگر کہیں نہ خداوند کیا کہیں اس کو
فروغ جو ہر ایماں حسینؑ ابن علیؑ	کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو
کفیل بخشش اُمت ہے بن نہیں پڑتی	اگر نہ شافع روز جزا کہیں اس کو
مسح جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی	ستم ہے کشید تنج جفا کہیں اس کو
عدو کے صبح رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات	کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اس کو
بہت ہے پایہ گر درہ حسینؑ بلند	بقدر فہم ہے گر کیسا کہیں اس کو
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر اک ذرہ خاک	کہ لوگ جو ہر تنج فضا کہیں اس کو
ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے	اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے صبر کی داد	مگر نبیؐ و علیؑ مرجا کہیں اس کو
زام ناقہ کف اس کے میں ہے اہل یقیں	پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو
باندھا کمر کوشتہ نے شہادت کے واسطے	سر دیدیا شفاعت اُمت کے واسطے
سر کاٹا اس جناب ہدایت ماب کا	بلوا کے گمراہوں نے ہدایت کے واسطے
تازہ اگر ہے زخم تو پانی ہے آب تنج	مہمان کر بلا کی ضیافت کے واسطے
زین العباد آبدوئے دو جہان ہے	در یتیم بحر امامت کے واسطے
کیسے ہے ہائے دھوپ میں پیاسا برہنہ پا	کوئی نہیں ہے جائے اقامت کے واسطے
کرتے تھے آبِ فخر و شمشیر سے وضو	شبیرؑ قتل گہہ میں عبادت کے واسطے
روحِ نبیؐ و روحِ علیؑ روحِ فاطمہؑ	تھیں گرد لاشِ شہؑ کی حفاظت کے واسطے

کھو بیٹھے اپنی دولتِ ایمان و دیں لعین دنیا کی چند روز کی ثروت کے واسطے
 اے دل غمِ حسینؑ میں شورا بہ سراسر شک شربت ہے تھکنی قیامت کے واسطے
 رکھو ظفر یہ لطف و عنایت کی تم نظر
 شاہا جناب شاہِ ولایت کے واسطے (۱۱۸)

سلامی! لڑ گئی تقریرِ شہ پر رونے والوں کی
 یہ آنکھیں جنت الماویٰ کی ہیں مہریں قبولوں کی
 عجب پیچیدگی میں فکر ہے نازک خیالوں کی
 ثناء ہے کن گل انداموں کے گھونگر والے بالوں کی
 علیؑ کی تیغ سے فوجِ عدو کے چہرے کٹتے تھے
 قضا بیٹھی ہوئی تھی گھات میں شامی رسالوں کی
 ظہیر مدحِ خواں جو جو ثناء خوانِ محمدؐ ہے
 زبانیں شکر افشاں ہیں انہیں شیریں مقالوں کی (۱۱۹)

جو دور اندیش ہیں دنیا میں کب وہ گھر بناتے ہیں
 مکان مداح سرورِ خلد میں جا کر بناتے ہیں
 عمارت کس لئے دنیا میں اہل زر بناتے ہیں
 جو عاقل ہیں سرا میں بھی کہیں وہ گھر بناتے ہیں
 رضا بچوں نے جب ماگی تو زمیبت سے کہا شہ نے
 غضب کی اب تو باتیں یہ مہ انور بناتے ہیں
 جنہیں عقلِ سلیم اللہ نے دی ہے زمانے میں
 دل دشمن میں بھی وہ دوستی سے گھر بناتے ہیں
 غم شہ میں کوئی آنسو جو لب تک آ گیا دھل کے
 کہا تنہیم سے آنکھوں نے یوں کوثر بناتے ہیں
 ٹپک پڑتے ہیں آنسو یاد کر کے حالِ عابد کا
 لرز جاتے ہیں جب زنجیرِ آہنگر بناتے ہیں

نجف کے میکدے کی آرزو میں مر کے بھی دیکھیں
 ہماری خاک سے کب کانہ گر ساغر بناتے ہیں
 بہت بیتاب تنق مرقضی ہے رن میں چلنے کو
 مگر شبیر ابھی قبر علی اصغر بناتے ہیں
 صدایہ صاف آتی ہے عمارت ہائے عالی سے
 خطا کرتے ہیں راہ سیل میں جو گھر بناتے ہیں
 سرشک خونِ غم سرور میں ٹپکاتے ہیں دامن پر
 ہم ان مہروں سے بخشش کے لئے محضر بناتے ہیں
 سخن کے جوہری جو ہیں دکھا دو ان کو اے عارف
 جلا کہتے ہیں اس کو اور یوں گوہر بناتے ہیں (۱۲۰)

.....
 اُن کو مجراتے جو زیرِ آسماں بیٹھے ہوئے بھوکے پیاسے بیوٹن بے خانماں بیٹھے ہوئے
 اُمّتِ عاصی کے حق میں شاہ نے مانگی دُعا جانبِ قبلہ زمیں پر نیم جاں بیٹھے ہوئے
 خلق پر فخر چلا سبطِ رسول اللہ کے کھائی ہیں علبڈ نے غم کی برچھیاں بیٹھے ہوئے
 راہِ تسلیم و رضا میں اہلبیتِ مصطفیٰ صبر کا کرتے تھے باہم امتحان بیٹھے ہوئے
 کہہ رہے تھے العطش جس وقت سب اہل حرم سب کی سنتے تھے شہ کوں و مکاں بیٹھے ہوئے
 حج زیارت کر چکے اب کربلا کو بھی چلو
 داغِ مدت ہو گئی تم کو یہاں بیٹھے ہوئے (۱۲۱)

دبستانِ دہلی کے شعراء نے اردو سلام نگاری کو جس ادبی مرچھے تک پہنچایا اس کی بدولت انہیں لکھنؤ کے اساتذہ سے سبقت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں ان شعرا کے ہاں منقبتی رنگ گہرا ہے اور رثائی رنگ اترتا جا رہا ہے۔ بعض سلام نگار اس عہد کے ادبی ذوق کے تحت غزل کی زمینوں میں بھی سلام کہہ رہے ہیں۔ ظفر اکثر سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ مولوی محمد باقر (محمد حسین آزاد کے والد) اور قربان علی سالک کے ہاں بھی وہی صورت نظر آتی ہے۔

دی حُر نے جانِ بحرئی آقا کے سامنے
 لی ایک جائے عرشِ معلیٰ کے سامنے
 صورت نے ذوالفقار کی اثبات لا کیا
 موجود کون ہے شہ والا کے سامنے (سالک) (۱۲۲)

اے سلائی صبر سبط مصطفیٰ پر ختم ہے
ظلم و کیس مجرائی شمر بے حیا پر ختم ہے
کیوں نہو کل البصر خاک شفا کوئین کو

روشنی چشم بھی اس طوطیا پر ختم ہے (مولوی باقر شہید) (۱۲۳)

مجموعی اعتبار سے دہلی کے سلام نگاروں کے ہاں جدید اور قدیم دونوں روایتیں موجود ہیں۔ بعض شعرا عقیدت سے زیادہ ادبی محاسن پر توجہ دے رہے ہیں۔ بعض کے ہاں بھگتی تحریک کے ادبی رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اخلاقیات بھی سلام کا موضوع ہے۔ غرض یہ کہ غزل کی طرح اردو سلام بھی معاصر مسائل اور حالات کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت سے گہری وابستگی رکھنے والے عارف اور افسوس بھی موجود ہیں۔ علی جواد زیدی دہلی کے سلام نگاروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”ضمیر، خلیق جب تک متقدمین کی پیروی کرتے رہے ان کے یہاں دہلوی رنگ نمایاں رہا۔ یہ رنگ بنیادی طور پر رٹائی تھا اور زمانہ ماضی کے دکنی اور دہلوی مرثیوں کے لہجوں کی صدائے بازگشت کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ معتبر لہجہ اسی روایتی سلام کا مانا جاتا تھا۔ ضمیر و دلگیر ہی نہیں بلکہ دیر تک اسی روایتی لہجے کو اپنائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (۱۲۴)

لکھنؤ میں سلام نگاری

اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا یوں تو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے فوراً بعد ہی تخت نشینی کی سازشوں نے مغل حکومت کی بربادی کا آغاز کر دیا تھا۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں نادر شاہ درانی کے حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ طواف الملوکی کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے صوبے خود مختار ہونے لگے۔ ان صوبوں میں اودھ بھی شامل تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے بیٹے آصف الدولہ کے عہد میں دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا اور یوں لکھنؤ شعر و ادب اور عیش و عشرت کا گہوارہ بن گیا۔ (۱۲۵) آصف الدولہ نے خزانے کے منہ کھول دیئے اور دل کے ٹوٹے ہوئے ستارے اس دبستان کے آفتاب و ماہتاب بن گئے اور ان کی کرنوں سے انیسویں صدی مطلع عالم تاب بن گئی۔ (۱۲۶)

دہلی میں ابدالی کے حملوں اور جائنوں، روہیلوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار سے تنگ آ کر عوام و خواص سب ہی نے لکھنؤ کا رخ کیا ان میں دہلی کے اساتذہ شعرا بھی شامل تھے۔ دبستان دہلی کی شاعری پر آشوب عہد کی شعری تھی اس لئے غم و الم کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ جس میں ”جہاں آباد“ خرابہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جبکہ اودھ میں بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی بن برس رہا تھا۔ (۱۲۷) اس فارغ البالی نے دہلی کی داخلیت کی جگہ خارجیت کو جنم دیا چنانچہ آصف الدولہ ۱۷۵۷ء سے لے کر واجد علی شاہ اختر ۱۸۵۶ء تک کا لکھنؤی عہد حکومت خوش حالی، فارغ البالی، عیش و عشرت، بے فکری کا دور تھا۔

ان حالات میں اکثر شعرا جن میں خان آرزو، میر، سودا، مصحفی، میر سوڑ، میر حسن، انشا، جرأت، رنگین، ہجرت کر کے فیض آباد آ گئے۔ (۱۲۸)

اودھ کے حکمران عقیدہ کے اعتبار سے شیعہ مسلک رکھتے تھے اس لئے دکنی قطب شاعری اور عادل شاعری دور حکومت کی طرح یہاں بھی محرم اور عزاداری کو سرکاری طور پر منایا جاتا تھا چنانچہ آصف الدولہ اور اس کے جانشینوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے اور عزائی ادب تخلیق کرنے والوں کی عزت افزائی اس لئے کی گئی تاکہ لوگ حکمرانوں کو باندھب تصور کریں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ شاہان اودھ کی عزاداری سے دلچسپی کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”در حالیکہ وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے ان کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔“ (۱۲۹)

اس طرح شاہان اودھ کی سرپرستی نے مرثیہ نگاری، نوحہ نگاری اور سلام نگاری کو مقبولیت اور عروج بخشا۔ لکھنؤ میں سلام نگاری کی وجہ کم و بیش وہی تھی جس کا ذکر اس باب کے آغاز میں کیا گیا ہے یعنی مجالس میں مرثیہ پیش کرنے سے قبل فضا بندی کے لئے سلام پڑھنا یعنی سامعین کو مرثیہ سننے کے لئے آمادہ کرنا۔ سید وحید الحسن ہاشمی لکھنؤ میں سلام نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”لکھنؤ میں عزاداری کا بڑا چرچا تھا۔ نوائین اودھ خود شاعری کے رسیا تھے..... وزراء مدح آئمہ پر شعراء کو نوازتے تھے۔ امراء سردار باندھنے پر پیش کرتے تھے۔ عام لوگ مفلوک الحال تھے لیکن شعرا کی داد میں بخل نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلام نگاری میں جدوتوں کے پہلو نکالے گئے۔ نئے نئے مضامین تلاش کئے گئے اور سبقت کی خاطر آسمان سے تارے توڑ کر اشعار میں ٹانک دیئے گئے۔ ابتدائی دور کے شعرا میں ضمیر خلیق، دلگیر اور فصیح کے نام نمایاں ہیں۔ یہ شعرا دہلی کے رنگ کی تاسی کرتے رہے مگر انہوں نے اپنی رنگین بیانیوں سے سلام کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ (۱۳۰)

”سلام“ کے حوالے سے جن شعرا نے لکھنؤ میں نام کمایا ان میں پنجاب کے سکندر پنجابی اور دہلی کے حیدر دہلوی بھی شامل ہیں ان کے علاوہ لکھنؤ کے ابتدائی دور کے سلام نگاروں کی صف میں گدا، افسردہ، احسان اور ناظم نے بھی طبع آزمائی کی۔ ذیل میں ان سلام نگاروں کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

عاشق صادق ہو تم نور الہی السلام
کربلا کے دشت کے بے جاں سپاہی السلام
دین احمد کا کیا سر دے کے تم نے استوار
جو دھن ٹھانے بھی تم اس کو نباہی السلام

یہ گدا ہے تجھ غلاموں کا غلام امیدوار
اس کے خط پر ہووے تجھ شہ کی گواہی السلام (گدا) (۱۳۱)

مجرائی او نہیں وہ جو مسلم کے پیارے ہیں
نے شہر میں نے گھر میں یکس ہیں بیچارے ہیں
شوکت سے شہادت ان معصوموں نے پائی ہے
کیا شان ہے یہ دونوں جنت کو سدھارے ہیں
احسان یہ کہتا ہے مسلم کے پیاروں سے
شہزادے تم اور ہم مداح تمہارے ہیں (احسان) (۱۳۲)

جب شام کے حاکم کے حضور آئی سیکند
اے مجرئی کیا اس گھڑی گھبرائی سیکند
پھر جی میں یہ کہتی تھی یہ دربار ہے کس کا
تقدیر تجھے آج کہاں لائی سیکند (ناظم) (۱۳۳)

لکھ سلام شہ پہ اے دل لفظ بسم اللہ کا
تا عمد ہو مد بسم اللہ مد آہ کا
کہہ درود کبریا اس مہر دیں کی شان میں
جس کے اعلائے میں ادنیٰ معجزہ ہے ماہ کا
عرش کے دو گوشوارے شہر و شہر ہیں
مرتبہ یہ کون پاوے ان کے عز و جاہ کا
ہو مکیں افسردہ در پر چارہ معصوم کا
ہے اس در پہ ٹھکانہ ایسی دولت خواہ کا (افردہ) (۱۳۴)

لکھنؤ کے مخصوص شعری اور مذہبی ماحول میں مشاعرے اور مجالس ایک معمول کی حیثیت رکھتے تھے۔ عزائی ادب تخلیق

کرنے والوں کے لئے کھلا میدان موجود تھا چنانچہ لکھنؤ میں ڈاکٹر صفدر حسین کے بقول:

”ضمیر، خلیق، دلگیر اور فصیح نے سلام نگاری کو اعلیٰ معیار دے کر اس کا ادبی قد بڑھا دیا“ (۱۳۵)

غلام حسن میر حسن دہلوی نے مثنوی کے علاوہ سلام اور مرثیے بھی کہے (۱۳۶) ان کے تین بیٹے خلیق، خلق، اور محسن شاعر تھے۔ خلیق کی تربیت فیض آباد میں ہوئی۔ مصحفی سے اصلاح لی۔ غزل اور مرثیہ کے علاوہ سلام بھی کہے۔

میر خلیق، ضمیر، فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ یہ تینوں بھی مرثیہ نگار اور سلام نگار تھے۔ دلگیر کی زبان میں لکنت تھی اس لئے اپنا کلام خود نہ پڑھ سکتے تھے۔ مرزا فصیح جو ناسخ کے تلامذہ میں شامل تھے وہ اور دلگیر ج کے لئے چلے گئے یوں بقول ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اب ضمیر اور خلیق کے واسطے میدان مرثیہ خالی رہ گیا۔ (۱۳۷) ضمیر اور خلیق نے سودا کی مرثیہ کو مسدس میں لکھنے کی روایت کو آگے بڑھایا اور خصوصی بات یہ کہ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے (۱۳۸) ان اساتذہ نے سلام کی صنف کی بھی آبیاری کی۔

اب ذیل میں میر حسن دہلوی، میر خلیق، مرزا فصیح، میر ضمیر، دلگیر کے سلاموں کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک ایک سلام منتخب کیا گیا ہے۔

سلام میر حسن دہلوی

مجرا کہو شہر پہ اس طرح حزیں ہو جو اشک کے سیلاب سے تر ساری زمیں ہو
سر اُس کا علم پر علم آہ کہ جو شخص حیدر کا نشاں دوشِ محمدؐ کا کہیں ہو
جو حضرت شہر بھلا کون ہے یارو جو ساجد و مہبود دم باز پھیں ہو
صد حیف ملے پیادہ روی اس کے پر کو کونین کی اقلیت کا جو تخت نشیں ہو
خنگ احمدؑ مختار کے ہوں کس طرح آنسو تر خون میں شہر کے جب فخر کیں ہو
سرنگے نہ کس طرح سے ہوں فاطمہؑ نالاں عریاں پڑی جب دشت میں لاشِ شہ دیں ہو
اے پیرِ فلک ہووے جو اکبرؑ سا جواں آہ تیر و تہر ظلم ہو اور اُس کی جبین ہو
بیہات جو ہو قوتِ بازوئے حسنیؑ شانہ کہیں سر اُس کا کہیں پاؤں کہیں ہو
محتاجِ پُدر ہوئیں وہ اے وائے کہ جن کے یوں سلطنتِ ہر دو جہاں زبر نگین ہو

ہے حضرت شہر سے یہ عرض حسن کی

جا مشہدِ عالی پہ یہ پیوندِ زمیں ہو (۱۳۹)

میر خلیق کی سلام نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر صفدر حسین رقم طراز ہیں:

”خلیق نے جس طرح صنفِ مرثیہ کو زبان و بیان کی شیرینیِ حلاوت سے دلکش بنا دیا تھا اسی

طرح سلام کی صنف کو بھی اعلیٰ معیار دے کر اس کا ادبی اعتبار بڑھا دیا۔“ (۱۴۰)

شیر کے روضے کی جدائی نہیں جاتی اے مجرئی طالع کی برائی نہیں جاتی
 بیٹے مجھے کچھ یاد نہیں کہتی تھی زینب اکبر کی مگر شکل بھلائی نہیں جاتی
 کہتے تھے علیؑ ہو مجھے گو فاقے پہ فاقہ سائل سے مگر آنکھ چرائی نہیں جاتی
 کہتے تھے حرم ہاتھ سے سجاؤ حزیں کے گرتی ہے تو زنجیر اٹھائی نہیں جاتی
 کہتے تھے لعین گرچہ رسن بست ہے عابد خلقت کی ولے عقدہ کشائی نہیں جاتی
 اور باپ کے سرنے کیا کافر کو مسلمان مرنے پہ بھی اعجاز نمائی نہیں جاتی
 رائیوں کے بندھے ہاتھ رسن میں تو پکاریں بالوں سے بھی اب شکل چھپائی نہیں جاتی
 رکھ قبر میں شیرؑ نے اصغرؑ کو کہا آہ یہ خاک میں صورت تو ملائی نہیں جاتی
 اس قلم پہ شہؑ نے نہ کیا شکوہ اعدا نیکوں کے کبھی دل میں برائی نہیں جاتی
 ہے طبعِ خلیق ان دنوں ہر چند مکرر پر جوش مضامین کی صفائی نہیں جاتی (خلیق) (۱۴۱)

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
 سر اپنا کعبے کے سنگ در پر سیاہ پردہ ٹپک رہا ہے
 زمین بالوں سے جھاڑتی ہے بول پھرتی ہے کربلا میں
 شیم گیسوئے عنبریں سے تمام صحرا مہک رہا ہے
 لڑا جو قاسمؑ حسنؑ کا پیارا تو آن واحد میں سب نے دیکھا
 ادھر کو بیٹے تڑپ رہے ہیں ادھر کو ارزق پھر رہا ہے
 حسینؑ کہتے ہیں غازیوں سے وہ حوض کوثر ہے تشنہ کا مو
 وہ حور ساغر لئے کھڑی ہے وہ آب کوثر چھلک رہا ہے
 گھرے ہیں بادل سے شام کے دل کھینچی ہے حیدرؑ کی سیف قاطع
 گھٹا میں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے
 کفن میں لپٹا ہوا ہے قاسمؑ نہ لال سہرا نہ زرد کنٹنا
 پسید تحت الحک بندھی ہے سیاہ شملہ لٹک رہا ہے

پکارے اکڑ لڑوں گا کیونکر جلائے دیتی ہے دھوپ یارب

گرفت مشکل ہے ہاتھ بھٹتا ہے ایسا قبضہ دہک رہا ہے

لیکن پیاسی تڑپ رہی ہے پڑی ہے خاموش بیتِ مسلم

ادھر کو اصغر سسک رہا ہے ادھر کو باقر بلک رہا ہے

پکاریں زحبتِ قیامت آئی حسین ہوتے ہیں ذبح لوگو

بھکے ہیں سجدے میں میرے بھائی قضا پہ خنجر چمک رہا ہے

تڑپ کے ہاتھوں سے ماں پھوپھی کے نکل گیا ہے حلق کا مہر

پھٹی ہے ٹوپی کھلے ہیں گیسو بدن میں کرتا مسک رہا ہے

کہا پھوپھی نے یہ حال کیا ہے تمہارا عابد! تو رو کے بولے

بدن میں لرزہ ہے تب چڑھی ہے سحر سے ماتھا دھک رہا ہے

کہا یہ عابد نے کاش نیزہ جگر پہ لگتا تو خوب ہوتا

نے سنتے اعدا کی تلخ باتیں کلیجہ طعنوں سے پک رہا ہے

لگن میں رکھا ہے شاہ کا سر بزیرِ تختِ یزید فاسق

شقی کو پاس ادب نہیں ہے جو منہ میں آتا ہے بک رہا ہے

خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے

فصح مشتاق اس قدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے (۱۴۲)

فصح کے کلام کی خصوصیات کے بارے میں ڈاکٹر ناظر حسین زیدی کا موقف یہ ہے کہ فصاحت میں ان کی زبان ضمیر

سے آگے اور خلیق کے برابر ہے ان کا کلام زبان و بیان کے تمام معیاروں پر پورا اُترتا ہے۔ (۱۴۳)

سلائی وصف زلف شاہ خوشو ہو نہیں ہو سکتا رہ پیچیدہ ہے ذل اک سرمو ہو نہیں سکتا

اٹھایا جب در خیبر علی نے بولے پیغمبر کس کا بازو اور یہ زور بازو ہو نہیں سکتا

بجا عباس کے لاشے نے منہ اپنا چھپایا تھا سوئے اہل زمیں خورشید کارو ہو نہیں سکتا

جب آیا ذکر بیعت بولے شہِ فرزندِ پیغمبر مطہج کا فرد بدکار و بد خو ہو نہیں سکتا

سوا عباس غازی کے وہ طالب تھا رہے پیاسا کوئی سقہ لب جو ہو نہیں سکتا

سراپا شاہ کا کہنا سراپا کار مشکل ہے پریشانی میں کیا اک وصف گیسو ہو نہیں سکتا

خط باریک خنجر شہ کی گردن پر مزمین تھا سوا در نجف کے خوشنامو ہو نہیں سکتا

تضا کو کرنا تھا ہم پہلے اصغر شاہ سے ورنہ گلے اور ہاتھ میں ناوک ترازو ہو نہیں سکتا
 تعجب ہے مجھے دلگیر گر سماں نہیں کوئی غم شد میں بیاباں مرگ بھی تو ہو نہیں سکتا (دلگیر) (۱۳۳)
 موخر الذکر میاں دلگیر ایک تو اس حوالے سے اہم ہیں کہ وہ پہلے ہندو ہیں جنہوں نے عزائی ادب (مرثیہ اور سلام)
 تخلیق کیا چنانچہ شاد عظیم آبادی نے ان کے سلاموں کی تعداد سات سو بتائی ہے۔ (۱۳۵)
 عبدالرؤف عروج (مرتب اردو مرثیہ کے پانچ سو سال) نے دلگیر کو ان کی سلام نگاری کے حوالے سے اپنے عہد کا
 معروف و مقبول شاعر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”مرثیوں کے علاوہ دلگیر کو اپنے معاصرین کے برخلاف یوں بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ
 انہوں نے سلام بہت کہے۔ سلام میں غزل کے انداز کے سے شعر کہنے کی روایت کا ان ہی سے
 آغاز ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو سلام کہے جاتے تھے ان میں غزل کے اشعار کو شامل کرنا
 معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مرزا دلگیر کے سلاموں کے بعد تمام ہی اساتذہ نے ان کی پیروی
 کی۔“ (۱۳۶)

میر ضمیر کے سلام کا نمونہ ملاحظہ کرنے سے پہلے دلگیر کی عزائی ادب کی خدمات کے بارے میں معروف مورخ ڈاکٹر
 اعجاز حسین اور ناقد مولانا شبلی کی آراء ملاحظہ کیجئے۔ میر ضمیر کے مجموعہ مراۓ میں گیارہ سلام بھی موجود ہیں جن میں سے ایک نمونہ
 کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

”عرصہ دراز کی وچنی کاوشوں کے بعد میر ضمیر ایک بزرگ خضر صورت مل گئے۔ جنہوں نے
 مرچے کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔“ (۱۳۷)

”اب سے پہلے مرچے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے۔ اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا اور
 غالباً پہلا شخص جس نے منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ مرثیہ پڑھا میر ضمیر تھا۔“ (۱۳۸)

بحر کی شہ نے کہا میں جو بے سر ہوتا
 حشر کو تاج شفاعت نہ میسر ہوتا
 شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا آ کر
 دیکھتے تم کہ جواں کیا علی اصغر ہوتا
 شاہ نے مڑ سے کہا آج جو کچھ تو نے کیا
 ایسا کرتا جو حسن میرا برادر ہوتا!

دیکھتا شان علمدار جو آ کر رن میں
 صدقے سو جان سے عباس پہ جعفر ہوتا

شاہ کہتے تھے یہ ہے ذوق شہادت اے شمر
ہم تجھے دیتے جو تجھ پاس نہ خنجر ہوتا
ہوتی خاتون قیامت تو قیامت ہوتی
حشر ہو جاتا اگر شافع محشر ہوتا
سوچ کر تھکی شاہ کو بولے عباس
نہر کیا پانی نہ ہم پیتے جو کوثر ہوتا
شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آب فرات
ہم لٹا دیتے اگر چشمہ کوثر ہوتا

(میر ضمیر) (۱۴۹)

اردو سلام نگاری کے حوالے سے لکھنؤ کے دو شاعر ایسے تھے جو مرثیہ کے میدان میں اپنا ٹاٹا نہیں رکھتے۔ ایک مرزا دبیر اور دوسرے میر بہر علی انیس۔ سلامت علی دبیر دہلی میں ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے لکھنؤ میں شادی کی اور پھر واپس دہلی چلے گئے لیکن دبیر کی پیدائش کے سات سال عمر دوبارہ لکھنؤ آ گئے۔ دبیر میر ضمیر کے شاگرد تھے۔ (۱۵۰) دبیر نے جو سلام کہے ان کی تعداد کے بارے میں بغیر تحقیق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین سو سے زائد سلام کہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صفدر حسین نے دبیر کے سلاموں کی تعداد تین سو سے زائد بتائی ہے۔ (۱۵۱) اسی طرح مظفر حسن ملک کا کہنا ہے:

”میرزا دبیر نے مجموعی طور پر تین سو بیس سلام کہے ہیں۔“ (۱۵۲)

اور یہ روایت اسی طرح جاری رہتی اگر ڈاکٹر سید تقی عابدی سلک سلام دبیر میں اردو اور فارسی سلاموں کو مرتب نہ کرتے۔ سید تقی عابدی کے اس مجموعے میں ۱۳۲ اردو اور ۲ فارسی سلام ہیں۔ اسی طرح دبیر کے کل ۱۳۴ سلام ہیں۔ (۱۵۳)

دبیر کے سلاموں میں رٹائی عناصر نسبتاً زیادہ ہیں اور قرآن و حدیث کا علم جا بجا اپنا رنگ جماتا نظر آتا ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر الفاظ کی سادگی و صفائی اور مضمون کی درد انگیزی پر رہتی ہے۔ اس لئے سید علی جواد زیدی دبیر کی سلام نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”..... ویسے تو دبیر نے ہر محاذ پر انیس کا مقابلہ کیا لیکن عجب بات ہے کہ نئی طرز سلام کی طرف
وہی توجہ نہ کی۔ سلام کے معاملے میں وہ اپنے استاد ضمیر اور استاد کے ہم عصر دلگیر و خلیق وغیرہ
کے بیشتر پیروں پر رہے۔“ (۱۵۴)

دبیر نے ۱۳۲ سلاموں میں سے صرف دو سلام نمونے کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں:

سلامی کہتے تھے ظالمِ رُلاؤ زینب کو
کہ ذبحِ شہ کو کرو اور دکھاؤ زینب کو

چڑھو حسین کے سینہ پہ پہلے تیغ بکف
برہنہ اونٹوں پہ پھر تم چڑھاؤ زینب کو
چلے حسینؑ پہن کر کفن جو مرنے کو
کہا یہ بانوئے یکس سے لاؤ زینب کو

ردائے فاطمہؑ زہر اڑھا کے لے آؤ
برہنہ سر نہ مجھے تم دکھاؤ زینب کو
صدائے فاطمہؑ آئی کہ شر چھینے گا
حسینؑ پیارے نہ چادر اڑھاؤ زینب کو

اٹھا کے ہاتھوں کو بولے میں کہتی تھی کلثومؑ
حسینؑ بھائی کہاں ہیں چھڑاؤ زینب کو
پکارتی تھی یہ لاش حسینؑ قتل میں
کہ ظالموں نہ مصیبت دکھاؤ زینب کو

اگر مجھے نہیں دیتے ہو تو کفن مت دو
پہ کوئی میلی سی چادر اڑھاؤ زینب کو
مزارِ شہ سے یہ سجاؤ کو صدا آئی
میں کانپتا ہوں لحد سے چھڑاؤ زینب کو

کہا یہ روحِ نبیؐ نے مزارِ زہراؑ سے
وہ لٹ کے آئی ہے تم لینے جاؤ زینب کو
ترپ رہا ہے سکینہؑ کے سقہ کا لاشہ
لپ فرات نہ سر ننگے لاؤ زینب کو

دبیرِ حق سے کہوں گا دمِ سوال و جواب

کریں گی میری شفاعت بلاؤ زینب کو (۱۵۵)

گئے سوئے میداں جو اکبر دوبارہ سلامی ہوا گھر میں محشر دوبارہ
عجب تفرقہ تھا تن و سر میں جس سے ہوا ذن فرزند حیدر دوبارہ
کہا والدہ نے یہ مرنے کی جلدی نہ ہنکی بھی لی تو نے اکبر دوبارہ
کہا شہ نے کیا تیر ظالم نے مارا کہ تڑپا نہ ہاتھوں پہ اصغر دوبارہ
اجاڑا تھا ارے چرخ کس طرح تو نے لب جو نہ سادات کا گھر دوبارہ

دبیر ایک خوبی طبیعت کی یہ ہے

کہ ثابت کیا جا بجا ہر دوبارہ (۱۵۶)

میر انیس (۱۸۰۲-۱۸۷۴) فیض آباد میں پیدا ہوئے پھر والد کے ہمراہ لکھنؤ آ گئے۔ انہیں اپنے خاندانی شاعر ہونے پر فخر تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے مطابق انہوں نے ہزار ہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھیں (۱۵۷) جہاں تک سلام کا تعلق ہے تو رام بابو سکسینہ کا یہ بیان مبالغہ آمیز ہے اس لئے کہ علی جواد زیدی کے مطابق انیس کے سلاموں کی تعداد ۱۰۲ ہے۔ (۱۵۸) میر انیس کی سلام نگاری کی بدولت سلام، غزل کی خصوصیات سے اتنا قریب ہو گیا ہے کہ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری غزل اور سلام کے اشعار میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ (۱۵۹)

انیس کے سلاموں کے حوالے سے یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ انیس نے اردو سلام نگاری کی روایت کو اسی انداز سے ارتقا کی بلند یوں سے آشنا کیا جس طرح مرثیہ کو انتہاؤں تک پہنچایا ہے چنانچہ علی جواد زیدی کا یہ کہنا درست ہے کہ:

”انیس کا کمال فن یہ بھی تھا کہ انہوں نے سلام کے معتقداتی مواد سے آفاقی مواد کے عناصر چن لئے اور اخلاق عالیہ کا ایسا مرقع بنایا جس سے ہر مکتبہ فکر کے سننے اور پڑھنے والے محفوظ ہو سکیں۔“ (۱۶۰)

اب انیس کے ۱۰۲ سلاموں میں سے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

(۱)

اُسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا اُسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا
علیٰ کو حق نے اتارا تو عین کعبہ میں کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا
ہمیشہ فرشِ مشجر پہ جو کہ بیٹھتے تھے نہ ان کی قبر پہ بھی سایہ شجر دیکھا
قیام کس کا ہوا اس سرائے فانی میں ہمیشہ ایک کے بعد ایک کا سفر دیکھا
خدا نے گھر کو بنایا تھا جس کے خانہ فیض اُسی کی آل کو خلقت نے در بدر دیکھا
مثال شاخ بچکے جب تو ہم پھلے پھولے نہال عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا

یقین ہوا اے ہے آفتاب پر شبنم
خوشا رواقِ علم دارو روضہ شہر!
وہ کیا مزہ ہے خوشا لذتِ زیارتِ شاہ
پڑا جو عکسِ رُخِ شاہ چرخ پر سرِ شام
بروزِ عید بھی آیا جو کوئی ملنے کو
زہے کرم کوئی خالی نہ پھر کے گھر آیا
رُخِ حسین کو جس نے عرق میں تر دیکھا
خدا کے نور کا جلوہ ادھر ادھر دیکھا
کہ زاروں کو تڑپتے ہی عمر بھر دیکھا
فلک نے صبح تک آئینہ قمر دیکھا
غمِ حسین میں عابد کو نوحہ گر دیکھا
بس اک جہاں میں جو دیکھا، علی کا گھر دیکھا

ق

سحر ہوئی شبِ معراج کی تو لوگوں نے
کہا یہ سب نے غلاموں سے کیجئے ارشاد
گہر فشاں ہوئے لعل لبِ رسولِ کریم
ورائے کرسی و عرشی عظیم و لوح و قلم
کہاں تلک کہوں نکلا جو ہاتھ پردے سے
ولی کی صدا تھی جہاں جہاں پہنچا
قریب قبر ہم آئے کہاں کہاں پھر کر
جو کچھ تھا رزقِ مقدر ملا وہ گھر بیٹھے
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس

عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا (۱۶۱)

(۲)

اک نہ اک نیرنگ ہوتا ہی رہا
جس نے چاہا خاک سے موتی اُگیں
سو رہے مرقد میں جا جا کر مکیں
جو ہوا تر دامن سے منفعل
جس نے دیکھی سجہ پاکِ حسین
لختِ دل باقی ہیں اے اہلِ عزا
کس میں ہے گنجائشِ فیضِ حسین!
آسماں کو عذر کوتاہی رہا!!

اے فلک! افسوس خشکی میں بھی تو فاطمہؑ کا گھر ڈبوتا ہی رہا
 غل ہوا، لو کٹ گیا دولہا کا سر بیاہ کا سامان ہوتا ہی رہا
 دل میں بانو کے سدا اکبر کا غم نوک برجھی کی چھوتا ہی رہا
 نہر میں عباس داخل ہو گئے مشورہ اعدا میں ہوتا ہی رہا
 چاروں ارزق کے پر دو دو کیے رن میں ور حیدر کا پوتا ہی رہا
 کہتی تھیں ام البنین دیکھوں کے پاس بیٹا اور نہ پوتا ہی رہا
 میرا نیس کے سلاموں کو شاد عظیم آبادی نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ”کھانے میں نمک“ قرار دیا ہے کہ اس کے
 بغیر کھانے کا مزہ ہی دو بالا نہیں ہوتا۔

”میرا نیس نے اس صنفِ سخن میں بھی ایسی جدت سے کام لیا..... سلام میں مدحیہ اشعار یا کوئی
 اور نادر مضمون نظم کیا جاتا تھا مگر میرا نیس نے اکثر محض عرفانِ یادِ ح میں ایک طرح کا تغزل ایسا
 پیدا کر دیا ہے کہ اوروں کے ہاں یہ بات نہیں۔“ (۱۶۳)

انیس ودبیر کے بعد ان شعرا کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سلام نگاروں اور لکھنؤ میں مقیم دیگر شعرا نے اردو سلام کی
 شمع کی لو کو نیچا نہیں ہونے دیا اور اس صنف کو اپنے خونِ جگر سے مسلسل سینچتے رہے۔ ان شعرا میں میرا نیس کے برادرِ خرد میر مونس
 انیس کے بڑے صاحبزادے میر نفیس، میر نفیس کے نواسے علی محمد عارف، میرا نیس کے پوتے سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس نے
 نہ صرف لکھنؤ میں سلام نگاری کے چراغ کو روشن رکھا بلکہ دولتِ آصفیہ کی دعوت پر دکن میں آتے جاتے رہے۔ چنانچہ نفیس ۱۹۰۱
 تک برابر دکن آتے رہے۔ (۱۶۴)

میر محمد سلیم کا حیدر آباد جانا بھی ثابت ہے۔ خاندانِ انیس میں ان کے بھائی انس نے بھی مرثیہ کے علاوہ سلام کی
 صنف کو بھی زندہ رکھا۔ میرزا انس کے پانچویں بیٹے عشق حسین مرزا، سید میرزا عشق احمد میرزا صابر نے بھی لکھنؤ میں سلام نگاری کا
 چراغ بجھنے نہ دیا بلکہ دکن کی مجالس میں بھی اپنے سلام پیش کرتے رہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے ان سلام نگاروں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انیس، دبیر، عشق، عشق، انس اور مونس نے سلاموں کے پودے کو چھتنا اور درخت بنادیا ان
 سلاموں میں تجزیہ، تبصرہ، تاریخ، تنقید، محاکمہ، طنز، تلخی، غرض شعر کی تمام ممکنہ صفات سلاموں
 میں بھر دی گئیں۔“ (۱۶۵)

ان سلام نگاروں کا ایک ایک سلام نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

سلامی جادہ ملک بقا نہیں ملتا مسافرانِ عدم کا پتہ نہیں ملتا
 کدھر تلاش کریں تم کو اے عدم والو کہاں گئے کہ کہیں نقشِ پا نہیں ملتا

علیؑ سے راہ رکھے جو وہ مصطفیٰ سے ملے کہ بے وزیر ملے بادشاہ نہیں ملتا
 ٹپک کے چشم سے کہتا ہے اٹک ماتم شاہ صدف کو بھی یہ دُر بے بہا نہیں ملتا
 گلا کٹا تو شفیع اُمم ہوئے شیر کسی شہید کو یہ خوں بے بہا نہیں ملتا
 یہ بانو کہتی تھیں کیونکر مجھے مریض کی پیاس کہ یاں تو آب برائے دوا نہیں ملتا
 بکا سے بزم غم شاہ دیں کی نصب ہے جو یہ غم نہ ہو تو عزا کا حرا نہیں ملتا
 سیکہ کہتی تھیں بے تاب ہوں کئی دن سے مرا غریب پدر اے خدا نہیں ملتا
 حرم ترپتے ہیں لاشے کے دفن کر نیکو مگر سرِ شہرِ گلگوں قبا نہیں ملتا
 مزار شاہ پہ جب تک نہیں پہنچتے ہیں
 ریاضِ غلد کا مونس پتا نہیں ملتا (۱۶۶)

سب جو کہتے ہیں گدائے ور سرد مجھ کو بھرائی دیکھتا ہے رشک سے قیصر مجھ کو
 شوقِ دل آپ نجف تک مجھے پہنچا دیگا نہ جلو چاہئے رستہ میں نہ رہبر مجھ کو
 اے صبا روضہ شیر کا مشتاق ہوں میں ساتھ لیجا صفتِ بوئے گل تر مجھ کو
 مقتلِ شہ کی زمیں کہتی تھی دیکھ اے گردوں حق نے اک چاند دیا تجھ کو بہتر مجھ کو
 شاہ کہتے تھے کہ آئے گا زمانہ ایسا کہ نہو گا کئی دن پانی میسر مجھ کو
 خبر قتل پر سن کے کہا حضرت نے ہے غضب کر گئے تنہا علی اکبرؑ مجھ کو
 کہا بانو نے گوارا نہیں بیٹے کا فراق دفن کر دو علی اکبرؑ کے برابر مجھ کو
 کہتی تھی چھاتی سے لپٹا کے شلوکے بانو دے گئے ہیں یہ نشانی علی اصغرؑ مجھ کو
 بانو کہتی تھی بلایا نہ پدر سے کہہ کر اپنی دائی بھی نہ سمجھے علی اصغرؑ مجھ کو
 کہتی تھی فاطمہ صغراؑ کہ بھلایا وعدہ لے گئے آ کے نہ بھیا علی اکبرؑ مجھ کو
 صبح کرتی ہوں شبِ ہجر میں تارے گن کر آہ و زاری میں گزر جاتا ہے دن بھر مجھ کو
 کہا زیبت نے کہ اے صبح قیامت آ جا شام میں لائے ہیں بے رحم کھلے سر مجھ کو
 کہا زیبت نے کہ فوج جائے گا بھائی کا کوئی لے جا کے بٹھا دے تہہ خنجر مجھ کو
 بانو کہتی تھی کہ تنہا نہ لحد میں سونا اپنے پہلو میں جگہ دو علی اصغرؑ مجھ کو
 شہہ نے قاتل سے کہا ہوگی قیامت برپا دیکھ پائے گی جو زیبت تہہ خنجر مجھ کو

کا عابد نے کہ غیرت سے گڑا جاتا ہوں دفن کرنے نہیں دیتے تن سرور مجھ کو
مضطرب گوشہ عزلت میں نہ ہوں کیونکہ نفیس کبھی دیتا نہیں آرام مقدر مجھ کو (۱۶۷)

روئے مطلب پڑھ کے شہ دل پارا پارا ہو گیا مد جو تھا عرضی میں دریا کا کنارہ ہو گیا
روئے جب شہ کو تو دل روشن ہمارا ہو گیا داغ اُلفت عرش اعظم کا ستارا ہو گیا
چوم کر منہ شہ نے اصغر سے کہا کھایا جو تیر چاند سا نقشہ تمہارا اور پیارا ہو گیا
گو محیط آب آہن میں تلاطم تھا کمال عصر تک پیاسوں کے بیڑے کا اتارا ہو گیا
تفتگی سے جی لگا جب ڈوبنے شیر کا یاس کی نظروں سے دریا کا نظارہ ہو گیا
خون روؤں اے غم دندان پر خون حسین اشک کی سرن سے واجب استخارہ ہو گیا
اُس کی رحمت مجھ کو کجی بندہ زار و نحیف ڈوبنے کو خیر تھکے کا سہارا ہو گیا
کہتے تھے عابد رن پکڑے ہے بازو زور سے نیکی میں حیر اتنا تو سہارا ہو گیا
اس کو کہتے ہیں مروت حلم اس کا نام ہے دشمنوں کا قلم حضرت کو گوارا ہو گیا
شکر ہے رویا غم شہ میں لبو میں عمر بھر قطرہ خون میرے طالع کا ستارا ہو گیا
بے جاہلوں نے چھپایا مد توں کس کس طرح رفتہ رفتہ خون ناحق آشکارا ہو گیا
روضہ سرور کے گلہستے پہ جب رکھا قدم جھک کے دیکھا باغ جنت کا نظارہ ہو گیا
میں یہ سمجھا صرہ خاک شفا کو قبر میں کیا چراغ زندگی روشن دوبارا ہو گیا
کہتے تھے حضرت کبھی نیکی نہ کہتا تھا کوئی آ کے اس بستی میں یہ عالم ہمارا ہو گیا
اے تفتی حضرت صاحب کے جب چومے قدم آساں پھر میرے طالع کا ستارا ہو گیا (۱۶۸)

خنجر گل نبی کے گلے پر جو چل گیا باغ جہاں کا رنگ سلائی بدل گیا
آنسو جو آنکھ سے غم سرور میں ڈھل گیا ذر یتیم نور کے سانچے میں ڈھل گیا
صدے سے رنگ صغرا ناداں بدل گیا کھایا جو تیر سہم گئے دم نکل گیا
گھوڑے سے دو پہر کو زمیں پر گرے حسین جھک کر فلک سے نیر اعظم سنبھل گیا
چمکا ہماری قبر میں داغ غم حسین کیا خود بخود چراغ نئے گھر میں جل گیا
تڑپا جو کھا کے تیر کہا ماں نے صاحبو دریا کو دیکھ کر علی اصغر چل گیا

زینب محل سے رن کو یہ کہتی ہوئی چلیں
 بھائی کا دم بہن کا کلیجہ نکل گیا
 جب تک گلا کٹا یہی کہتے رہے حسین
 دنیا سے چلتے چلتے ذرا جی بہل گیا
 یہ شوق ذبح تھا نہ ہوئی شاہ کو خبر
 کب تیغ شمر چل گئی کب دم نکل گیا
 مرنے سے شاہدین کے قیامت ہوئی پیا
 انداز کربلاے معلی بدل گیا
 خیموں میں آگ لگ گئی زینب کا تھا یہ حال
 دامن جلا کسی کا گریبان جل گیا
 دیکھی وہ نزع میں شہ عالم کی نیکی
 شرمندہ قتل گاہ سے پیک اجل گیا
 سرکٹ چکا تو لاشہ سرور نے دی صدا
 شکر خدا کہ پیاس بھی دن بھی ڈھل گیا
 جب یہ سنا ہوا ہے مسافر کوئی ہلاک
 صغرا ہوئیں اداس کلیجہ دھل گیا
 ہنگام نزع فاطمہ کے پھول نے کہا
 اے تیغ شمر نکل مراد آج پھل گیا
 موسیٰ کا حال ہے تری قدرت کا آئینہ
 طفل صغیر خانہ دشمن میں پل گیا
 گھبراتے ہیں بلند مضامیں سے پست فہم
 اللہ کیا وقار سخن آج کل گیا
 جاناکہ ہے وہ عشق تمہارا طریق نظم
 گداز جو اس طرف سے کوئی خوں اُگل گیا (۱۶۹)

مرزا دبیر کے بعد ان کے صاحبزادے مرزا اوج (۱۸۵۳-۱۹۱۷) کے ہاں بھی سلام نگاری کی روایت موجود رہی۔
 سید سکندر آغا اوج کی سلام نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”مرزا اوج کے سلاموں میں وہی جذبات، جوش و خروش اور بلند آہنگی ہے جو ان کے مرثیوں میں

ملتی ہے۔ اس صنف سخن میں بھی وہ اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں۔“ (۱۷۰)

مرزا اوج کے ایک سلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

سلامی روز ماتم سے نہ سرگرم فغاں کیوں ہو
 نہوں آتش بیاں نالے تو مجلس میں دھواں کیوں ہو
 اسی کے لطف سے ہے ارتباط عالم امکان
 جودہ نامہریاں نکلے تو کوئی مہریاں کیوں ہو
 زمیں کیسی کہاں کے آسماں سب اس کے جو یا ہیں
 کہیں ملتا نہیں وہ بے نشان خاطر نشان کیوں ہو
 حجاب نور ہو یا آنکھ کا پردہ ہو جو کچھ ہو
 تمہیں تو ہو اگر دل میں تو کوئی درمیاں کیوں ہو
 شہادت دے رہا ہے امتزاج اپنے عناصر کا
 نہ ہو گر مرتبط کوئی تو ربط جسم و جاں کیوں ہو
 جو آئی دوست کی جانب سے لوں خوش خوش سر آنکھوں پر
 بلا میرے مقدر کی نصیب دشمنان کیوں ہو
 ہماری سرزمین حرص بربادی کو کافی ہے
 ملا کر خاک میں ہم کو گنہ گار آسماں کیوں ہو

عداوت اور خداوندی کی ساعت جب بہم شہری

تو اس ناچیز مشت خاک کا پھر امتحاں کیوں ہو (۱۷۱)

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر جنہیں ۱۳ مارچ ۱۸۵۶ کو معزول کر کے ثیا برج میں قید کر دیا گیا۔ انہوں نے بھی حالت اسیری میں سلام کہا اور اپنی رہائی کے لئے امام حسینؑ کو آوازدی:

سلام اُس پر جو مشہور ہیں زمانے میں حسینؑ کو گراں تھا جفا اٹھانے میں
حسینؑ قتل ہوئے جب تو کہتی تھیں زینبؓ کہ کتنی دیر ہے بھائی تمہارے آنے میں
کہا یہ بٹی سے شہ نے بس اب ہمیں چھوڑ بڑا مزا ہے سکینہؓ گلا کٹانے میں
کہا سکینہؓ نے جب سے ہوئے ہیں باپ شہید مزا نہ پانی میں پایا نہ لطف کھانے میں
جو کوئی کہتا تھا روؤ نہ کہتے تھے سچا مزا ملا ہے مجھے اشک غم بہانے میں
یہ بولے علیہ خستہ پنہائی جب زنجیر سب نہ ہوں گا میں اس بوجھ کے اٹھانے میں
یہ رہ میں عابدہؓ ناشاد کرتے تھے فریاد صدائے گریہ ہے زنجیر کے ہلانے میں
رہائی قید سے دلوؤ اس کو اے شہیدؑ

بہت ہی رنج ہے اختر کو قید خانے میں (۱۷۲)

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد برصغیر کی سیاسی بساط الٹ گئی اور انگریز جو پہلے بالواسطہ حکمران تھا اب برصغیر کا بلاشرکت غیرے حکمران بن گیا۔ اس بدلے ہوئے سیاسی تناظر میں شعروادب میں بھی تغیر و تبدل کی فضا نظر آتی ہے۔ اردو شاعری پر بھی ناقدین کی ترجیحی نظر پڑتی ہے لیکن ”سلام“ نہایت سلاست روی کے ساتھ ذکر محمدؐ و آل محمدؐ میں مصروف رہتا ہے چنانچہ علی میاں کامل، علی محمد عارف (۱۸۶۰-۱۹۱۶) بندہ کاظم جاوید لکھنوی (۱۸۶۲-۱۹۱۶) جدید لکھنوی (۱۸۷۷-۱۹۰۹) فاخر لکھنوی (۱۹۱۰) نظم طباطبائی (۱۸۵۳-۱۹۳۳) مرزا طاہر رفیع (۱۸۶۷-۱۹۳۸) صنی لکھنوی (۱۸۶۲-۱۹۵۰) ناطق لکھنوی (۱۸۷۲-۱۹۵۲) آرزو لکھنوی (۱۸۷۳-۱۹۵۱) فرید لکھنوی (۱۸۸۲-۱۹۶۹) خبیر لکھنوی (۱۸۹۷-۱۹۶۵) پیارے صاحب رشید (۱۸۸۲-۱۹۳۵) فائز لکھنوی (۱۸۸۹-۱۹۳۶) فائق لکھنوی (۱۸۸۷-۱۹۳۳) میر لائق لکھنوی (۱۸۹۳-۱۹۷۷) سید آل رضا (۱۸۹۶-۱۹۷۸) اثر لکھنوی (۱۸۸۵-۱۹۶۷) جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸-۱۹۸۲) بہزاد لکھنوی (۱۹۰۰-۱۹۶۵) نسیم امروہوی (۱۹۰۸-۱۹۸۷) سالک لکھنوی (۱۹۱۰-۱۹۷۷) فضل لکھنوی (م ۱۹۱۳) وغیرہ نے دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ ”سلام“ کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس صنف میں دورِ حاضر کے حوالے سے سانچہ کر بلا کو استعارہ بنا کر پیش کیا۔ ذیل میں مذکورہ شعرا کے بارے میں چند تمہیدی کلمات اور ان کے سلام کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

علی میاں کامل مرثیہ نگار تھے تاہم انہوں نے سلام بھی کہے بقول مہذب لکھنوی شعرو سخن بظاہر عمل پھر شغلِ تفریح بنتا رہا، نظم کی ہر صنف پر قدرت تھی (۱۷۳) اور بقول سکندر آغا مرثیے سے لگاؤ تھا اس لئے اس پر پوری توجہ رہی۔ (۱۷۴)

عزیز شام سے سو سو رہے بجھا کے چراغ

جلائے غیروں نے میری لحد پہ لا کے چراغ

گرا چکا تھا کنویں میں سواد جہل مجھے
 ولائے آل نے کی رہبری دکھا کے چراغ
 سیاہ کفر سے ہوتا تمام روئے زمیں
 اگر زمانے میں ہوتے نہ مصطفیٰ کے چراغ
 اسی حرم کی جلی حرمِ قدس میں ہے
 رواقِ عرش کی زینت ہیں کربلا کے چراغ
 ہوائے دہر کو گزرے نہ شاق اے کامل
 ہماری قبر سے رکھیں الگ ہٹا کے چراغ

علی محمد عارف سادات بارہہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے مراٹھی کی طرح سلاموں میں بھی مصطفیٰ رنگ نمایاں ہے ان کے
 سلاموں کا ”جواہر بے بہا“ ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

جو دور اندیش ہیں دنیا میں کب وہ گھر بناتے ہیں
 مکان مداح سرورِ خلد میں جا کر بناتے ہیں
 رضا بچوں نے جب مانگی تو زینبؑ سے کہا شہؑ نے
 غضب کی اب تو باتیں یہ مہ انور بناتے ہیں
 جنہیں عقل سلیم اللہ نے دی ہے زمانے میں
 دل دشمن میں بھی وہ دوستی سے گھر بناتے ہیں
 غم شہؑ میں کوئی آنسو جو لب تک آ گیا دھل کے
 کہا تسنیم سے آنکھوں نے یوں کوثر بناتے ہیں
 شک پڑتے ہیں آنسو یاد کر کے حال عابد کا

لرز جاتے ہیں جب زنجیر آہن گر بناتے ہیں (۱۷۵)

بندہ کاظم جادید لکھنوی غزل گو ہونے کے ناتے سلام گوئی پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ سلاموں میں ’غزل‘ کا خصوصی

غرض موجود ہے۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

زینبؑ کے پیر پیاس سے گھبرائے ہوئے ہیں
 دو پھول دم صبح سے مرجھائے ہوئے ہیں
 دھڑکن دل اصغرؑ میں ہے کیا بعد فنا بھی
 اب تک شہؑ دیں لاش کو لپٹائے ہوئے ہیں

دنیا کی کسی شے سے شہیدوں کو نہیں کام
 سب گرد بیاباں کے کفن پائے ہوئے ہیں
 حضرت کا یہ نقشہ ہے کہ غش آتے ہیں پیہم
 اکبر جو کلیجے پر سناں کھائے ہوئے ہیں
 جاوید یہی وقت ہے دل کھول کے پڑھ لے
 احباب جو ہیں خاص وہ سب آئے ہوئے ہیں

جدید لکھنوی غزل گو کے حوالے سے معروف شاعر تھے تاہم انہوں نے سلام کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ سلام کا نمونہ دیکھئے:

طفل سب پیاس کے شکوے جو کئے جاتے ہیں
 شاہ اشک آنکھوں میں بھر بھر کے پئے جاتے ہیں
 یا علی * ہم پہ بلا آئے کوئی کیا ممکن
 آپ کا نام شب و روز لئے جاتے ہیں
 قبر سے کہہ کے اٹھے شاہ کچھ اپنی نہیں فکر
 علی اصغر تمہیں ہم دفن کئے جاتے ہیں

فاخر لکھنوی ماہر لکھنوی کے بھتیجے تھے انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی اور سلام کی صنف کو بھی حصول ثواب کی خاطر اپنایا ان کے سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

دل سے جو پیرو علی * مرتضیٰ کا ہو گیا
 نار سے آزاد وہ بندہ خدا کا ہو گیا
 قتل کر کے ذوالفقار شہؒ یہ دیتی تھی صدا
 میں نے مارا نام لشکر میں قضا کا ہو گیا

.....

عمر بھر ہم آسمانوں کی جفا دیکھا کئے
 کیا تماشہ انقلاب دہر کا دیکھا کئے
 سنتے آئے تھے جو فاخر یہ ملی جنت سے ہے
 غلد میں بھی کربلا کا راستا دیکھا کئے

نظم طباطبائی براہ راست لکھنؤ سے تعلق نہیں رکھتے تاہم انہیں اس لئے لکھنؤی سلام نگاروں کی صف میں شامل کیا گیا ہے کہ ان کی شاعری میں لکھنویت کے عناصر نسبتاً زیادہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر اشرف رفیع:

”جب ہم طباطبائی کی شاعری میں دبستان لکھنؤ کی تلاش کرتے ہیں تو یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ کلام بنیادی طور پر لکھنؤی ہے لیکن اس پر لکھنؤ اور اس کے باہر کے عوامل اور عناصر کے اثرات نمایاں ہیں۔“ (۱۷۶)

نظم طباطبائی نے غزل کے ساتھ ساتھ سلام کی صنف کی آبیاری بھی کی ہے جس میں رنگ تغزل نہایت گہرا ہے۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

رونے سے جگر آب ہے اور دیدہ تر آب دل ڈوبے نہ کیونکر ہے ادھر آپ ادھر آب
جوش آگیا دریا میں جو عباس کو دیکھا تھا شور کہ لو کھنچ کے چلا سوئے قر آب
ہوتی ہے غم شام میں یوں اشک کی رونق جس طرح جلا دینے سے پاتا ہے گہر آب
شہ تیغ لگائے ہیں عدو کھینچے ہیں خنجر یہ تابہ گلو خون ہے وہ تابہ کمر آب
رحمت کا تری جوش ہے دوزخ سے زیادہ تاحد ادب نار ہے تاحد نظر آب
چلاتی تھی دیوڑھی سے سکینہ کے پچھا جان
پھر آؤ نہیں مانگتی یہ تھنہ جگر آب (۱۷۷)

مرزا طاہر رفیع دبستان دبیر کے اہم سلام نگار تھے۔ اگرچہ ان کے سلام میں انہیں اور دبیر دونوں اساتذہ کے محاسن جمع ہو گئے ہیں۔ وہ اس عہد میں پیدا ہوئے جب عزائی ادب میں فکری عناصر داخل کئے جا رہے تھے چنانچہ مرزا دبیر کے پوتے اور اوج کے بیٹے مرزا طاہر رفیع نے اردو سلام کی روایت میں عہد حاضر کے مسائل بھی شامل کئے تاہم ڈاکٹر ہلال نقوی رفیع کو ان کے والد اوج سے کم تر درجے کا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان کے والد مرزا اوج نے اپنے والد مرزا دبیر سے بعض اعتبار سے رشتائی شاعری کے میدان میں قدم آگے بڑھایا لیکن رفیع اوج سے کئی قدم پیچھے چلے گئے۔“ (۱۷۸)

مرزا طاہر رفیع کے ایک سلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

عشق والو شان معراج پیسیر دیکھنا
قرب اللہ و نبی اللہ اکبر دیکھنا
ہو رہا ہے عاشق و معشوق میں راز و نیاز
کون ہے پردہ کے اندر کون باہر دیکھنا

صفی لکھنؤ

شاعری نے لکھنؤ کی

آزمائی کی۔ ان

کے بارے میں لکھا

اسی طرح کے خیالا

صفی لکھنؤ

ہا

سے

م

صورت اکبر رسول اللہ کی تصویر ہے نام بھی کیا نام ہے جو داخل تکبیر ہے
 روز قتل ادنیٰ یہ صبر حضرت شہید ہے ہے زباں پر شکر حق گردن تہہ شمشیر ہے
 کیا کسی کے سامنے پھیلائے دست طلب شرم دامن گیر ہے ہمت گریباں گیر ہے
 دے رہا ہے ساقی کوثر مرا بھر بھر کے دم

زیر طوبیٰ مجمعِ مستانِ ساغر گیر ہے (۱۸۱)

ناطق لکھنوی کو لکھنؤ کے آخری دور میں وہی درجہ حاصل ہے جو اردو زبان کی صفائی ستھرائی میں ناسخ کو دیا گیا ہے۔
 ناطق نے اردو زبان کی تہذیب میں نمایاں کردار ادا کیا اور غیر فصیح اور غیر مہذب الفاظ و تراکیب کو نکال باہر کیا۔ ناطق نے غزل
 کے علاوہ اردو سلام گوئی میں بھی نام کمایا ذیل میں ان کا ایک سلام نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

مجرئی کہتے تھے سجاد کہ بیمار ہوں میں
 باپ کے مرنے سے کیا دکھ میں گرفتار ہوں میں
 رو رو کہتے تھے لعینوں سے خدا کو مانو
 مت ستاؤ مجھے رنجور و طول افکار ہوں میں
 پاؤں میں بھاری ہے زنجیر گلے میں ہے طوق
 اب قدم اٹھتا نہیں کیا کروں لاچار ہوں میں
 ہاتھ رسی سے مرے باندھے ہیں کیوں تم نے بھلا
 کیا گنہ گاروں کی مانند گنہ گار ہوں میں

آرزو لکھنؤ اساتذہ کی صف میں شامل تھے۔ انہوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ آرزو کا شعری نسب نامہ
 جلال اور رشک سے ہوتا ہوا ناسخ تک جا پہنچتا ہے۔ آرزو لکھنوی نے اردو غزل کو ”خالص اردو“ زبان عطا کی بالخصوص ان کا سلام
 اور مرثیہ خالص اردو کے فنکارانہ استعمال سے مملو ہے۔ محمد علی خاں رام پوری آرزو لکھنوی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اُن کی تمام تر شاعری میں بنیادی روح زبان کی طہارت و صفائی ہے وہ اپنے شاگردوں کو

مشورہ دیا کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے زبان کے لوج کو کم نہ ہونے دیجئے۔“ (۱۸۲)

آرزو لکھنوی کی شاعرانہ عظمت بالخصوص ان کی سلام نگاری کو ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے

لکھا ہے:

”آرزو کے کہے ہوئے سلاموں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ایسے سلام کا طرہ امتیاز

ہوتی ہیں۔ یعنی غزل کی طرح ان کے سلاموں میں بھی اعلیٰ درجے کے مضامین و ارداتِ قلبیہ

اور معاملات ذہنیہ ہوتے ہیں مگر خوبی یہ ہے کہ کہیں غزلیت کا رنگ پیدا نہیں ہوتا۔“ (۱۸۳)

ڈاکٹر حسینی شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آرزو لکھنوی جس طرح اردو کو خالص اردو رکھنے پر کمر بستہ تھے ویسے ہی وہ سلام کو ’خالص سلام‘ کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے تھے تاہم ’غزلیت‘ کا رنگ ہونے یا نہ ہونے پر مقالہ نگار بحث کا حق رکھتا ہے کہ ’سلام‘ کو اردو غزل نے اپنا سب کچھ دے کر اسے ادبی مقام تک پہنچایا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس موضوع پر بحث جاری ہے (باب سوم) ذیل میں آرزو لکھنوی کے سلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

کون سی بی بی بجز نہنٹ ہے اس توقیر کی ہو جدھر راجع وراثت چادر تطہیر کی
جس کی ساری زندگی وقف رضائے کبریا جس کی ہر اک سانس میں آواز ہے تکبیر کی
جمع ہیں اک ذات میں بچپن ہی سے دو وصفات انگلیاں زہرا کی ہیں طاقت ہے خیر گیر کی
دور تھا باب اثر کوتاہ تھا دست دعا فاطمہؑ نے بخش دی ادراک کڑی زنجیر کی
کی تھی بہر آل جو خالق سے احمدؑ نے طلب آگئی لو اور اک حقدار اس جاگیر کی
آئینہ ہو جائیں گے جو رو جفا ہر دور کے مظہر حق ہے بدلتی شان اس تصویر کی
ہیں گلے پر بھائی کے حسب وصیت خشک لب بو پینہ دے رہا ہے فاطمہؑ کے شیر کی

باپ کی گردن کا ہے بیٹی کے بازو پر نشان

پا گئی ورثہ برابر کا بہن شبیرؑ کی (۱۸۴)

پیارے صاحب رشید کے کلام میں خانوادہ انیس کے محاسن جھلک رہے ہیں۔ انہوں نے مرثیہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اردو سلام میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے بعض سلاموں میں ان کی غزل کا سار چاؤ ملتا ہے جو ان کے قادر الکلام غزل گو ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے ہاں اسوۂ شبیرؑ سے اخلاقیات کا درس دینے کی روایت موجود ہے جو انہیں جدید سلام نگاروں سے قریب کر دیتی ہے۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

کیا لے کے خاک تربت سرور بنائیں گے دل اور ایک دل کے برابر بنائیں گے
کرتے ہیں جمع اشک ہمارے ملائکہ حوروں کے کان کے لئے گوہر بنائیں گے
حداد روتے جاتے ہیں لوہا کیا ہے نرم قتل حسین کے لئے خنجر بنائیں گے
شہ دامن رضائے خدا کو یہ دیں گے طول اپنا کفن مزار کی چادر بنائیں گے
ٹوٹے ہیں دل غریبوں کے پانی نہیں ملا یہ جام بیخہ کر لب کوڑ بنائیں گے
کر کے حسن کو خلق ہوا حکم کردگار اک فخر خاندان شبیر بنائیں گے

ہو جائے غرق کشتی اُمتِ مہال کیا شبیرؔ اپنے صبر کو لنگر بنائیں گے
کہتی تھی ذوالفقار نہ تھی مجھ کو یہ خبر شبیرؔ مجھ سے تربت اصغرؔ بنائیں گے
مضمون نکال جاؤ ہزاروں تم اے رشیدؔ

گلدستے ان گلوں کے سنخور بنائیں گے (۱۸۵)

پیارے صاحب رشید کے بھانجے فرید لکھنوی مرثیہ اور سلام کے شاعر تھے ان کے سلاموں میں بھی رٹائی عناصر کے
ساتھ ساتھ غزل کے بعض عناصر کی جلوہ گری سے بھی انکار ممکن نہیں ایک سلام دیکھئے:

غمِ شہ میں نہ کیوں ہم جان دیں اہلِ ولا ہو کر
لبو رویا گلے سے خنجر قاتلِ جدا ہو کر
امامِ عصر تھے وقتِ نماز آیا جو زنداں میں
گری عابدؔ کی بیڑی جھٹڑی خود سے جدا ہو کر
خدا کیونکر نہ بخشے اُمتِ عاصی کو نانا کی

نوا سا جب گلا کٹوائے مصروفِ دعا ہو کر (۱۸۶)

مرزا اوج کے شاگرد سید سرفراز خیر لکھنوی کا شمار بیسویں صدی کے اہم مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے تاہم ان کے سلام بھی
ادبی اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔ خیر سلام گوی کے تقاضوں سے خوب باخبر ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین خیر کے فن شاعری کے
بارے میں لکھتے ہیں:

”اوج مرحوم کو فن پر جو عبور حاصل تھا وہ کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ خیر نے فن کی ان معلومات

کو ایک باذوق شاعر کی حیثیت سے استعمال کیا اور یہ بڑی بات ہے۔“ (۱۸۷)

عرفان عباسی نے خیر لکھنوی کو انیس و دہرے کے زمانے کی مرثیہ گوئی کا امین قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”خیر صاحب‘ سلسلہ دہرے کے شاید آخری مرثیہ گو تھے..... انہیں جزئیات کے بیان پر قدرت

کاملہ حاصل تھی جو ایک زمانے میں مرزا انیس و دہرے کا طرہ امتیاز رہی تھی۔ وہ غزل، نظم، سلام،

مرثیہ، حمد و نعت، قطعہ رباعی وغیرہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ معنوی بلاغت،

شوکت الفاظ، دلاویزی صحت کی درستی، منظر نگاری و وسعت نظری، محاوروں کا بر محل استعمال ان

کے کلام کی خصوصیات ہیں۔“ (۱۸۸)

خیر کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ اس سلام میں خیر کا فن زبان حال سے گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔

گلہ پھر کیوں خطا کاروں کا دل میں بحر و بر رکھے

مُر ذی جاہ نادم ہو کے جب قدموں پہ سر رکھے

سلوک ایسا ہی ہوتا ہے فلک کیا حق پرستوں سے
 کوئی خنجر اٹھائے اور کوئی سجدہ میں سر رکھے
 ادب سے یوں جگہ نیزے نے دی فرق شدہ دیں کو
 کوئی جس طرح سے قرآن کو بالائے سر رکھے
 عیاں ساحل پہ اب تک قبضہ عباۃ غازی ہے
 علیؑ کا شیر سوتا ہے کنارے نہر سر رکھے
 جو آنسو میری آنکھوں سے گرے تھے شدہ کے ماتم میں
 تو زہراؑ نے وہ چن کر اپنے دامن میں گھر رکھے
 خنجر آنے نہ پائے غیر کے مضمون کا پر تو بھی
 خیال اس کا ہر اک شاگرد ادب نامور رکھے (۱۸۹)

خانوادہ انیس سے تعلق رکھنے والے دولہا صاحب عروج میرنہیس کے فرزند تھے۔ عروج نے شاعری کا آغاز ہی سلام
 نگاری سے کیا۔ پھر مرثیے کی جانب آئے۔ عروج کی سلام گوئی کی خصوصیت ہے کہ ان کے سلام مقبلی زیادہ ہیں۔ مکی اور رثائی
 عناصر نسبتاً کم نظر آتے ہیں۔ جو اس عہد کی جدید ادبی تحریکوں کا اثر معلوم ہوتا ہے اس کے باوجود انہوں نے انیس اور اپنے والد
 نہیس کی سلام نگاری کے رنگ کو بہر حال قائم رکھا۔ (۱۹۰)

خورشید حسن دولہا صاحب عروج کے ایک سلام کے چند اشعار نمونہ کے طور پر دیکھئے:

مدح اہل بیتؑ کی فردوس میں گھر لے لیا
 اور اب کیا لیں گے جنت لے لی کوثر لے لیا
 اللہ اللہ یہ غلامی علیؑ کا ہے شرف
 مشکلیں حل ہو گئیں جب نام قبر لے لیا
 جب چلے مرنے کو ہم شکل نبیؐ بولے حسینؑ
 اذن ماں سے جنگ کا اے لال کیونکر لے لیا
 تیغ کیسے رکھنے لگا جب شمر حلق شاہ پر
 کہہ کے بسم اللہ ماں نے گود میں سر لے لیا
 شرمسار ایسا ہوئے اپنے گناہوں سے عروج
 منہ پہ اپنے گوشہ دامان محشر لے لیا (۱۹۱)

عزیز لکھنوی، لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل کے حوالے سے معروف ہیں چنانچہ ڈاکٹر ابوالیث صدیقی انہیں لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل کی یادگار قرار دیتے ہیں (۱۹۲) عزیز لکھنوی کا شمار یوں تو غزل گو شعرا میں ہوتا ہے لیکن ان کے مرثیے اور سلام بھی قابل توجہ ہیں۔ جدید مرثیے کے ابتدائی نقوش اُجاگر کرنے والے مراثنیٰ ہیں۔ عزیز لکھنوی کا مرثیہ ”داس وفا“ خصوصیت کا حامل ہے۔ اردو سلام نگاری کو جدید تقاضوں سے آہنگ کرنے والوں میں عزیز لکھنوی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ یوں ان کا ”سلام“ قدیم اور جدید سلام نگاری کا عبوری ”سلام“ محسوس ہوتا ہے۔ عبدالرؤف عروج نے عزیز لکھنوی کو اردو کے اہم سلام نگاروں میں شامل کیا ہے۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

شہید اعظم و فخر الم سلام علیک غریب کشتہ تیغ ستم سلام علیک
فروغ دورہ ختمی مآب نور اللہ بختہ شاہ جمیل دشیم سلام علیک
رہ خدا میں سرو تن سے کام آیا تو کریم و رہبر اہل کرم سلام علیک
مسح دین محمد مجدد اسلام ضیا فراز شہستان غم سلام علیک
فراز نوک سناں تیرے واسطے معراج بلند مرتبہ عالی صمم سلام علیک
شہید آل محمد خلاصہ ایجاد نوادہ نبی محترم سلام علیک
ابوالائمہ الاطہار سید الشہداء صحیفہ شرف مختتم سلام علیک
طواف کرتے ہیں جس کا ملائکہ شب و روز وہ تیرا کعبہ نقش قدم سلام علیک
ہر ایک زخم میں فردوس معرفت پنہاں بہار دین کی سر تا قدم سلام علیک
ہر اک مصیبت عظمیٰ کا خاتمہ تجھ پر خدائے لذت ذوق ستم سلام علیک

عزیز بھی ہے طلب گار تیری نصرت کا

امین و مونس ارباب غم سلام علیک (۱۹۳)

خورشید حسن دولہا صاحب عروج کے فرزند فائز لکھنوی نے مرثیہ اور سلام نگاری میں طبع آزمائی کی تاہم ان کا بیشتر کلام زیور طباعت سے محروم رہا۔ فائز لکھنوی کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

بشر کوئی علی " کے رتبہ اعلیٰ کو کیا سمجھے
خدا کے بعد اگر سمجھے تو محبوب خدا سمجھے
بہت بندے ہیں ایسے بھی جو حیدر کو خدا سمجھے
مگر ہم کشتی دین نبیؐ کا نا خدا سمجھے
خدا سے جس نے جو مانگا علیؑ کے ہاتھ سے پایا
بتاؤ منکر و اب معنی دست خدا سمجھے

بابو صاحب فائق لکھنوی میر علی محمد عارف لکھنوی کے فرزند تھے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے خاندان انیس کے نامور شعراء میں فائق کے ۲۲ سلاموں کی نشاندہی کی ہے۔ فائق کے سلام میں ان کے خانوادے کے سلاموں کا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔ فائق کا ایک سلام سید علی رضوی نے بھی اپنی کتاب ”حسین پر سلام“ میں شامل کیا ہے۔ اس سلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

سوئے کوثر طرب میں جھومتے عے خوار آتے ہیں
مئے حب علیؐ کے مست پھر ہشیار آتے ہیں
لحد میں روشنی پھیلی فرشتوں نے کہا مجھ سے
ذرا ہوشیار ہو جا حیدر کراڑ آتے ہیں
علیؐ کی بیٹیاں ہیں اشتران بے کجادہ پر

مہار اونٹوں کی پکڑے عابدؐ بیمار آتے ہیں (۱۹۴)

میر عارف لکھنوی کے صاحبزادے میر لائق لکھنوی کا شمار بھی لکھنؤ کے عزائی ادب تخلیق کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مرثیہ، غزل اور سلام میں طبع آزمائی کی۔ ان کے ہاں انیس اور عارف کا رنگ سخن جلوہ گر ہے۔ لائق کے ایک سلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس میں عزائی ادب کی جملہ صفات یکجا نظر آتی ہیں:

چشم فلک نے دیکھا کب ظلم اس طرح کا
اولاد فاطمہؑ کے بازو تھے اک رن میں
ہے راہ دل سے دل کو یہ بات ہے مسلم
گریاں وطن میں صغریٰ اصغر تپاں ہیں رن میں
وقت وداع اکبر بولے ملک فلک پر
بلبل چپک رہا ہے گلزار پنچتن میں

سید آل رضا کو جدید مرثیے کا بانی ہونے کا اعزاز حاصل ہے وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۲۰ میں سلام کہنے لگے۔ ۱۹۳۵ تک ان کی سلام نگاری کا شہرہ عام ہو گیا۔ وہ عظمت آل رسولؐ کے حوالے سے انسان کی عظمت کو ابھارتے ہیں۔ انہوں نے نجم آفندی کے نوحوں سے اثر قبول کیا اور سلام نگاری کے ذریعے قوم کی بیداری کا فریضہ انجام دینے کی کامیاب کوشش کی۔ آل رضا نے اگرچہ غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا تاہم آخری عمر میں صرف رباعی، سلام اور مرثیہ تک محدود ہو گئے۔ ان کی زندگی میں سلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے آل رضا کے ۴۹ سلام تلاش کر کے انہیں ”باقیات آل رضا“ میں شامل کر کے شائع کر دیا ہے۔ (۱۹۵)

آل رضا کے پہلے سلام کا مطلع ملاحظہ کیجئے:

دل سوزِ محبت سے جل جانے کا کیا کہنا
شع غم سرور کے پروانے کا کیا کہنا (۱۹۶)

سید آل رضا کا ایک سلام نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

حسینی صف سے کیا تنویر خون ہاشمی نکلی
کبھی شکل نبیؐ نکلی کبھی شکل علیؑ نکلی
دعائیں دے زمانہ استرجاع بوترابی کو
در خیر حکم نان جویں کتنی قوی نکلی
یقین محکم ہے آل مصطفیٰ کی ناخدائی کا
یہ وہ کشتی نہیں ہے جو کبھی ڈوبی کبھی نکلی
بڑے جلوے دکھائے تابش خون محمدؐ نے
سیاہی جس جگہ چھائی وہیں سے روشنی نکلی
کیا وہ معرکہ سرہم شاہ شہیداں نے
مصیبت عارضی نکلی قیادت دائمی نکلی
افق سے کربلا کے ناصران شاہ یوں چمکے
کہ ہر دم اک نبی طرز حسینؑ ابن علیؑ نکلی
جہاں تک انفرادی عمر فانی کھینچ لائے تھے
وہیں سے اجتماع زندگی ہی زندگی نکلی
مسلمانوں نے دلہند نبیؐ کو یوں کیا گھائل
دل اسلام سے اب تک نہ برچھی کی انی نکلی
چھڑاتی جا رہی ہے لاش سے بابا کے وہ بچی
ابھی جلتے ہوئے خیمے سے جو سہی ہوئی نکلی

رضا یہ داغ ماتم لے کے ہم بھی کربلا پہنچے

ارے ان ملکبے پھولوں میں کتنی تازگی نکلی (۱۹۷)

سید آل رضا نے 'سلام آخر' کے عنوان سے جو کلام پیش کیا ہے اسے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے 'نظم' کی صنف میں شامل کیا ہے۔ (۱۹۸) شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام غزل کے بجائے مثنوی کی ہیئت میں کہا گیا ہے جبکہ سید علی رضوی اسے سلام قرار دیتے ہیں چنانچہ انہوں نے اسے "حسینؑ پر سلام" میں شامل کیا ہے۔ مقالہ نگار کے خیال میں آل رضا کے اس کلام میں رثائی رنگ یہی ہے اور آرزو لکھنوی کے سلام مسلسل کی روایت کی توسیع بھی۔ چنانچہ محض غزل کی ہیئت میں نہ ہونے کے باعث اسے سلام کی قلمرو سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ سلام سے رونے رُلانے کی روایت بھی عزائی ادب میں موجود ہے۔ اس لئے مقالہ نگار کے نزدیک یہ سلام ہے۔ ذیل میں ملاحظہ کے لئے یہ سلام پیش کیا جاتا ہے۔

سلام آخر

سلام خاک نشینوں پہ سگواردوں کا
غریب دیتے ہیں پر سہا تمہارے پیاروں
سلام اس پہ جو زحمت کش سلاسل ہے
مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
سلام ان پہ جنہیں شرم کھائے جاتی ہے
کھلے سروں پہ اسیری کی خاک آتی ہے
سلام بھیجتے ہیں اپنی شاہ زادی پر
کہ جس کو سوئپ گئے چلتے وقت گھر سرور

مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھائی ثار کر دیئے بچے نہ بچ سکا بھائی
 اسیر ہو کے جسے شامیوں کے زرفے میں حسینیت ہے سکھانا، علیؑ کے لہجے میں
 سیکھنے "بی بی" تمہارے غلام حاضر ہیں بجھے جو پیاس تو اشکوں کے جام حاضر ہیں
 یہ سن، یہ حشر، یہ صدے نئے نئے بی بی کہاں پہ بیٹھی ہو خیمے تو جل گئے بی بی
 پہاڑ، رات بڑی دیر ہے، سویرے میں کہاں ہو شام غریباں کے گھپ اندھیرے میں
 زمین گرم، یتیمی کی سختیاں، بی بی وہ سینہ جس پہ ہوتی تھیں، اب کہاں بی بی
 جنابِ مادر بے شیر پر بھی سب کا سلام عجب وقت ہے کیا دیں، تسلیوں کا پیام
 ابھی کلیجے میں اک آگ سی لگی ہو گی ابھی تو گود کی گرمی، نہ کم ہوئی ہو گی
 نہیں اندھیرے میں کچھ سوچتا کہاں ڈھونڈیں تمہارا چاند کہاں چھپ گیا، کہاں ڈھونڈیں
 نہ اس طرح کوئی کھیتی، ہری بھری اجڑی تمہاری ماگ بھی اجڑی ہے، کوکھ بھی اجڑی
 نہیں لعینوں میں انسان کوئی، خدا حافظ درندے اور یہ بے وارثی، خدا حافظ
 شریکِ حق، درود و سلام، پیغمبر سلام، سید لولاک کے لئے گھر پر
 سلام تم پہ، رسول و بتوں کے پیارو سلام، مہر شہادت کے گرد، سیارو
 سلام محسن، اسلام، خستہ تن لاشو سلام، تم پہ شہیداں کے بے کلمی لاشو
 بچے، تو اگلے برس ہم ہیں، اور یہ غم پھر ہے جو چل بے تو یہ اپنا سلام، آخر ہے (۱۹۹)

عزیر لکھنوی کے شاگرد رشید اثر لکھنوی نے مرثیہ اور سلام ایسی اصنافِ سخن کو نئے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔
 جوش ملیح آبادی نے اثر لکھنوی کی موت کو لکھنوی کی روشنیوں کا گل ہونا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”حضرت عزیر لکھنوی کے قابلِ ناذ شاگرد، مجھ، بیچِ مدان کے استاد بھائی، علم عروض و فنِ شاعری
 کے مرکزی استاد فارسی و انگریزی ادب کے زبردست فیاض، قلمِ انسانیت کے منارہ ضو بار،
 منبرِ انتقاد کے خطیبِ اعظم، مسندِ زبان کے قاضی القضاہ اور مدینہ تہذیب لکھنؤ کے طاقِ زریں
 کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے جن کے گل
 ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے۔ (۲۰۰)

بہزاد لکھنوی حمد، نعت اور سلام کے حوالے سے مصروف ہیں۔ اگرچہ انہوں نے دیگر اصنافِ سخن غزل، گیت اور نظمیں
 بھی کہی ہیں۔ بہزاد کے سلاموں میں مقہوتی رنگ نمایاں ہے جو ان کے نعتیہ مزاج کا اثر ہے۔ ایک سلام کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:

جو سرتاجِ زماں شاہ شہیداں ہے سلام اس پر
 جو کلِ اسلام کا مقصودِ ایماں ہے سلام اس پر

جو اہل کیف کی منزل ہے اہل ذوق کا مرکز
 جو اہل عشق کا مقصود و ارماں ہے سلام اس پر
 حیات نو ملی اسلام کو جس کے تقدس میں
 جہان راسخی پر جس کا احساں ہے سلام اس پر
 فنا کا راز جس نے آشکارا کر دیا سب پر
 بقا جس کے جلو میں خود خراماں ہے سلام اس پر (۲۰۱)

سالک لکھنوی کا شمار دبستان لکھنوی کے آخری دور کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی پہچان ان کی لکھنوی انداز کی غزل ہے۔ لیکن اصلاح غزل کی آرزو لکھنوی کی تحریک کے زیر اثر سالک کی غزل روایتی لکھنوی غزل کے معائب سے پاک ہو گئی ہے۔ سالک نے اپنی غزل گوئی کے فن کو اپنی سلام نگاری میں بھی استعمال کیا ہے۔ ذیل میں ان کے ایک سلام سے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

طلب جو آبِ شہ تشنہ کام کرتے تھے
 سمجھوں سے حجت خالق تمام کرتے تھے
 حسینِ حلق بریدہ ہے راہ میں ہر گام
 کلام پاک کی تبلیغ عام کرتے تھے
 کمال صبر یہ تھا سختیوں کی منزل میں
 زمیں پہ شکر کے سجدے امام کرتے تھے
 زمیں لرزتی تھی نالوں سے گونجتا تھا وہ دشت
 حرم حسین کے جس جا قیام کرتے تھے
 بوقت قتل بھی سوکھی زباں سے اے سالک
 دعائے بخشش اُمت امام کرتے تھے (۲۰۲)

فضل لکھنوی اپنے دیوان ”معیار غزل“ میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے نوجوانوں اور سلاموں کے اب تک ۴۹ مجموعے چھپ چکے ہیں (۲۰۳) فضل نے اپنے سلاموں میں کربلا سے متعلق ہر موضوع کو بیان کیا ہے۔ فضل کی سلام نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے سید وحید الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

”اس نے اپنی فکر سے قوم کو اور اپنے تخیل سے اردو زبان کو ایک وسعت، ایک بلندی اور ایک مقام بخشا ہے۔ اس نے سوئی ہوئی قوم کے تصور حیات کو کربلا کی زندگی کے دامن سے ملا دیا

ہے۔ وہ کر بلا کی خواہش محض عقیدت مندی کی بناء پر نہیں کرتا بلکہ اقبال کی طرح اس زندگی اور زندگی کی ہماہمی اس دشتِ تمنا میں نظر آتی ہے جہاں موت زندگی سے زیادہ حسین ہو گئی ہے۔“ (۲۰۴)

مجموعی جائزہ

اردو شعروادب کی طرح اردو سلام کا آغاز بھی دکن میں ہوا۔ دکنی ریاستوں کے حکمران اور عوام کی رٹائی ادب کی سرپرستی اور داد و دہش کی بدولت مرہٹے کے ساتھ سلام بھی رواج پانے لگا۔ سلام گوئی اگرچہ ایامِ عزائم میں غزل کے بدل کے طور پر معرضِ وجود میں آئی تاہم بتدریج اسے ایک منفرد اور علیحدہ صنفِ سخن کا درجہ حاصل ہو گیا۔ دکن میں قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت میں عزائی ادب سے دلچسپی کا جو آغاز ہوا وہ سلطنتِ آصفیہ کے زوال تک مسلسل ارتقائی منازل طے کرتا رہا چنانچہ گول کنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے مغل حکومت میں مدغم ہو جانے کے بعد وقتی طور پر سلام اور مرثیہ کی تخلیق میں جو رفتاری کمی واقع ہوئی تھی وہ آصف جاہی دور میں پھر سے تیز رفتاری میں بدل گئی اور حیدر آباد کے ادب دوست حکمرانوں کا دربار ”دربارِ دریا ز“ بن گیا جہاں غزل گو شعرا کے علاوہ سلام اور مرثیہ گو شعرا بھی موجود تھے۔

سلام کی روایت دکنی ریاستوں پر مغل حکمرانوں کے قبضے کے بعد شمالی ہند پہنچی جہاں اسے دہلوی شعرا نے پالا پوسا اور یوں دہلوی شعرا کو سلام نگاری کے حوالے سے لکھنؤ کے شعرا پر تقدم حاصل ہے۔ انہی شعرا کی لکھنؤ آمد سے جہاں دیگر اصنافِ شعر و سخن نے لکھنؤ میں مقبولیت حاصل کی وہاں اردو مرثیہ اور سلام کی فصل بھی پک کر تیار ہو گئی چنانچہ جب دہلی پر بیرونی حملوں نے قیامتِ صغریٰ پھا کر دی تو شعرا غمِ حسین کے ساتھ اپنے ذاتی غموں کو ساتھ لئے لکھنؤ پہنچے ان میں اپنے عہد کے اساتذہ مثلاً میرؔ سودا، میر حسن، مصحفی، میر سوز اور انشا کے نام شامل ہیں۔ خوش قسمتی سے نواب آصف الدولہ شیعہ عقائد کا مالک تھا۔ اس نے قلی قطب شاہ کی طرح محرم اور عزاداری کی سرکاری سرپرستی کی۔ نواب آصف الدولہ کی دلچسپی دیکھتے ہوئے عوام بھی اسی رنگ میں رنگے گئے اور جاجا امام بارگاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ محرم کی مجالس میں پڑھنے کے لئے مرہٹے اور سلام ضروری تھے اس لئے دہلوی شعرا کے مرثیوں اور سلاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ جب عزاداریاں دربار سے گھروں میں منتقل ہونے لگیں تو سلام و مرثیہ کے غیر معمولی فروغ کے امکانات روشن ہو گئے۔ عزائی ادب کی عوام اور خواص کی جانب سے پذیرائی کو دیکھتے ہوئے ایسے شعرا بھی میدان میں اترے جن کا مقصد حصولِ داد و دہش اور حصولِ زرت تھا تاہم حصولِ ثواب کی غرض سے بھی سلام کہا جاتا رہا اور ایسے شعرا بھی موجود تھے جو مرثیہ نگار تو نہ تھے البتہ خود کو استاد کی درجے پر فائز کرنے کے لئے سلام کہنا ضروری خیال کرتے تھے۔ یوں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی محرم کی مجالس میں شریک ہونے لگے اور ہندو مسلم سلام گو شعرا نے سلام کی روایت کو مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

آصف جانی دور حکومت میں بہن برس رہا تھا۔ اس فارغ البالی اور ذہنی آسودگی کے باعث عوام شعر و شاعری کو قوت گزاری کا محبوب مشغلہ سمجھنے لگے۔ محرم کی یکم سے چہلم تک مسالوں اور مرثیہ کی مجالس کا اہتمام خصوصی طور پر کیا جاتا۔ اس فضا میں اردو سلام میں منقبتی عناصر نسبتاً زیادہ نظر آنے لگے تاہم حمد و نعت اور منقبت نے ساتھ ساتھ رونے رلانے کے لئے رٹائی اشعار بھی سلام کا حصہ رہے۔ سودا نے سلام کو ایک اہم صنفِ سخن کا درجہ دے کر اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور یوں سلام بھی قابل توجہ ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ناخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے جہاں غزل کو متاثر کیا وہاں غزل کا بدل سلام بھی ادبی سان پر چڑھایا گیا اور سلام گو شعر ادبی محاسن کا خیال رکھنے لگے۔ انیس نے مرثی میں رزم و بزم کے جن عناصر کا اضافہ کیا ان کے اثرات سلام نگاری پر بھی مرتب ہوئے اور سلام میں اعتقاد کے ساتھ اخلاقیات کا عنصر بھی نمایاں ہو گیا۔ اس دور کے سلاموں میں انیس و دبیر کی فن کارانہ صلاحیتوں نے بہت سے اضافے کئے اور سلام محض اعتقادی صنف نہ رہا اگرچہ رٹائی لہر اس کے جسم میں دوڑتی رہی۔ انیس نے مرثیے اور سلام میں جس طرز نو کا آغاز کیا دبیر اس سے دامن بچا کر نکلے چنانچہ ضمیر کی روایت کو تھامے رہے اور سلام کی قدیم روایت کو برقرار رکھا۔ دبستان انیس اور دبیر سے تعلق رکھنے والے شعرا نے سلام کی روایت کو آگے بڑھایا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر کی پوری فضا ماتمی ہو گئی۔ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سلام نگاروں نے امید کی کرن دکھائی اور اسوۂ حسینیؑ کے ذریعے عوام میں بیداری اور عزم کی لہر دوڑادی۔ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے پس منظر میں سلام نگاری کا بڑا حصہ ہے۔ اب مرثیہ اپنی طوالت کے باعث سلام میں سمٹ آیا اور برصغیر کے مخصوص سیاسی و سماجی حالات میں سلام نگاری مقبول ہونے لگی۔ جہاں تک سلام میں فکری رو کے آغاز کا تعلق ہے تو اس حوالے سے مرزا اوج اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ان کے ہاں شہادت حسینؑ محض ایک واقعہ نہیں اور کر بلا کی منظر نگاری مقصد سلام نہیں بلکہ وہ اس سانحہ کے اسباب و علل اور نتائج و اثرات کو سلام میں بیان کرنے کے حق میں ہیں۔

اردو سلام ۱۹۳۶ء کے بعد ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوا۔ لکھنؤ سے ترقی پسند شاعری کا جو آغاز ہوا اس کے اثرات سلام پر بھی پڑے اس نئی طرز فکر نے سانحہ کر بلا کو ایک نئے طرز احساس سے آشنا کیا۔ اب حکومت وقت ’یزید‘ ٹھہری اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اسوۂ شیریؑ کا اتباع قرار دیا گیا۔

آرزو لکھنوی اور ان کے شاگرد آل رضانے سلام مسلسل کی تکنیک اپنائی۔ آل رضا کا ’سلام آخر‘ اس زمرے میں آتا ہے۔ جسے نظم قرار دینے کے باوجود سلام کی قلمرو سے خارج کرنا ممکن نہیں۔ بیسویں صدی تحریکات کی صدی تھی۔ عالمی سطح پر سیاسی و سماجی حالات کی اتھل پتھل نے شعر و ادب کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریوں نے انسانیت کو خون کے آنسو رلائے چنانچہ سلام نگاروں کے ہاں انسان دوستی، انسانیت سے ہمدردی کے عناصر کے ساتھ ساتھ انسانوں کے آلام اودکھ بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ یوں سلام میں شہادت عظمیٰ کے ایسے پہلو پیش کئے جانے لگے جو ایثار، محبت اور وحدت کی عملی راہ ہموار کر

سکیں۔ اسوہ شیری اور رفقاء امام عالی کی داستان عزم و عمل اور ایثار و قربانی، وفا اور خلوص سے ملی۔ بیدار اور آزادی کے لئے راہ ہموار کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اب سلام ایک با مقصد سرگرمی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ نجم آفندی اور ان کی طرز فکر سے متاثر ہونے والے سلام نگاروں کے ہاں یہ صورت حال نسبتاً نمایاں ہے جنہوں نے ع دماغ وضع کئے دل بنادیئے تو نے کے مصداق سلام میں اعتقاد کی فضا برقرار رکھتے ہوئے اس عظیم مقصد حیات کے حصول کا ذریعہ قرار دیا۔

قیام پاکستان (۱۹۴۷) تک سلام کا یہ سفر مختلف عصری رجحانات کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ سلام نگاروں نے سلام کی قدیم روایت کی پاسداری بھی کی۔ اس میں نیا طرز احساس بھی شامل کیا۔ اسوہ شیری ایک مستحکم اور مضبوط بنیاد بنا چنانچہ اردو سلام نے اخلاق و کردار کی تعمیر میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ پاکستان بننے کے بعد بیشتر سلام نگار ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور یوں کراچی اور لاہور جیسے پر رونق اور ادب پرور شہر سلاموں سے گونجنے لگے۔ عزائی ادب سے عوام کی دلچسپی کے باعث اردو سلام کا مستقبل روشن ہے جس کا ثبوت آئندہ باب میں ان شعرا کا تذکرہ ہے جو سلام کی صنف میں طبع آزمائی کرتے چلے آ رہے ہیں۔

حواشی

(اردو سلام، قیام پاکستان سے قبل)

- (۱) امداد امام اثر کاشف الحقائق لاہور مکتبہ معین الادب ۱۸۵۶ء ص ۱۷۷
- (۲) علی جواد زیدی ”انہیس کے سلام“ نئی دہلی ترقی اردو بیورو ۱۹۸۱ء ص ۳۲
- (۳) علی رضوی سید ”حسین پر سلام“ کراچی میرانہس اکادمی ۱۹۸۶ء ص ۲۰
- (۴) صفدر حسین ڈاکٹر ”رزم نگاران کربلا“ لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۷ء
- (۵) سید نواز حسن زیدی ”نجم آفندی۔ فکر و فن“ لاہور الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۲۶۴
- (۶) اردو جامع انسائیکلو پیڈیا جلد اول لاہور شیخ فلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۷ء ص ۷۱
- (۷) علی جواد زیدی ”انہیس کے سلام“ ص ۱۷
- (۸) W.W. Hunter, Brief History of Indian People, Oxford, 1907
- (۹) پیام شاہجہانپوری ”جنوبی ہند میں اردو“ لاہور عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۵ء ص ۶۳
- (۱۰) نصیر الدین ہاشمی ”دکن میں اردو“ ص ۲۲۸
- (۱۱) ایضاً ص ۲۲۸

- (۱۲) صفدر حسین ڈاکٹر ”رزم نگاران کر بلا“ لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء ص ۱۷۳
- (۱۳) شارب رودلوی ڈاکٹر ”انیس شناسی“ لکھنؤ، نسیم بکڈ پوسن، ص ۳۸۷
- (۱۴) وحید الحسن ہاشمی سید ”تقدیب ہے حسین“ لاہور الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء ص ۱۴
- (۱۵) رشید موسوی ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ نئی دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء ص ۵۹
- (۱۶) ایضاً ص ۵۸
- (۱۷) وحید الحسن ہاشمی سید اردو سلام نگاری، مضمون، مطبوعہ ماہنامہ ”شام و سحر“ لاہور، محرم نمبر، ۱۹۹۲ء ص ۳۳
- (۱۸) مظفر عباس ڈاکٹر اردو میں سلام گوئی کی روایت، مضمون، مطبوعہ ماہنامہ ”ماؤنٹ“ لاہور، ستمبر ۱۹۷۱ء ص ۲۴
- (۱۹) محمد قلی قطب شاہ، کلیات محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ: ڈاکٹر محی الدین زور)، حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس، طبع اول ۱۹۳۰ء ص ۶۰-۵۶
- (۲۰) علی رضوی سید ”حسین پر سلام“ کراچی میر انیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء ص ۲۲
- (۲۱) نجم الغنی، مولوی رام پوری، بحر الفصاحت، (مرتبہ: سید قدرت نقوی)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء ص ۲۲۸
- (۲۲) امداد امام اثر، کاشف الحقائق، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۸۵۶ء ص ۱۷۷
- (۲۲-۱) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“ ص ۲۰
- (۲۳) شاہی علی عادل شاہ ثانی ”کلیات شاہی“ (مرتبہ: سید مبارز الدین رخصت)، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء ص ۹
- (۲۴) نصیر الدین ہاشمی کے مطابق میاں نوری کوکلنڈہ کا شاعر تھا جسے حاسدین نے کوکلنڈہ سے نکلوا دیا تھا (نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو ص ۱۱۳)
- (۲۵) رشید موسوی ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۶۵
- (۲۶) نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو ص ۲۳۸
- (۲۷) رشید موسوی ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۶۶
- (۲۸) عبدالرؤف عروج ”اردو مرثیے کے پانچ سو سال“ ص ۲۶۵
- (۲۹) نور الحسن ہاشمی ”دکن میں اردو“ ص ۲۳۸، ۲۴۰
- (۳۰) نصیر الدین ہاشمی ”دکن میں اردو“ ص ۲۳۸
- (۳۱) ولی محمد کلیات ولی، مرتبہ نور الحسن ہاشمی، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۵ء ص ۷۰۸
- کلیات ولی میں شامل اس عزائی کلام کو ڈاکٹر مظفر عباس نے سلام قرار دیا ہے۔
- (مظفر عباس: اردو میں سلام گوئی کی روایت، مضمون، مطبوعہ ماہنامہ ”ماؤنٹ“ ستمبر ۱۹۷۱ء ص ۲۴)
- (۳۲) علی رضوی سید ”حسین پر سلام“ ص ۶۴

- (۳۳) وحید الحسن ہاشمی سید 'اردو میں سلام نگاری' ماہنامہ "شام و بحر" محرم نمبر لاہور جولائی ۱۹۹۲ء ص ۳۳
- (۳۴) رام بابو سکسینہ ڈاکٹر "تاریخ ادب اردو" (مترجم۔ مرزا محمد عسکری) لاہور، علمی کتاب خانہ ۱۹۸۵ء ص ۱۴
- (۳۵) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۷۱
- (۳۶) R.C. Maujaumder "An Advance History of India" London, 1960, p. 67
- (۳۷) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۷۷
- (۳۸) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۹۶
- (۳۹) امیر احمد علوی "یادگار انیس" لکھنؤ، انوار المطالع، سن ۹۱
- (۴۰) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۱۰۷
- (۴۱) عبدالرؤف عروج "اردو مرثیہ کے پانچ سو سال" ص ۷۴
- (۴۲) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۵۱۵
- (۴۳) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۱۱۰
- (۴۴) ایضاً ص ۱۱۱
- (۴۵) ایضاً ص ۱۱۳
- (۴۶) ایضاً ص ۱۳۱
- (۴۷) ایضاً ص ۱۳۴
- (۴۸) ایضاً ص ۱۳۵
- (۴۹) ایضاً ص ۱۴۸
- (۵۰) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۶۶۹
- (۵۱) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۱۶۳
- (۵۲) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۴۸۱
- (۵۳) عبدالرؤف عروج "اردو مرثیہ کے پانچ سو سال" ص ۲۷۹
- (۵۴) ایضاً ص ۳۶۹
- (۵۵) رشید موسوی ڈاکٹر "دکن میں مرثیہ اور عزاداری" ص ۱۶۹
- (۵۶) ایضاً ص ۱۷۱
- (۵۷) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۵۷۸

- (۵۸) رشید موسوی، ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۱۷۴
- (۵۹) ایضاً ص ۱۷۶
- (۶۰) ایضاً ص ۱۸۱
- (۶۱) ایضاً ص ۱۸۶، ۱۸۴
- (۶۲) ایضاً ص ۱۹۱
- (۶۳) رشید موسوی، ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۱۹۱
- (۶۴) نصیر الدین ہاشمی ”دکن میں اردو“ ص ۵۵۹
- (۶۵) عبدالرؤف عروج ”اردو مرثیہ کے پانچ سو سال“ ص ۳۸۶
- (۶۶) رشید موسوی، ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۱۸۷
- (۶۷) باقر رضوی امانت خانی، تصویر بعد رسالت، حیدر آباد (بھارت) نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ۱۳۷۵ھ، ص ۵۶
- (۶۸) ذاکر حسین فاروقی ”دبستان دبیر“ لکھنؤ، نسیم بکڈ پوز، ۱۹۶۶ء، ص ۷۰۰
- (۶۹) نواز حسن زیدی، سید ”نجم آفندی۔ فلکوفن“ ص ۶۹، ۲۶۸
- (۷۰) نجم آفندی ”نجم آفندی کے سلام“ لاہور، امامیہ کتب خانہ، سن۔
- (۷۱) نصیر الدین ہاشمی ”دکن میں اردو“ ص ۶۷۵
- (۷۲) رشید موسوی، ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ ص ۶۹
- (۷۳) انور سدید، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر تاریخ“ ص ۱۴۷
- (۷۴) علی جواد زیدی ”انہیس کے سلام“ ص ۲۱
- (۷۵) ایضاً ص ۲۳
- (۷۶) اعجاز حسین، سید، ڈاکٹر ”مختصر تاریخ ادب اردو“ ص ۴۹
- (۷۷) علی رضوی، سید ”حسین پر سلام“ کراچی، میر انیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، ص ۶۴
- (۷۸) علی جواد زیدی ”انہیس کے سلام“ ص ۲۳
- (۷۹) ایضاً ص ۲۱
- (۸۰) عبدالرؤف عروج ”اردو مرثیہ کے پانچ سو سال“ ص ۸۷
- (۸۱) علی جواد زیدی ”انہیس کے سلام“ ص ۲۲، ۲۳
- (۸۲) ایضاً ص ۲۳

- (۸۳) روشن علی ”عاشور نامہ“ (مرتبہ: مسعود حسین خاں) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۲ء، ص ۳۳
- (۸۴) رام بابو سکسینہ ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم۔ مرزا محمد عسکری) ص ۵۲
- (۸۵) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ص ۲۳
- (۸۶) ایضاً ص ۲۵
- (۸۷) نواز حسن زیدی سید ”نجم آفتدی۔ فکر و فن“ ص ۲۸۸
- (۸۸) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ص ۲۵
- (۸۹) میر ضاحک ”کلیات ضاحک“ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۱
- (۹۰) سودا، محمد رفیع مرزا، کلیات سودا، لاہور، مکتبہ شعر و سخن، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۴
- (۹۱) ایضاً ص ۱۳۷
- (۹۲) سودا، محمد رفیع مرزا، کلیات سودا، لاہور، مکتبہ شعر و سخن، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۶
- (۹۳) ایضاً ص ۱۳۵
- (۹۴) سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، لاہور، مکتبہ شعر و سخن، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۶
- (۹۵) میر تقی میر، کلیات میر (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) لاہور، اردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۳۰
- (۹۶) ایضاً ص ۱۳۲۹
- (۹۷) ایضاً ص ۱۳۳۱
- (۹۸) میر تقی میر، کلیات میر، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور، اردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۳۲
- (۹۹) ایضاً ص ۱۳۳۳
- (۱۰۰) میر تقی میر، کلیات میر (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) لاہور، اردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۳۰
- (۱۰۱) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ص ۲۶، ۲۷
- (۱۰۲) ایضاً ص ۲۷
- (۱۰۳) جمیل جاہلی ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ جلد دوم، ص ۷۴
- (۱۰۴) قائم چاند پوری، کلیات قائم، مرتبہ افتداحسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۳۳۷
- (۱۰۵) ایضاً ص ۳۳۸
- (۱۰۶) ایضاً ص ۳۳۹
- (۱۰۷) ایضاً ص ۳۳۸

- (۱۰۸) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ص ۲۸
- (۱۰۹) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ص ۲۹
- (۱۱۰) سلیم اختر، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ“ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۶
- (۱۱۱) رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم: مرزا احمد عسکری) ص ۱۳۲
- (۱۱۲) مصحفی، غلام ہمدانی، کلیات مصحفی، مرتبہ نور الحسن نقوی، لاہور، مجلس ترقی اردو، ۱۹۷۱ء
- (۱۱۳) رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم: مرزا احمد عسکری) ص ۱۶۱
- (۱۱۴) جرأت قلندر بخش ”کلیات جرأت“ مرتبہ: افتداحسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء
- (۱۱۵) رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم: مرزا احمد عسکری) ص ۱۳۸
- (۱۱۶) علی جواد زیدی، انہیں کے سلام، ص ۲۹
- (۱۱۷) غالب، اسد اللہ خاں ”کلیات غالب“ مرتبہ: خاں اصغر حسین خان، نظیر لدھیانوی، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۳
- (۱۱۸) ظفر بہادر شاہ ظفر ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰۷
- (۱۱۹) ظہیر دہلوی، سلام، مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۲۱
- (۱۲۰) عارف، مہر علی محمد عارف ”معارف سخن“ (مرتبہ: سید یوسف حسین شائق) لاہور، بارگاہ ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۸۴
- (۱۲۱) داغ مرزا دہلوی، سلام، مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید محمد رضوی) ص ۱۲۰
- (۱۲۲) سالک، قربان علی بیگ، کلیات سالک (مرتبہ: کلب علی خاں فائق) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۸۴
- (۱۲۳) شہید، مولوی باقر علی ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید محمد رضوی) ص ۱۳۰
- (۱۲۴) علی جواد زیدی ”انہیں کے سلام“ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۴
- (۱۲۵) سلیم اختر، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ“ ص ۱۱۴
- (۱۲۶) انور سدید، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر تاریخ“ ص ۱۷۶
- (۱۲۷) نور الحسن ہاشمی ”دلی کا دبستان شاعری“ ص ۲۶۹
- (۱۲۸) سلیم اختر، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ“ ص ۱۱۷
- (۱۲۹) رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم: مرزا احمد عسکری) ص ۲۰۶
- (۱۳۰) وحید الحسن ہاشمی ”تشنہ لب ہے حسین“ لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ص ۱۹۸۹
- (۱۳۱) گدا، میر گدا علی ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۸۶
- (۱۳۲) احسان، میر احسان علی ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۲۴

- (۱۳۳) تاقم عبداللہ لکھنوی 'سلام' مشمولہ حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۸۶
- (۱۳۴) افسردہ مرزا پناہ علی بیگ 'سلام' مشمولہ حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۸۷
- (۱۳۵) صفدر حسین سید ڈاکٹر (مقدمہ) تجلیات انیس لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء ص ۱۷۷
- (۱۳۶) سلیم اختر ڈاکٹر "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" گیارہواں ایڈیشن ص ۱۲۳
- (۱۳۷) رام بابو سکسینہ ڈاکٹر "تاریخ ادب اردو" (مترجم۔ مرزا محمد عسکری) ص ۱۹۷
- (۱۳۸) ایضاً ص ۱۹۸
- (۱۳۹) میر حسن دہلوی غلام حسن 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۷۸
- (۱۴۰) صفدر حسین سید ڈاکٹر (مقدمہ) تجلیات انیس لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء ص ۱۸۰
- (۱۴۱) خلیق میر مستحسن 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۸۹
- (۱۴۲) فصیح مظفر حسین خاں: سلام مشمولہ حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۹۱-۹۲
- (۱۴۳) ناظر حسین زیدی ڈاکٹر "جدید فن مرثیہ نگاری" لاہور: مکتبہ تعمیر ادب ۱۹۶۷ء ص ۷۵
- (۱۴۴) دلگیر سلام مشمولہ: اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (مرتبہ: عبدالرؤف عروج) ص ۱۲۷
- (۱۴۵) شاد عظیم آبادی "حیبران سخن" (مرتبہ: ڈاکٹر صفدر حسین) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۱ء ص ۲۲
- (۱۴۶) عبدالرؤف عروج (مرتبہ) اردو مرثیہ کے پانچ سو سال ص ۳۵
- (۱۴۷) اعجاز حسین ڈاکٹر "مذہب و شاعری" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۵ء ص ۲۷۷
- (۱۴۸) شبلی نعمانی۔ مولانا "موازن انیس و دبیر" آگرہ: مفید عام پریس ۱۹۷۰ء ص ۳۱
- (۱۴۹) میر ضمیر مجموعہ مرثیہ ضمیر جلد اول، لکھنؤ: نول کشور ۱۸۹۸
- (۱۵۰) رام بابو سکسینہ "تاریخ اردو ادب" (مترجم۔ مرزا احمد علی) ص ۲۰۴
- (۱۵۱) صفدر حسین سید ڈاکٹر "رزم نگاران کربلا" ص ۲۵
- (۱۵۲) مظفر حسن ملک مقالہ: پی۔ ایچ۔ ڈی (پنجاب یونیورسٹی) بعنوان میرزا ادیب ص ۲۱۹
- (۱۵۳) تقی عابدی سید ڈاکٹر (مرتبہ) سلک سلام دبیر لاہور: اظہار سنز ۲۰۰۳ء ص ۵۵
- (۱۵۴) علی جواد زیدی "انیس کے سلام" ص
- (۱۵۵) دبیر مرزا سلامت علی 'سلام' سلک سلام دبیر (مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی) ص ۱۲۱
- (۱۵۶) ایضاً ص ۱۲۵
- (۱۵۷) رام بابو سکسینہ ڈاکٹر "تاریخ ادب اردو" (مترجم۔ مرزا محمد عسکری) ص ۲۰۰

- (۱۵۸) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“
- (۱۵۹) فرمان فتح پوری ڈاکٹر ”میر انیس حیات اور شاعری“ کراچی اردو اکیڈمی
- (۱۶۰) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“ ص ۳۲، سندھ۔ سن ۷۷ء ص ۱۷۷
- (۱۶۱) انیس میر میر علی ”سلام“ مشمولہ: انیس کے سلام (مرتبہ: علی جواد زیدی) ص ۷۶
- (۱۶۲) انیس میر میر علی ”سلام“ مشمولہ: انیس کے سلام (مرتبہ: علی جواد زیدی) ص ۷۷
- (۱۶۳) شاد عظیم آبادی ”پیہران بخن“ (مرتبہ: ڈاکٹر سید صفدر حسین) ص ۲۳۰
- (۱۶۴) رشید موسوی ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزا اداری“ ص ۱۲۸
- (۱۶۵) وحید الحسن ہاشمی ”اردو سلام نگاری“ مضمون ”مطبوعہ ”شام و سحر“ لاہور جولائی ۱۹۹۲ء ص ۳۶
- (۱۶۶) نفیس ”سلام“ مشمولہ: عطر کلام (مرتبہ: سید صفیر حسین) دلی مطبع اشاعتی س ن ص ۱۲۲
- (۱۶۸) تعلق سید میرزا ”سلام“ مشمولہ: عطر کلام (مرتبہ: سید صفیر حسین) ص ۱۳۷
- (۱۶۹) عشق حسین مرزا ”سلام“ مشمولہ: عطر کلام (مرتبہ: سید صفیر حسین) ص ۵۳
- (۱۷۰) سکندر آغا سید ڈاکٹر ”مرزا محمد اوج لکھنوی۔ حیات اور کارنامے“ لکھنؤ نظامی پریس ۱۹۸۵ء ص ۲۰۷
- (۱۷۱) اوج مرزا ”سلام“ مشمولہ: اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (مرتبہ: عبدالرؤف عروج) ص ۲۶۲
- (۱۷۲) اختر واجد علی شاہ ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۰۵
- (۱۷۳) مہذب لکھنوی (مرتب) معیار کامل جلد اول لکھنؤ یونیٹ پریس ۱۹۵۱ء ص ۱۳
- (۱۷۴) سکندر آغا سید ڈاکٹر ”مرزا اوج لکھنوی۔ جہت اور کارنامے“ ص ۵۳۵
- (۱۷۵) عارف علی محمد ”جواہر بے بہا“ لکھنؤ نظامی پریس ۱۹۳۵ء ص ۱۱۰
- (۱۷۶) اشرف رفیع ڈاکٹر ”نظم طباطبائی۔ حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ“ حیدر آباد (دکن) الیاس ٹریڈرس ۱۹۸۶ء ص ۳۵
- (۱۷۷) نظم طباطبائی سلام مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۱۴
- (۱۷۸) بلال نقوی ڈاکٹر ”بیسویں صدی اور جدید مرثیہ“ کراچی پاکستان رائٹرز گلڈ ۱۹۹۳ء ص ۳۱۳
- (۱۷۹) مصطفیٰ فطرت ڈاکٹر ”صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے“ لکھنؤ سرگراز قومی پریس ۱۹۸۶ء ص ۱۸۷
- (۱۸۰) عرفان عباسی ”آپ“ لکھنؤ الواعظ پریس ۱۹۷۸ء ص ۱۷۸
- (۱۸۱) صفی لکھنوی ”سلام“ مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۶۵
- (۱۸۲) اشرا م پوری محمد علی خاں۔ ”آرزو۔ صفی اور طلیل کے خطوط“ مضمون ”مطبوعہ ماہنامہ ”آج کل“ دہلی خطوط نمبر اپریل ۱۹۵۳ء ص ۵۶
- (۱۸۳) حسینی مجاہد حسین ڈاکٹر ”آرزو لکھنوی حیات اور کارنامے“ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۸ء ص ۲۸۱

- (۱۸۴) آرزو لکھنوی "سلام" مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۶۴
- (۱۸۵) رشید پیارے صاحب 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۳۷
- (۱۸۶) فرید لکھنوی 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۸۶
- (۱۸۷) احتشام حسین پر مضامین بدرکامل (خبیر لکھنوی) لکھنؤ: نظامی پریس ۱۹۵۶ء ص ۵
- (۱۸۸) عرفان عباسی "آپ" لکھنؤ: الوعظ صفدر پریس ۱۹۷۸ء ص ۱۲۲
- (۱۸۹) خبیر لکھنوی: سلام مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۸۳
- (۱۹۰) سکندر آغا سید ڈاکٹر "مرزا احمد عروج۔ اوج لکھنوی حیات اور کارنامے" ص ۵۱۰
- (۱۹۱) عروج، دولہا صاحب 'سلام' مشمولہ: اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (مرتبہ: عبدالرؤف عروج) ص ۲۶۳
- (۱۹۲) ابوالیث صدیقی ڈاکٹر "لکھنؤ کا دبستان شاعری" کراچی: اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۷ء ص ۸۳۸
- (۱۹۳) عزیز لکھنوی "سلام" مشمولہ: اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (مرتبہ: عبدالرؤف عروج) ص ۲۹۷
- (۱۹۴) فائق لکھنوی "سلام" مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۶۲
- (۱۹۵) شبیر الحسن ڈاکٹر سید "باقیات آل رضا" لاہور: الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۵
- (۱۹۶) ایضاً، ص ۷۵
- (۱۹۷) آل رضا سید 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۲۰۱
- (۱۹۸) شبیر الحسن ڈاکٹر "باقیات آل رضا" ص ۲۰۴، ۲۰۵
- (۱۹۹) آل رضا سید "سلام آخر" مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۳۸۴، ۳۸۵
- (۲۰۰) جوش ملیح آبادی 'یادوں کی بارات' ص ۴۷۲
- (۲۰۱) بہزاد لکھنوی 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۱۰
- (۲۰۲) سالک لکھنوی 'سلام' مشمولہ: حسین پر سلام (مرتبہ: سید علی رضوی) ص ۲۱۱
- (۲۰۳) فضل لکھنوی "معیار غزل" لکھنؤ: نامی پریس ۱۹۸۴ء ص ۱۸
- (۲۰۴) وحید الحسن ہاشمی سید "فن نوحہ گوئی اور فضل لکھنوی" مطبوعہ ہفت روزہ "نظارہ" لکھنؤ ۱۹۵۹ء ص



باب سوم

اُردو سلام قیام پاکستان کے بعد

اُردو سلام قیام پاکستان کے بعد

پس منظر۔ سلام کے معروف دبستان۔ اہم سلام نگار شعرا۔ پیش منظر

گذشتہ ابواب میں ہم نے اردو سلام نگاری کے خدوخال متعین کیے ہیں اور قیام پاکستان سے قبل اُردو سلام نگاری کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی مقدور بھرکوشش کی ہے۔ اس ارتقاء میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ اردو سلام کے بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کا جائزہ لینے کی بھی کاوش کی ہے۔ مجموعی طور پر ہم نے اردو سلام کے اس ارتقائی جائزہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ صنف سخن مختلف اسباب کی بناء پر ہر عہد کی مقبول عوام و خواص صنف رہی ہے اور آج بھی اس صنف کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ زیر مطالعہ باب میں ہم تقسیم برصغیر کے بعد اردو سلام نگاری کا ارتقائی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

بیسویں صدی کا سورج نئے نظریات و میلانات لے کر طلوع ہوا اور خصوصاً مغربی اصناف کے حوالے سے اردو اصناف میں جدید افکار و نظریات کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ مغربی تہذیب نے اپنی رنگارنگی کی وجہ سے اہل مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سوچ اور فکر کے مروجہ معیارات تبدیل ہونے لگے۔ پرانے پیمانے بوسیدہ قرار دیے گئے اور اب نئے شعری پیمانوں میں جدید شراب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ شعر و ادب کا تعلق فرد سے زیادہ معاشرے سے جوڑا جانے لگا اور اجتماعی لب و لہجہ کو اہمیت دی جانے لگی۔ (۱) نتیجتاً قومی اور ملی شاعری کو عروج اردو سلاموں میں بھی اجتماعی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ اقبال، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، ریاض خیر آبادی، اثر لکھنوی اور چکبست لکھنوی نے جس طرح ملی مرثیوں کے ذریعہ ملت کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی (۲) اسی طرح سلام نگاروں نے امام عالی مقام کی سیرت و کردار کو مشعلِ راہ بنایا اور اپنے سلاموں کے ذریعہ امت مسلمہ کو بیدار کرنے کی سعی بلیغ کی۔ اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو سلام کا رشتہ قومی شاعری سے جڑ گیا۔ بعض ناقدین نے اس منظر نامے کے حوالے سے سطحی بنیاد پر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ اس عہد میں رثائی ادب کو زوال آ گیا تھا۔ (۳) مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے (۴) اگر آپ بنظر غائر مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس عہد کے معروف سلام

نگاروں کے سلاموں میں جدید اور ترقی پسند افکار و نظریات کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

بیسویں صدی کی دہائی میں پوری دنیا میں عموماً اور مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستان میں خصوصاً اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ایسے لائحہ عمل مرتب کیے جا رہے تھے جن سے معاشرتی سطح پر انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکیں (۵) اس حوالے سے مظلوم دیسی عوام کے اوپر کیے گئے مظالم کو مختلف سطحوں پر پیش کر کے سامراجی استبداد اور ظالمانہ حیثیت کو خوب اُبھارا جا رہا تھا۔ (۶) ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد عوام الناس میں ایک انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لیے واقعہً کربلا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا۔ (۷) اس صورت حال میں سلام نگار شعرا نے بھی اپنے سلاموں کا چولا بدلا۔ انہوں نے اپنے سلاموں کی آزادی اور حریت کے نقیب کے طور پر امام عالی مقام کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ آپ اس دور کے سلاموں کا مطالعہ فرمائیے اس میں ایک خاص طرح کی گھن گرج اور جوش و جذبہ ملے گا۔

اس سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کا اردو سلام کی ہیئت پر جزوی تاہم موضوعات پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ خاص طور پر شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد کے حالات و واقعات کو بطور خاص سلاموں میں جگہ دی جانے لگی اور پیغام عالی مقام کی تشبیہ ہی اس کا بنیادی موضوع قرار پائی۔ (۸) اس سلسلے میں آل رضا، نجم آفندی، نسیم امر و ہوی، جمیل مظہری، علی سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی نے خصوصاً سلام کو مقصدی لے عطا کی اور اس صنف کو جدید عصری تقاضوں کے عین مطابق ڈھالنے کی سعی بلیغ کی۔ اس طرز عمل اور طرز احساس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر تقسیم ہو کر ہندوستان اور پاکستان ہو گیا۔ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان بے سرو سامانی کے عالم میں ترک وطن کر کے پاکستان پہنچے اور اس کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہوئے چونکہ حیدر آباد دکن، دہلی اور لکھنؤ کے متعدد ادیب، شاعر اور نقاد کراچی میں بس گئے اس لیے کراچی شعر و شاعری کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اسی طرح مشرقی پنجاب کی کثیر آبادی لاہور، ملتان، سرگودھا اور پٹنہ میں قیام پذیر ہوئی اور پنجاب کے ان شہروں کو ادبی نقطہ نظر سے مرکزیت حاصل ہو گئی جو شعراء ۱۹۴۷ء میں یا اس کے بعد پاکستان آئے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن انفرادی رنگ شاعری کو دیکھتے ہوئے چند اہم نام قابل توجہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی ہندوستان کے ایک اہم شاعر تھے۔ ترک وطن کر کے پہلے کراچی اور راولپنڈی میں سکونت پذیر ہوئے۔ سید آل رضا غزل، سلام اور مرثیے کے اہم شاعر تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد کراچی آئے اور کراچی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ نجم آفندی پیرانہ سالی کے باوجود حیدر آباد سے لاہور آئے اور پھر کراچی میں جا کر آباد ہو گئے۔ نسیم امر و ہوی مرثیے کے ایک اہم رکن تھے۔ لاہور آئے اور پھر خیر پور میں سکونت پذیر ہوئے۔ ڈاکٹر صفدر حسین میرٹھ سے چل کر پنجاب پہنچے اور لاہور میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ قیصر بارہوی جدید دور کے اہم شاعر ہیں۔ لکھنؤ سے منتقل ہو کر سرگودھا آئے اور ۱۹۷۰ء میں لاہور میں قیام پذیر ہوئے تاہم ان کی رحلت کراچی میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ وحید الحسن ہاشمی ۱۹۴۸ء میں الہ آباد سے کراچی آئے اور ایک سال بعد لاہور آ کر مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔ ناصر کاظمی انبالہ سے لاہور آئے اور ساری عمر لاہور ہی

میں مقیم رہے۔ اس طرح جناب شاہد نقوی بلند شہر سے منتقل ہو کر کراچی آ گئے۔ استاد قمر جلالوی علی گڑھ سے منتقل ہو کر مستقل طور پر کراچی آ گئے۔ مشکور حسین یاد کرناں سے چل کر لاہور پہنچے اور آج تک لاہور ہی میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کرناں سے چل کر لاہور آئے اور یہیں مدفون ہوئے۔ کوثر پانی پتی پانی پت سے منتقل ہو کر لاہور آئے اور لاہور ہی میں دفن ہوئے۔ ذابرخ پوری الہ آباد سے آ کر کراچی میں قیام پذیر ہوئے۔ ساحر لکھنوی لکھنؤ سے منتقل ہو کر کراچی آ گئے۔ ساحر فیض آبادی فیض آباد سے ترک وطن کر کے کراچی پہنچے۔ عاصی کرناں کرناں سے رخصت ہو کر ملتان آئے اور آج بھی ان کا وطن ملتان ہی ہے۔ احسان دانش قیام پاکستان سے قبل ہی مظفر نگر سے منتقل ہو کر لاہور آ گئے تھے اور یہیں لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ جناب احمد ندیم قاسمی سرگودھا کے رہنے والے تھے قیام پاکستان سے قبل ہی لاہور کے رسالہ ”انقلاب“ میں کام کرتے رہے اور آج بھی لاہور میں مقیم ہیں۔ محسن نقوی ضلع ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے تھے تقریباً دس سال لاہور میں مقیم رہے اور لاہور میں قتل ہوئے۔ جناب سیف زلفی بریلی کے رہنے والے تھے۔ ریلوے میں ملازم ہونے کی وجہ سے لاہور آئے اور لاہور ہی کی خاک میں مدفون ہیں۔ یہ اور اسی قبیل کے سینکڑوں شعراء ہیں جو نقل مکانی کر کے پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہوئے اور انہوں نے اپنے مسلمانوں کے ذریعہ ایک جانب تو سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا اور دوسری جانب انہوں نے صنف سلام کو اپنے افکار و نظریات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا اور اسے حیات جاوداں عطا کی۔ ان شعرا کا یہ کارنامہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد ہجرت کر کے کراچی، حیدر آباد، لاہور اور راولپنڈی کے شہروں اور مضافات میں آباد ہو گئی۔ یہ ہندوستانی شعراء جب منتقل ہو کر پاکستان آئے تو اپنے ساتھ مسلم ہندوستان کی مستقل تہذیب اور شعر و شاعری کی منور روایات لے کر آئے۔ ان شعراء کی زبان میں ہمیں وہی طغٹ اور وہی انداز ملتا ہے جو لکھنویا دہلی سے مختص ہے اور تہذیبی اقدار بھی وہی نظر آتے ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے مسلمان گھرانوں سے تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانی شعراء میں نجم آفندی، مولانا صفی، عزیز لکھنوی، بے خود موہانی، رزم ردولوی اور زائریتا پوری مشہور ہو چکے تھے۔ مطالبہ قیام پاکستان کی وجہ سے اور انگریزی سلطنت کی بربریت کی وجہ سے مسلمانان ہند میں ایک جذبہ حریت پیدا ہو گیا تھا۔ ان شعراء نے اس جذبے کو اپنے مسلمانوں کا مرکز بنایا اور قوم کو جگانے کے لیے مسلمانوں میں ایسے ایسے اشعار کہے جن سے سوئی ہوئی روح بیدار ہو جائے اور مردہ دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔

ملت کی جو بنیوں میں تھوڑی سی حرارت ہے
اے اسوۂ شبیریؐ یہ تیری بدولت ہے
جس طرز حکومت کو شیرؐ نے فھکرایا
ہر قوم کی ٹھوکر میں وہ طرز حکومت ہے (نجم آفندی)

جوش اور ولولہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی نظموں کی وجہ سے ادب میں شروع ہو چکا تھا۔ وہی جوش اور وہی شدت جذبات سلاموں میں بھی جاگزیں ہو گیا۔ ان شعراء نے اپنے سلاموں میں اسلامی تعلیمات اور شہادتِ عظمیٰ کے ایسے پہلو پیش کیے جو مسلمانوں کو متحرک کر سکیں اور ان کو وحدت، مساوات، عدل اور ایثار و قربانی کی عملی راہ کی طرف مائل کر سکیں۔ کربلا کے واقعات، سید الشہداء، حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء کی داستانِ ایثار و شہادت اور واقعہ عزم و قربانی اپنے اندر لازوال بصیرتیں رکھتا ہے۔ اسی لیے سلام کے کہنے والے بعض صورتوں میں اس فن سے قوم میں ملی بیداری، قومی شعور، ہمت اور یقین پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس عہد کے نامور سلام نگار نجم آفندی کے حوالے سے نواز حسن زیدی رقم طراز ہیں:

”..... بیسویں صدی کے اوائل ہی میں نجم آفندی جدید سلام نگاری کی حیثیت سے سامنے آئے اور اپنے عصری شعور کے باعث سلام کو بھی احیائے قوم کے لیے ایک ذریعہ کی حیثیت سے استعمال کیا۔ وہ اپنے سلاموں میں واقعہ کربلا کی تفصیل اور معصومین کے احوال کا رونا مونا اور نفسیاتی کیفیات بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے عہد کی موثر آواز اقبال کے افکار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ماضی کے مذہبی رہنماؤں کی سیرت و کردار کے بیان سے تعمیری کام لینے کی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے پہلے سلام نگار ہیں جن کے سلاموں میں نظم و ضبط، عزم و عمل، شعور حریت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کے سلاموں پر ہر مقصدیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی ادبی حیثیت مجروح نہیں ہوتی ان کے سلاموں کی فضا ایمانی اور اشاری انداز بیان سے معمور ہے جس میں پاکیزہ خیالات، تزکیہ نفس کے جذبات، سیرت و کردار کی تعمیر کرنے والے بیان اور سیرت معصومین کی اتباع کے عناصر نمایاں ہیں۔“ (۹)

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد فسادات کا بازار گرم ہوا۔ انسانوں نے مذہب کی بنیاد پر انسانیت کے خون کی ہولی کھیلی۔ قتل و غارت ہوا۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا اور ان کا تمام مال اسبابِ لوٹ لیا گیا۔ ان واقعات نے جہاں سماج اور معاشرے پر گہرے اثرات چھوڑے وہاں ادب پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ شاعر چونکہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے گہرا اثر قبول کرتا ہے چنانچہ شعراء خاص طور پر سلام نگار شعراء نے تقسیم ملک کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات سے گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے اپنی قلبی واردات اور داخلی کیفیات کو کربلا کے استعارے سے بیان کیا۔ ان تمام روایات کو لیے ہوئے جب شعراء پاکستان میں قیام پذیر ہوئے تو مستقل قدریں سلام میں باقی رہ گئیں لیکن طنز اور بغاوت کا انداز یکسر معدوم ہو گیا۔ نیا وطن پانے کی خوشی میں اب جذبات میں وہ تیزی اور خیالات میں وہ شدت باقی نہیں رہ گئی۔ اس لیے قیام پاکستان کے فوراً بعد کے سلاموں میں وہ کروفر نہیں

جو ہندوستان کی زندگی سے مختص تھا۔ ان ابتدائی سلاموں میں ایک ٹھہراؤ آ گیا اور سلاموں کا رخ زیادہ تر عقیدے کی طرف ہو گیا۔ اس عہد کے ایک معروف سلام نگار آل رضا کے محض ایک سلام سے ہمارے موقف کی بھرپور تائید ہو جائے گی۔

سلام

دہک جو اٹھتا یزیدی دھواں تو کیا ہوتا؟
 اگر حسینؑ نہ ہوتے وہاں تو کیا ہوتا
 یزید اور یہ جسارت کہ ڈھونگ تھا اسلام
 نہ ٹوک دیتی حسینؑی زباں تو کیا ہوتا
 جہاں تھی کشتی اسلام سخت طوفانی
 وہاں نہ کھلتا جو وہ بادباں تو کیا ہوتا
 جبین سجدۂ اسلام اور بعد طلعت
 جو کربلا کا نہ ہوتا نشاں تو کیا ہوتا
 نماز پھر ہوئی قائم رہے صدائے حسینؑ
 نمازیوں کو ترستی اذان تو کیا ہوتا
 بچا رہے تھے اصول رسولؐ آل رسولؐ
 نہ ذبح ہوتا جو وہ خاندان تو کیا ہوتا
 علوئے ہمت شیرؑ دیکھ کر یہ بتاؤ
 جو ہوتا اور بھی کچھ امتحاں تو کیا ہوتا؟
 دلوں میں اپنے ہے رونق حسینؑ کے دم سے
 یہاں نہ ہوتے جو یہ میہماں تو کیا ہوتا
 غم حسینؑ نے کتنے غموں سے دی ہے نجات
 یہ غم نہ ہوتا اگر مہرباں تو کیا ہوتا
 جو چاہے تھا وہ فیض عزا نصیب کہاں
 جو سلسلہ ہے مگر رایگاں تو کیا ہوتا
 یہ خوش ترابی خاک شفا کا حسن مزاج
 یہی نہ ہوتا رضا حرز جاں تو کیا ہوتا (۱۰)

ہندوستانی سلام نگاروں کے کلام میں سیرت شہدائے کربلا اور محمد و آل محمد کے کردار کے نقوش پائے جاتے ہیں چونکہ امام حسین ایک جابر حکومت سے ٹکرا گئے تھے اس لیے ان شعراء میں جابر حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہوئے اور حسینیہ کو نمونہ حیات بنا کر ان شعراء نے برطانوی استبداد پر پوشیدہ طور پر زبردست تنقیدیں کیں۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان میں سلام نگاری کا احیاء ہوا تو سلاموں میں بھی نئے تجربے ہوئے اور نئی جہتیں سامنے آئیں۔ سیاسی و ذہنی انقلاب سے جو ایک نئی ذہنیت اور معاشرت پیدا ہوئی اس کی جھلکیاں سلاموں میں جا بجا نظر آئیں۔

قیام پاکستان کے بعد جس جذبے نے شدت کے ساتھ سراٹھایا وہ اسلامی تمدن کا نکھار تھا۔ پاکستان کے ہر علاقے کے لوگ یہ جان چکے تھے کہ قیام پاکستان کا مطلب اسلامی علوم و فنون کی بقاء اور دین خدا کی ترویج و اشاعت ہے۔ قیام پاکستان کا مقصد مسلمانوں کے لیے ایک ایسا خطہ قائم کرنا تھا جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق احکام الہی پر عمل پیرا ہو کر زندگیاں گزار سکیں۔ ہندو تہذیب نے نہ صرف مسلمانوں کے رہن سہن پر حملہ کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے عقیدے پر بھی مسلسل اعتراضات ہو رہے تھے۔ آریہ سماج تحریک کی وجہ سے تصور وحدانیت پر زبردست اعتراضات کیے جا رہے تھے اور حد یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ شدمی اور سنہٹن کی تحریک قائم کر کے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بھی بنایا جا رہا تھا۔ قیام پاکستان ان مختلف تحریک کے رد عمل کی وجہ سے عالم وجود میں آیا۔ اب جو پاکستان میں کھلی آزادی ملی تو سب سے پہلے جس چیز کا تقاضا کیا گیا اس کا تعلق دین اسلام کی بقا سے تھا۔ اسلامی طرز معاشرت، اسلامی بود و باش، اسلامی طرز حیات، اسلامی نقش و نگار اور اسلامی رہن سہن کے مطالبے چاروں طرف سے پیش کیے جانے لگے۔ اس مطالبے کا اثر تھا کہ لیاقت علی خاں کو ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد اسمبلی سے پاس کروانا پڑی۔ درحقیقت پاکستانی ثقافت کی یہ سب سے پہلی اینٹ تھی جو پاکستان کی عمارت میں رکھی گئی۔ اس کے علاوہ فکری آزادی کا ایک کھلا میدان زمین پاکستان نے دے دیا تھا۔ اس لیے لوگوں کے دلوں میں سے وہ گھٹن دور ہو گئی جو ہندو ثقافت نے پھیلا دی تھی۔ اس دور کی شاعری میں یہ دونوں پہلو خاص طور سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

جب ہم اس دور کے سلاموں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی ثقافت کے نمایاں اثرات ہماری شاعری میں در آئے ہیں۔ کفر سے جنگ، شرک سے جنگ، الحاد سے جنگ اور منکرات سے جنگ پاکستانی تہذیب کی نمایاں خصوصیات قرار پائیں۔ اب سلاموں میں ظلم اور جبر کے خلاف خیالات کا اظہار ہونے لگا اور چونکہ عوام بھی انہی جذبات سے آشنا تھے اس لیے سلاموں کو زیادہ عروج مل گیا۔ اس عہد میں یوں تو تمام شعرا کے سلاموں میں یہی لے سنائی دے رہی تھی تاہم دو شعرا کے سلام ملاحظہ فرمائیے:

سلام.....جوش ملیح آبادی

کر چکا سیر اصل مرکز پر اب آنا چاہیے

اس زمیں پر اک نئی بستی بسانا چاہیے

پڑ چکے ہیں سینکڑوں روح شہادت پر حجاب
 مومنو! اب ان حجابوں کو اٹھانا چاہیے
 استعاروں میں بیاں کرنے کے دن باقی نہیں
 داستاں اب صاف لفظوں میں سنانا چاہیے
 یہ جھجک اچھی نہیں اے سوگوارانِ حسین
 باندھ کر سر سے کفن میداں میں آنا چاہیے
 آج جب آنے لگے حق پر تو بہر زندگی
 موت کو بڑھ کر کلیجے سے لگانا چاہیے
 تیغ کے دامن کی جب آنے لگے رن سے ہوا
 مرد کو انگڑائی لے کر مسکرانا چاہیے
 تیری پا بوسی کو خم ہے کب سے پھٹ آسماں
 اے مسلمان! خاک سے اب سر اٹھانا چاہیے
 یوں ابھرنے سے رہا نقشِ حیاتِ جاوداں
 زندگی پر خون کی مہریں لگانا چاہیے
 آفریں اے ہمتِ مردانہ ابنِ رسول
 صاحبِ غیرت کو یوں ہی موت آنا چاہیے
 بسترِ احمدؑ، شبِ ہجرت یہ دیتا ہے صدا
 اے علیؑ! مردوں کو یوں ہی نیند آنا چاہیے
 کچھ سنا کیا کہہ رہا ہے جوشِ اکبرؑ کا شباب
 مینہ میں تیروں کے جوانی کو نہانا چاہیے (۱۱)

سلام سید وحید الحسن ہاشمی

غمِ حسینؑ کا مقصد بدل نہیں سکتا
 خیامِ جل گئے پیغامِ جل نہیں سکتا
 نہ شہ کو صبحِ الم سے ڈرا شبِ عاشور

حسین " کہہ دیں تو سورج نکل نہیں سکتا
 یہ بات بھول گئے دشمن ابو طالب
 رسول کفر کے دامن میں پل نہیں سکتا
 بنا ہے اب دل مومن حسین " کا مسکن
 یہ گھر کسی کے جلانے سے جل نہیں سکتا
 طلب کریں نہ کسی بد نہاد سے اُلفت
 زمیں ہو شور تو پودا نکل نہیں سکتا
 اسی کا دعویٰ عشق حسین " ہے محکم
 جو مر تو سکتا ہے لیکن بدل نہیں سکتا
 یہ کسنی یہ سکینہ کا جذبہ تنظیم
 جگر میں درد ہے آنسو نکل نہیں سکتا
 نکل تو آئے گا ناوک گلوئے اصغر سے

مگر رہا بے دل سے نکل نہیں سکتا (۱۲)

اسی طرح سے تحفظ دین اسلام پاکستان کی بقاء کے لیے دوسری منزل تھا۔ عام خیال یہ تھا اور ہے کہ ہندو تہذیب و تمدن سے کٹ جانے کے بعد خطہ پاکستان ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری عوام الناس پر عائد ہوتی ہے۔ سلام نگاروں نے اس جذبے کو آگے بڑھایا اور کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ جذبہ مجنونہ ہو۔ چنانچہ پاکستان کے ہر شاعر کے کلام میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ (۱۳)

قائم رہے وقارِ حسینی نظام کا
 جس کے لیے حسین نے دی کربلا میں جان (جعفر طاہر)

یزید و شمر کی آنکھوں سے کم نہیں ہوتی
 غم حسین " میں جو آنکھ نم نہیں ہوتی
 فراز دار ہو یا کربلا کی تپتی ریت
 شعاع عشق کی تنویر کم نہیں ہوتی (ابن صفی)

انسان کو اپنی وسعت صبر و رضا کی حد
معلوم ہو گئی ترے صبر و رضا کے بعد (حفیظ ہوشیار پوری)

دور تجدید شہادت غالباً نزدیک ہے
اب نظر آئے ہیں ہر مومن میں آثار حسین
مطمئن تفسیر قرآن سے بھی ہے دنیا مگر

اب ضرورت ہے کہ ہو تشریح کردار حسین (احسان دانش)

تحفظ اسلام کے ساتھ ساتھ جدید دور کے مسلمانوں میں بدی سے نفرت کا بڑا اظہار ملتا ہے۔ واقعہ کربلا میں یزید، شمر، عمر
سعد، اوزق، سینان بن انس، بدی کے نمائندے ہیں۔ خز، عباس، حسین اکبر، اصغر اور جناب زہبؑ یہ خوبی کے نمائندے ہیں۔ جب
ہم سلام نگاروں کے سلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں منکرات سے نفرت اور بدکاروں کے خلاف ایک منظم تنظیم نظر آتی ہے۔
پاکستان کے ہر شاعر نے اپنے مسلمانوں میں اس رخ سے شعر کہے ہیں۔ کہیں شمر سے مخاطب ہے اور کہیں یزید سے اور پھر اہل
درد کے قافلے کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

حیوانیت کی ذیل میں ڈھونڈو یزید کو
انسانیت کی فرد میں یہ نام ہی نہیں (وحید الحسن ہاشمی)

باطل کے اقدار کا کھل جائے گا بھرم

فوج یزید و حوصلہ کربلا کو دیکھ (جوش)

پاکستان میں سلام نگاری نے جس طرح عروج حاصل کیا۔ اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دبستان لکھنؤ کی سلام
نگاری کے بعد پاکستان کے دبستان سلام نگاری نے ایک عظیم المرتبت حیثیت حاصل کر لی ہے۔ سلام نگاری کی مقبولیت کے پیش
نظر پاکستان کے مختلف علاقوں سے متعلق سلام نگاروں نے مختلف زبانوں میں سلام تحریر کئے۔ ان مسلمانوں کو ملک کے طول و عرض
میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سلام نگاری کی اشاعت کا آغاز اگرچہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہو چکا تھا لیکن ۱۹۷۴ء میں میر انیس کی
صد سالہ برسی کے موقع پر رٹائی ادب کی اشاعت کے بعد بے شمار سلام شائع ہوئے۔ پاکستان میں اردو مسلمانوں کو عروج اس
وقت حاصل ہوا جب مختلف شعرا نے اپنے سلام یکجا کر کے دیوان کی شکل میں شائع کرائے۔ اسی طرح مختلف شعرا کے مسلمانوں
کے انتخاب کی اشاعت سے بھی سلام کی تخلیق کو فروغ ملا۔ مختلف ادبی اور مذہبی رسائل میں سلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو
اہم شعرا کے مسلمانوں کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اسی طرح مختلف علمی و ادبی انجمنوں اور اداروں نے مسالے کی محافل کا انعقاد کرایا

اس سے بھی صنف سلام کو فائدہ ہوا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مسالوں نے بڑے شعرا کو اس صنف کی جانب مائل کیا۔ درج بالا نکات کے باعث پاکستان میں اس صنف کے فروغ کے لیے امکانات مہیا ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں سلام نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ البتہ کراچی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی عقیدت مندانہ فضاؤں میں سلام نگاری کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ سلام نگار شعراء نے عقیدت و احترام کے جذبات کو سلام کے سوز و گداز اور عزائی تاثر کے رنگ کے حوالے سے بارگاہ شہدائے کربلا میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ کراچی میں مسالوں کی مجلسی نشستوں کے ادبی مراکز جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں ان میں حسینہ ایرانیاں، جامعہ امامیہ ناظم آباد، دولت کدہ ڈاکٹر یاور عباس، امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی، انجمن سفینہ ادب ڈرگ روڈ، ادارہ تقدیس قلم، امام بارگاہ خراساں، دولت کدہ شاہد نقوی، دولت کدہ علامہ رشید تریابی اور امام بارگاہ معصومین انجولی سوسائٹی قابل قدر ہیں۔

کراچی میں سلام کی مقبولیت میں ناصر جہاں کی سلام خوانی کے انداز نے اہم کردار ادا کیا۔ سلام خواں اشرف عباس کی آواز کو بھی سلام کی مقبولیت میں بہت دخل حاصل ہے۔ کراچی کی مجالس میں درد انگیز لہجے اور سوز و گداز سے لبریز آواز میں مختلف شعراء کے سلام پڑھے جاتے ہیں۔ سلام خوانی کے مخصوص انداز کی بناء پر مجالس کی فضا سگوار ہو جاتی ہے۔ عام طور پر شام غریباں کی مجالس میں آل رضا اور دیگر شعراء کے سلام رقت آمیز لہجے میں پیش کیے جاتے ہیں جن سے مجالس کے روح پرور ماحول میں اثر انگیز رنگ ابھرتا ہے جن شعراء کرام نے قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری کا آغاز کیا اور اسے فن سخن دری کے اوج کمال تک پہنچایا ان میں آل رضا، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، راجہ صاحب محمود آباد، نجم آفندی، آرزو لکھنوی، شمر لکھنوی، کامل جونا گڑھی، محسن اعظم گڑھی، منظر عظمیٰ، ضیاء الحسن موسوی، ڈاکٹر یاور عباس، صبا اکبر آبادی، صبا لکھنوی، زیبا ردولوی، وصی فیض آبادی، استاد قمر جلالوی، شاہد نقوی، زید اے بخاری، ارم لکھنوی، رعنا اکبر آبادی، طالب جوہری، ماہر القادری وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام شعراء نے سلام لکھ کر نہ صرف اپنی شاعرانہ عظمت کا ثبوت فراہم کیا بلکہ اپنے مخصوص اسلوب بیان کے مطابق واقعہ کربلا کو لفظی و معنوی حسن سے آراستہ کرنے کے بعد تقدس کے روح پرور انداز میں پیش کیا۔ ان سب شعراء کے سلام خواص و عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور کراچی کی مجالس میں تواتر کے ساتھ پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جن شعراء نے بے شمار سلام تصنیف کیے اور سلام نگاری کو شاعرانہ عظمت، ذہنی و فکری تقدس کے اظہار کا ذریعہ سمجھا ان میں ثاقب مظفر پوری، منور عباس، ساحر لکھنوی، رئیس امروہوی، ساحر فیض آبادی، معجز جوہری، فہیم ردولوی، نعیم میرٹھی، راغب مراد آبادی، محشر بدایونی، شان الحق حقی، تابش دہلوی، شاداں دہلوی، رضی ترمذی، تجل لکھنوی، شمر ہوشنگ آبادی، ذابرتیچ پوری، اکرم زیبائی، نیرمدنی، عزت لکھنوی قابل ذکر ہیں۔ خواتین سلام نگاروں میں وحیدہ نسیم، سعیدہ ناز اور سکندر حیا بریلوی بھی سلام کہتی ہیں۔

دبستان کراچی کے حوالے سے جن شعراء نے بے شمار سلام تصنیف کیے اور سلام نگاری کو ارتقائی منازل سے ہمکنار کیا ان میں امید فاضلی، بیدار نجفی، وفا کانپوری، برق زیدی، انعام نقوی، رفیق جابر، نعیم میرٹھی، ابرار عابد، حسین جعفری، عروج بجنوری،

آصف عابدی، حیدر اختر کاظمی شامل ہیں۔ ان شعراء کی سلام نگاری میں ایثار و کردار حسینؑ کا بیان، مصائب و آلام کا تذکرہ اور شہادت حسینؑ کے فلسفے کا مقصدی پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان شعراء نے واقعہ کربلا کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے فرق کو بیان کیا۔ جدید و قدیم اسلوب بیان کے حسین امتزاج سے سلام نگاری میں عزائی تاثر قائم رکھنے کی روایت ان تمام شعراء کے سلاموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ عشق علیؑ، عشق حسینؑ، عشق شہدائے کربلا، غم تاجدار کربلا، عقیدت و محبت، عظمت کردار، عظمت انسانیت، شعور ذات، معرفت حق، تزکیہ نفس، عجز و نیاز کا ذکر، ان شعراء کی سلام نگاری کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ان شعراء کی سلام نگاری کے بنیادی موضوع میں اس انقلابی پیغام کو اولیت حاصل ہے جو معرکہ کربلا کا عنوان ہے۔ شعراء نے صنائع لفظی و معنوی اور شوکت الفاظ کے ذریعے خیال و فکر کی ایسی بلیغ تصویر کشی کی کہ شہادت انسانیت کا عظیم مفہوم قاری کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ سلام نگاری میں معرکہ حق و باطل کو مشعل حق کے انداز میں پیش کیا۔ حق و صداقت اور مفہوم شہادت کو تاریخی واقعات میں بیان کرنے کی شاعرانہ کاوش نے سلام نگار شعراء کو اردو شاعری میں عظمت و توقیر کے مراتب سے ہمکنار کیا۔

اب آپ دبستان کراچی کے بعض مشہور اور بعض غیر معروف شعراء کے سلاموں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہے یہی وقت ان کا دامن تھام لے
گرنے والے اب علیؑ کا نام لے
اے شرابی مفت ہے آبِ حیات
موت کے ہاتھوں سے کوئی جام لے (علامہ رشید ترائی)

نازاں ہیں رنگ و بو پہ بہت نودمیدہ پھول
اے قلب داغ داغ دکھا چیدہ چیدہ پھول
خود جن لیے مشیت پروردگار نے
اے کربلا کی خاک ترے برگزیدہ پھول (رئیس امر دہوی)

جو فرش خاک سے پہنچائے عرشِ اعظم پر
ہر ایک پر وہ نگاہ کرم نہیں ہوتی (ابن صفی)

جمال روئے اکبر دلیر شیر کیا کہنا
 شباب مصطفیٰ کی ہو بہو تصویر کیا کہنا
 خوشی سے سر کٹانا اور نہ کرنا بیعت فاسق
 یہی ہے فاطمہ کے دودھ کی تاثیر کیا کہنا
 (راجہ صاحب محمود آباد)

کون سی بی بی بجز زینب ہے اس توقیر کی
 ہو جدھر راجع وراثت چادرِ تطہیر کی
 باپ کی گردن کا ہے بیٹی کے بازو پر نشان
 پا گئی ورثہ برابر کا بہن شیر کی
 (آرزو لکھنوی)

اگر تم چاہتے ہو نفس مضمون وفا کہنا
 تو سب سے پہلے سقائے حرم کا واقعہ کہنا
 سفر آلِ ہیمبر کا مدینہ سے مدینہ تک
 تمہیں لازم ہے محسن سلسلہ در سلسلہ کہنا
 (محسن اعظم گڑھی)

کربلا کے ذکر میں تسکین روحانی بھی ہے
 یہ عبادت بھی ہے اپنی مرثیہ خوانی بھی ہے
 اسوۂ شیر میں ڈھونڈو تو کیا ملتا نہیں
 جذبۂ ایثار بھی ہے جوش قربانی بھی ہے
 سوچتا یہ ہوں کہ تیرے سجدۂ آخر کے بعد
 اے امام وقت دنیا تجھ کو پہچانی بھی ہے
 رید مشرب ہی نہیں ہوں میں زمانے میں صبا
 میرا مسلک آلِ احمد کی شاخوانی بھی ہے
 (صبا اکبر آبادی)

مری نگاہ میں چھٹی نہیں شہنشاہی
 نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے
 (ماہر القادری)

اولاد پییر کے دشمن سے گلے ملنا
(ثمر ہوشنگ آبادی) ایماں سے بغاوت ہے ملت سے بغاوت ہے

جب فشار وقت سے انسان گھبرا جائے ہے
کربلا بے ساختہ انساں کو یاد آ جائے ہے
پرورش ذہنوں کی کرتی جا رہی ہے کربلا
آدمی خوابیدہ تھا بیدار ہوتا جائے ہے
وہ ابھرتا جا رہا ہے خیمہ ظلمت سے
دیکھ لو سورج گہن سے اب نکلتا جائے ہے
جب کبھی ہوتا ہے ثاقب ذکر اربابِ وفا
(ثاقب مظفر پوری) کربلا منظر بہ منظر سامنے آ جائے ہے

ہم ہیں غم حسینؑ کا ساماں کیے ہوئے
پلکوں پہ اھک غم سے چراغاں کئے ہوئے
سوتے ہیں اب سکوں سے شہیدان کربلا
(تصویر فاطمہ) صحرائے کربلا کو گلستاں کیے ہوئے

انقلاب انگیز وہ فکر بقا ہوتی نہیں
سیرت خمیر جس کی رہنما ہوتی نہیں
ذکر ہے خمیر کا ساحر مشیت کی عطا
(ساحر لکھنوی) ہر کس و ناکس کو یہ دولت عطا ہوتی نہیں

وحدت افکار قائد میں جماعت ڈھل گئی
(معجز جوہنوری) معجزے سے کم نہیں ہے فکر بیدار حسینؑ

ہمارا دین وفا ہے خوش اعتقادی ہے
 ہمیں حسینؑ نے تہذیب کربلا دی ہے
 زمانہ اس کی نظر میں سمائے کیا سائر
 جو کربلا کی طرف دیکھنے کا عادی ہے
 (ساحر فیض آبادی)

کیا جلا دشت کربلا میں چراغ
 سانس لینے لگے ہوا میں چراغ
 دل میں لو دے اٹھا حسینؑ کا غم
 جل اٹھے خانہ خدا میں چراغ
 (برق زیدی)

اسلام میں کتنے فرقے ہیں اپنی ہے مگر پہچان الگ
 ان سب کی سوچ اپنی اپنی اپنا فکری رجحان الگ
 مدحت تو علیؑ کی جب کرتا توفیق اگر حاصل ہوتی
 مل جاتی زبان پیغمبرؐ یا لکھ سکتا قرآن الگ
 (انعام نقوی)

ہم مجلس شبیر پنا کرتے رہیں گے
 ہم ماتم شامہ شہدا کرتے رہیں گے
 روداد ستم دہر پہ ہو جائے گی روشن
 ہم ذکرِ شہد کرب و بلا کرتے رہیں گے
 برسوں گے مسلسل غم شبیرؑ میں آنسو
 حق اجر رسالت کا ادا کرتے رہیں گے
 (ذابرخ پوری)

غم شبیرؑ سے ہم رشہ جاں رکھتے ہیں
 آنکھ میں اشک نہیں دجلہ جاں رکھتے ہیں
 یہ بھی اعجازِ غم سیط پیہر ہے کہ ہم
 جو بھی غم رکھتے ہیں شامتہ جاں رکھتے ہیں

کربلا نذر عقیدت کے لیے تیرے حضور
اور تو کچھ نہیں سرمایہ جاں رکھتے ہیں (آصف عابدی)

مری تیغ ہے موذت مرے سامنے نہ آنا
مری ڈھال ہے شہادت مرے سامنے نہ آنا
میں حسین آشنا ہوں جو یزید ہے وہ سن لے
مرا صبر ہے قیامت مرے سامنے نہ آنا (عروج بجنوری)

وہ دریا لفظ لفظ کربلا ہے
جو نوحوں سے غزل تک آ گیا ہے
گماں کی شب دیا اس نے بجھا کر
یقین کو اور روشن کر دیا ہے (محشر بدایونی)

سب کے سرتاج شہادت بھلا کب ہوتا ہے
موت سے ہاتھ ملانے کا بھی ڈھب ہوتا ہے
سخت مشکل ہے شہادت گہہ اُلفت کا سفر
جب بھی ہوتا ہے یہاں سر ہی طلب ہوتا ہے
میر و غالب ہوں کہ زیدی ہوں کہ ہوں فیض و علیم
شعر میں رکھتے ہوں مدحت تو ادب ہوتا ہے (حسین جعفری)

صاحبو! صدیوں سے جس کا ذکر خشک و تر میں ہے
آج ہر سجدہ اسی سجدے کے پس منظر میں ہے
کربلا اے کربلا اے خُ پناہوں کی زمیں
حشر تک تاج ملوکیت تری ٹھوکر میں ہے (شاہد جعفری)

کَلْبِ ادراک حدیں اپنی بڑھائے تو لکھوں
 کر بلا دائرۂ فکر میں آئے تو لکھوں
 ہیکر صدق وفا ہے مرا موضوعِ سخن
 دستِ حقِ ذہن میں الفاظِ سجائے تو لکھوں
 (نہیم ردولوی)

دنیا میں ابھی صاحبِ کردار بہت ہیں
 شیر کی عظمت کے پرستار بہت ہیں
 جتنا ہے سرِ نیزہ ہی سرداری کا منصب
 گو لشکرِ اسلام کے سردار بہت ہیں
 (نہیم میرٹھی)

حرفِ سلام نکلا ہے جب بھی زبان سے
 رتبے میں بڑھ گئی ہے زمیں آسمان سے
 عاشور کی نمود سے اسلام کا وجود
 صحرا بھی شہر ہو گیا آخر اذان سے
 (حیدر اختر کاظمی)

خیال و فکر و تصور پہ چھا رہے ہیں حسینؑ
 بھلا رہا ہے جہاں یاد آ رہے ہیں حسینؑ
 نہ مال و زر کی تمنا نہ تخت و تاج کا ڈر
 نئے مزاج کے انساں بنا رہے ہیں حسینؑ
 (اجمل سراج)

سر خمیدہ ہوں کہ اک بار الم رکھا ہے
 رہگوارِ غمِ سرور میں قدم رکھا ہے
 گھر افشاں رہوں تا عمر مگر ختم نہ ہو
 ایسا گنجینہ پس دیدۂ غم رکھا ہے
 آنکھ میں اشکِ عزا دل میں غمِ آلِ رسول
 یہی رنجِ سفرِ ملکِ عدم رکھا ہے
 (ابراہیم عابد)

وہ بے نیام غضب سیف لا کہیں اس کو
 کہو کہو کہ بنائے الہ کہیں اس کو
 وہ ایک منظر تیغ و گلو و نیزہ و دل
 جہاں بھی آئے نظر کربلا کہیں اس کو (احمد نوید)

شہ نے جو حق پہ وارے ستارے چراغ پھول
 تھے کتنے پیارے پیارے ستارے چراغ پھول
 تاریخ کربلا کی نگارش کے واسطے
 معصوم استعارے ستارے چراغ پھول
 اسلام کی حیات کے عنوان بن گئے
 زہرا کے ماہ پارے ستارے چراغ پھول
 کیا ان کی عظمتوں کا تعین کرے کوئی
 خالق جنہیں پکارے ستارے چراغ پھول
 اس کائنات میں ہے فقط ایک گھر وفا
 حق نے جہاں اُتارے ستارے چراغ پھول (وفا کانپوری)

عجیب قطرۂ اشک عزا کا عالم ہے
 رُکے تو زخم ہے بہتا رہے تو مرہم ہے
 مرے خدا مجھے اک اور زندگی دے دے
 غم حسین " کو یہ عمر مختصر کم ہے
 کسی سے ٹوٹے دلوں کا یہ آسرا نہ چھنے
 غم حسین " نہ ہونا بہت بڑا غم ہے
 خدا عمل بھی توفیق دے مگر شاہد
 مری نجات کو ذکر حسین " کیا کم ہے (شاہد نقوی)

در حسینؑ پہ بوسے کو جب صبا نکلی
تو اس کے دوش پہ چلنے کو التجا نکلی
جو ہم نے اسوۂ ابن رسولؐ اپنایا
ہر ایک دل سے ہمارے لیے دعا نکلی
(قاری حبیب اللہ حبیب)

.....
حسینؑ شاہ شہیداں شہید اعظم ہے
حسینؑ رازِ بقائے دوام عالم ہے
یہ آسمان جو اُونچا دکھائی دیتا ہے
در حسینؑ علیہ السلام پر خم ہے
(روشن لکھنوی)

.....
تویر اشکِ غم کی کوئی انتہا نہیں
یہ روشنی ہے روشنی اس سے جدا نہیں
انسانیت نے جب بھی صدا دی چپے مدد
تو نے سنا نہ ہو کبھی ایسا ہوا نہیں
صد شکر تیرے صبر نے یہ حوصلہ دیا
دل سیلِ صدا بلا میں تماشا بنا نہیں
(آصف عابدی)

.....
ظالم کے اقتدار جہالت کی انتہا
جہدِ حسینؑ علمِ نبوت کی انتہا
قائم ہے دینِ حق کی جلی حسینؑ سے
ہو جاتی ورنہ کفر و ضلالت کی انتہا
(سبطین چارچوی)

.....
اگر مظلومیت پر میں کبھی اشعار لکھوں گا
تو ذکرِ کربلا کو مرکز افکار لکھوں گا
علیؑ کے ذکر پر جو معترض ہیں ان سے یہ کہہ دو
علیؑ کا مثل لا دو پھر وہی کردار لکھوں گا
(ظفر عباس ظفر)

لاہور کو پنجاب کے دیگر شہروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں، تہذیب و تمدن کے حوالوں اور علوم و فنون کے مختلف گہواؤں کو ملک بھر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور عزاداری کی مخصوص مجلسوں میں سلام نگاری کی واردات کو عزائی و رثائی تاثر پیدا کرنے میں منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ عزاداری کے حوالے سے منفرد و مخصوص روایات کے ترجمان لاہور کے دو مقام گامے شاہ کر بلا اور امام باڑہ سیدے شاہ ہیں جو لاہور کے ایک ملنگ گامے شاہ اور درویش صفت خاتون مائی آگیاں کے نام سے موسوم ہیں۔ لاہور کی عزاداری میں قولباش خاندان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ (۱۴)

لاہور کی فضا سلام نگاری کے لیے بہت موزوں ہے۔ تقریباً ۱۹۴۸ء سے یہاں سلام خوانی کی مجالس ہو رہی ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کے بقول:

”لاہور میں سب سے پہلا سالہ محلہ تیزاب احاطے میں ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوا۔ باقاعدہ پوسٹر کے ذریعے لاہور میں پہلی طرحی مجلس سالہ محلہ رشی بھون چوک داگر اس میں ۱۹۵۹ء میں منعقد ہوئی۔“ (۱۵)

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں سلام نگاری کو ترقی دینے کے لئے عزاداری کی مجالس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ پہلی محرم سے دس محرم تک لاہور کی فضا سلام خوانی کی محافل و مجالس سے رونق افروز رہتی ہے۔ ان محافل و مجالس میں پیش کیے جانے والے سلاموں کی بدولت لاہور میں سلام نگاری نے بہت عروج حاصل کیا اور جدید سلام نگاری کی روایت بھی مستحکم ہو گئی۔ احسان دانش، احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی نے بہت سے سلام پیش کئے۔

لاہور کی محافل میں سلام نگاری کے آغاز کے سلسلے میں قیصر بارہوی کا نام اولین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں حلقہ شعرائے اہلیت کا قیام عمل میں آیا جس کی صدارت کے فرائض قیصر بارہوی کے سپرد ہوئے اور سیکرٹری کے فرائض وحید الحسن ہاشمی کو سونپے گئے۔ اس حلقے کے زیر اہتمام لاہور میں سلام نگاری کی روایت مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی گئی۔ اس حلقے نے ۱۹۷۴ء میں میر انیس کی صد سالہ برسی اور ۱۹۷۵ء میں مرزا دبیر کی صد سالہ برسی کا اہتمام کیا۔ ان تاریخی موقعوں کی مناسبت سے منعقد ہونے والی مجالس و محافل میں بے شمار سلام پیش کیے گئے۔ سلام کی مختلف محافل کے انعقاد میں قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی اور مسعود رضا خاکی نے اہم کردار ادا کیا جن شعراء نے ان محافل کو سلام کی پاکیزہ روایت سے مالا مال کیا ان میں قیصر بارہوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، وحید الحسن ہاشمی، عاصم گیلانی، سہیل بنارس، سیف زلفی، افسر عباس زیدی، مشکور حسین یاد، مسعود رضا خاکی، کوثر پانی پتی، شائق زیدی، سید راحت حسین، طاہر ناصر علی، نرودش ترابی، ڈاکٹر وجاہت حسین، زیبا ناروی، اثر ترابی، مظفر نقوی، موسیٰ کلیم نظامی، سجاد باقر رضوی، امانت بخاری، شہزاد احمد، کسری منہاس اور حسن زیدی قابل ذکر ہیں۔

اب ذیل میں لاہور کے معروف سلام نگاروں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ ان میں سید الشہد الامام حسینؑ سے والہانہ محبت کے کیا کیا مضامین اور اسلوب ہمارے سامنے آتے ہیں۔

پاس کے ابر کی تخلیق ہیں گوہر کیا کیا
 خشک ہونٹوں نے اچھالے ہیں سمندر کیا کیا
 جنگ بے شیر نے تسخیر کے در کھول دیئے
 اک تبسم کو ملی قوت لشکر کیا کیا (قیصر بارہوی)

لگا کے ٹھیس حرفوں کے آگینوں کو
 بڑا عروج دیا ہم نے ان زمینوں کو
 فلک نے دیکھ کے گلہائے کربلا یہ کہا
 کہاں بسا گئے شہر ان حسینوں کو (ڈاکٹر صفدر حسین)

شب حیات میں تاثیر روشنی کیا ہے
 چلو حسین " سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہے
 غم حسین " ہے پہچان آدمیت کی
 حسین " ہی پہ نہ رویا تو آدمی کیا ہے
 بتا رہا ہے ریاست کو حڑ کا ٹھکرانا
 کرے ضمیر ملامت تو نوکری کیا ہے (سید وحید الحسن ہاشمی)

حسین " کی حق و باطل کے درمیاں کاوش
 پیام عزم و صداقت ہے آدمی کے لیے
 یہ انتخاب تھا بالغ نظر شہیدوں کا
 شکست عارضی لی فتح دائمی کے لیے (سمیل بناری)

وہ ایک شخص خدا سا ہے جو بشر کی طرح
 ہمیں ملا ہے مقدر سے راہبر کی طرح
 حضور! ذات محمدؐ کو کوئی کیا سمجھے
 نہ یہ خدا کی طرح ہے نہ یہ بشر کی طرح

رہے گا پھر بھی اندھیرا بغیر حبِ حسین
ہزار مشعلیں روشن کرو قمر کی طرح (سیف زلفی)

سرِ سناں سچ کے جانے والے سلام تجھ پر
کٹا کے سرِ مسکرانے والے سلام تجھ پر
تو مر کے جینا سکھانے والوں کا رہنما ہے
لبو کی مشعل جلانے والے سلام تجھ پر
لٹائی تو نے حیات اور کائنات پائی
ابد تک پھیل جانے والے سلام تجھ پر (احمد ندیم قاسمی)

رہے گا تذکرہ شبیر کا ہر دور میں باقی
بدل جائے گی محفل مقصد محفل نہ بدلے گا (ظہور چارچوی)

نئی کی آل پر جو لوگ بھی ایمان رکھتے ہیں
مسلمانوں میں وہ اک امتیازی شان رکھتے ہیں (مسعود رضا خاکی)

کربلا میں گو بظاہر مٹ گئی وہ صورتیں
لیکن ان کی سیرتیں اجزائے ایماں ہو گئیں (شائق زیدی)

حفظِ کارِ انبیا ممنونِ کردارِ حسین
ابتداِ کارِ نبوت انتہاِ کارِ حسین (کوثر پانی پتی)

وہ جرِ کربلا کا شہید ہے وہ جو کربلا کا سوار ہے
نئے راستوں کی نوید ہے نئی زندگی کا مدار ہے
وہ جو شامِ شام درود تھی وہ جو صبحِ صبح سجود تھی
وہ جو کربلا سے مہک اٹھی یہ اسی کی فصل بہار ہے

رہ حق میں سر جو کٹا گیا وہ جو مر کے جینا سکھا گیا
وہی روشنی کا وہی صبح نو کا نکھار ہے۔ (ڈاکٹر حسن رضوی)

لے زندگی کا خمس علیؑ کے غلام سے
اے موت آ ضرور مگر احترام سے
کچھ خلد بچ رہی تھی سو جاں دے کے لے گیا
آیا تھا حڑ بھی ورنہ کسی اور کام سے
محسن لحد میں کیوں نہ فرشتے پڑھیں درود
بہلا رہا ہوں ان کو میں تازہ سلام سے (محسن نقوی)

پھیلی ہے جس کے دم سے جہاں میں ضیائے گل
اب وہ چراغ بھی ہوا جاتا ہے ہائے گل
اصغر تمہارے لب پہ تبسم خدا گواہ
دیکھے اگر تو پھر نہ کبھی مسکرائے گل (ہوش عابدی)

حقیقت کا جسے تھوڑا سا بھی ادراک ہوتا ہے
غم شیر میں اس کا گریباں چاک ہوتا ہے
یزیدیت کا دامن تھام لے جو راہ ہستی میں
ہر ایسے شخص کا انجام عبرتناک ہوتا ہے (افسر عباس)

غم حسینؑ سمندر ہے مہریاں جو ہوا
ہر ایک دل میں اترتا ہے نیکراں جو ہوا
غم حسینؑ سے ہر صدق رزق پاتا ہے
غم حسینؑ سخاوت کا آسماں جو ہوا (مشکور حسین یاد)

ہر شمع کی لو میں ڈھل رہا ہے
 بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے
 کیا زندہ سفر ہے کربلا کا
 ہر دور کے ساتھ چل رہا ہے
 اک شخص کا انقلاب دیکھو
 تاریخ کا رخ بدل رہا ہے (گلزار بخاری)

برج عصمت کا آفتاب حسین
 ہے دو عالم میں لاجواب حسین
 جان دے کر رو صداقت میں
 بن گیا روح انقلاب حسین (اثر ترائی)

یوں چلے اہل نظر قافلہ سالار کے ساتھ
 جیسے کرنیں ہوں رواں مہر پر انوار کے ساتھ
 شہر یثرب کے جیلے سر میدان وفا
 سر ہتھیلی پہ لیے آ گئے سردار کے ساتھ (شہر یار زیدی)

کس نے روکا ہے زمانے میں ہوا کا راستا
 ٹھٹھک چلتا رہا ہے کربلا کا راستا
 خون کی سرخی نہ شامل ہو تو کھل سکتا نہیں
 فضل گل کا راستہ ہو یا صبا کا راستا (منیر سیفی)

دشت سے اٹھی جو خوشبو چار سو پھرتی رہی
 لے کے دامن میں شہیدوں کا لہو پھرتی رہی
 ظالموں کی تھی یہی کوشش چھپے خون حسین
 خون کی مہکار لیکن کو بکو پھرتی رہی (زاہد بخاری)

کیسی ہے کربلائے معلیٰ کی روشنی
آبادیوں سے بڑھ گئی صحرا کی روشنی
کعبہ سے آ رہی ہے یہ آواز دمہم
شبیر نے بچائی ہے بطحا کی روشنی (مرزا حامد علی)

حق کا رستہ دکھا گئے شبیر
ہم کو اپنا بنا گئے شبیر
دین اسلام کے بچانے کو
اپنا سب کچھ لٹا گئے شبیر (سعید عالم زیدی)

سبک حیات کی گھڑیاں ہیں موت ٹیکھی ہے
یہ بات ہم نے فقط کربلا میں دیکھی ہے
ورق ورق پہ ہے اس کے علی کے لال کا ذکر
اس افتخار پہ تاریخ ناز کرتی ہے (طاہر ناصر علی)

اللہ اللہ یہ وفور شوق دیدار حسین
ذرے ذرے میں نظر آتے ہیں انوار حسین
ہم مجاہد ہیں ہمارا گھر ہے میدان جہاد
طالب دنیا نہیں ہوتے طلب گار حسین
کاش دانش میرے لاشے پر پڑے بن کر کفن
وہ خنک سایہ کہ جو ہے زیر دیوار حسین (احسان دانش)

زباں پہ نام امام اتام لایا ہوں
جواب جس کا نہیں وہ سلام لایا ہوں
بدل دیا ہے شہیدوں کے خوں نے رنگ فلک
نئی زمین نئے صبح و شام لایا ہوں

بہت عزیز ہے رنگِ غزل مجھے ناصر
غزل کا سوز برنگِ سلام لایا ہوں (ناصر کاظمی)

یارب دکھا دے ایک جھلک اس شہید کی
جس نے لہو پہن کے محرم میں عید کی
ہر عہد تیرا عہد ہے اے شاہِ کربلا
تو قدرِ مشترک ہے قدیم و جدید کی
تیرے سبب ہی درد کی لڑیاں ہیں منسلک
ساجد کی وہ غزل ہو کہ کافی فرید کی (اقبال ساجد)

بدن پہ زخم سجے تھے ٹڈھال چہرا تھا
فرات سامنے بہتا تھا اور وہ پیاسا تھا
مدینہ چھوڑنے کا غم، وہ کاروانِ حسین
سفر کی رات تھی اور چار سو اندھیرا تھا (اسرار زیدی)

عروسِ شام نے کچھ ایسے خال و خد پائے
کہ مانگ بھرنے کو سید لہو لہو آئے
وہ کربلا ہو کہ شہرِ وفا کا میداں ہو
حسینیت تو ہمیشہ ہی سرخرو آئے (اعجاز احمد آذر)

کرتا ہے آسمان بھی جھک کے جسے سلام
ابن علی حسین کا اعلیٰ ہے وہ مقام
سبطِ نبیؐ کے خون سے دیں کے کھلے گلاب
تا روزِ حشر مہکے گی اب کربلا کی شام (اے جی جوش)

سرِ سنان شبِ جاں چراغ کھلنا تھا
پھر اس کے بعد ابد تک یہی اُجالا تھا
سروشِ وقت سے لحات واپس لے کر
اس ایک شخص نے منظر کا رنگ بدلا تھا (اشرف جاوید)

محکم اسی لیے تو ہے رتبہ حسین کا
سب سے عظیم دہر میں شجرہ حسین کا
صحنِ حرم میں خون کو بہنے نہیں دیا
احسان یاد رکھے گا کعبہ حسین کا (افضال شاہد)

ابنِ حیدر کو پلایا نہ ذرا سا پانی
دشمنوں کو بھی پلا دیتی ہے دنیا پانی
کالے کوسوں تو نہیں تھا کوئی دریا ان سے
بن گیا پھر بھی مگر آنکھ کا تارا پانی (انوار قمر)

تشنہ لبِ قتل جو دریا کے کنارے ہوئے لوگ
وہ تھے اس خاک پہ امبر سے اتارے ہوئے لوگ
گردنیں مارو ہماری یا ہمیں قید کرو
ہم ہیں اس جیتی ہوئی جنگ میں ہارے ہوئے لوگ (جوازِ جعفری)

تو دینِ حق کا نقشِ فروزاں ہے یا حسین
تو مظہرِ جلالتِ ایماں ہے یا حسین
انسانیت کو تجھ پہ ہے ناز اور کیوں نہ ہو
تجھ سے فروغِ عظمتِ انساں ہے یا حسین (جعفر بلوچ)

شہید نامدار پہ لاکھوں سلام ہوں
 شایان ذوالفقار پہ لاکھوں سلام ہوں
 جس دوش پر نجات دو عالم کا بار ہے
 اس دوش کے سوار پہ لاکھوں سلام ہوں
 تائب غم شہید رہے جس میں ہر گھڑی
 اس قلب سوگوار پہ لاکھوں سلام ہوں (حفیظ تائب)

تم تو ہر سید شانِ جہاں ہو
 تم قامتِ تکبیر ہو ہم شکلِ ازاں ہو
 نیزے کی آنی تو دلِ احمد میں گڑی تھی
 تم لوگ فقط سر بہ سر نوکِ سناں ہو
 خیمہ تو کجا خیمے کا پردہ نہ ہلا تھا
 آواز سی آئی تھی ”مرے لال کہاں ہو؟“ (خالد احمد)

حسین تو نہ اگر دیں کا پاسباں ہوتا
 کسی جگہ بھی نہ انصاف کا نشاں ہوتا
 نہ داد رس کوئی ہوتا نہ مہرباں ہوتا
 جفا و جور کا طوفان بیکراں ہوتا (سعید اقبال سعدی)

سر کو جو نوکِ سناں تک لے گئے
 اس مکاں کو لامکاں تک لے گئے
 سجدہ کر کے تیغ کے سائے میں آپ
 اس زمیں کو آسماں تک لے گئے (سعد اللہ شاہ)

ڈھلی جو شام تو پچھی بھی اپنے گھر آئے
 سفر پہ ٹکے تو سید نہ لوٹ کر آئے
 بسائے پھرتی ہے آنکھوں میں رنجے صغریٰ
 کوئی تو دشت مسافت سے لوٹ کر آئے
 حیثیت سے کرو اخذ رسم حق گوئی
 سواد جبر میں مشکل گھڑی اگر آئے (ستارسید)

زبان شعر میں کیا کچھ نہ کہہ دیا ہو گا
 مگر وہ درد کا مضمون کب ادا ہو گا
 قدم قدم پہ جلاتا ہوں خون دل سے چراغ
 یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہو گا
 وہ شام شامِ غرباں وہ صبح صبحِ الم
 عجیب وقت تھا جانے وہ وقت کیا ہو گا (سید رضی ترمذی)

یوں دشمنوں کے نیزے پہ رکھا ہے آفتاب
 اے کربلا کی شام یہ کیا ہے آفتاب
 ہر اک طرف ستم کی گھٹاؤں کے باوجود
 کس شان سے چمکتا دمکتا ہے آفتاب
 محتاج میں تو گردشِ افلاک کا نہیں
 ہر روز میرے دل میں لکتا ہے آفتاب (شہزاد احمد)

لاکھ امکان روزگار میں تھے
 روز و شب کس کے اختیار میں تھے
 وہ کہ دوشِ نبی کی زینت تھی
 اپنی اُمت ہی کے حصار میں تھے (شہرت بخاری)

ذروں میں عکس ریز رخ ماہتاب ہے
 صحرا میں خیمہ زن پیر بو تراب ہے
 جلوے بکھر رہے ہیں جمال رسول کے
 خیمہ گہہ بتوں ہمہ آفتاب ہے
 ہر زخم لا الہ کی تفسیر ہے ظہیر
 جسم حسین آیۂ اُم الکتاب ہے

(ظہیر کا شمیری)

جرات و کردار کی باد بہاری کو سلام
 اے غرور فقر تیری شہر یاری کو سلام
 اے جسارت آدمیت اور شرافت کے امام
 تیرے ہر موقع ادائے جاٹاری کو سلام
 ریت پر آیاتِ خوں سے آیتیں کرنا رقم
 اس انوکھی شان کی قراں نگاری کو سلام

(عبدالحمید عدم)

پانی نہ ہوا جس کو میسر لب دریا
 لہریں اسے رو جاتی ہیں آ کر لب دریا
 آنکھوں میں کسی طور پہنچ ہی گیا پانی
 دیتا رہا پہرہ کوئی لشکر لب دریا
 خیموں میں بڑی دیر سے تشویش ہے تابش
 آتا ہی نہیں ہے کوئی جا کر لب دریا

(عباس تابش)

محرم کی مجالس میں عزاداری کا موسم ہے
 کہ یہ سبٹ پیمبرؐ کی عزاداری کا موسم ہے
 روح حق میں کٹے گا سر مگر اُف تک نہیں ہوگی
 کہ یہ کارِ محبت میں وفاداری کا موسم ہے

(علی اصغر عباس)

غم حسین میں یوں دل کے داغ جلتے ہیں
 بھری بہار میں جس طرح باغ جلتے ہیں
 انہیں ملا غم دنیا مجھے حسین کا غم
 مرے نصیب سے اہل فراغ جلتے ہیں
 خیال جب بھی کریں کربلا کی عظمت کا
 ندیم لگتا ہے جیسے دماغ جلتے ہیں
 (غفر علی ندیم)

غم کوئی بھی نہ ملا ہم کو ترے غم کی طرح
 زندگی ہم نے گزاری ہے محرم کی طرح
 اپنی خوشیوں میں بھی شامل ہے تری یاد حسین
 اپنے ہونٹوں پہ تبسم بھی ہے ماتم کی طرح
 زندگی اپنی کئی اشک فشانی میں قہقہے
 ہم تو ہیں پھول پہ روتی ہوئی شبنم کی طرح
 (قتیل شفائی)

آتے نہ کربلا میں جو سردار کربلا
 کھلتا کہاں پہ عقدہ دشوار کربلا
 تفسیر مصحف رخ شہر کے لیے
 آئینہ خود ہے حاشیہ بردار کربلا
 (کرامت بخاری)

سر نیزہ جو روشن ہو گیا ہے
 رسول پاک کے گھر کا دیا ہے
 ترے گھر میں جگہ کیا پائے دنیا
 ترا خیمہ نہیں شہر وفا ہے
 عزا دارو یہاں چلتے ہیں آنسو
 خریدارو یہ بازار رضا ہے
 (نجیب احمد)

اشک میں گھل گیا لبو سرخ ہوا فضا کا رنگ
 عرصہ جاں پہ چھا گیا پھر وہی کربلا کا رنگ
 کس سے بھلا وہ ٹل سکے عزم ہو جب حسین کا
 کون اسے بدل سکے رنگ ہو جب خدا کا رنگ
 (ڈاکٹر خورشید رضوی)

ہے دل میں جاگزیں مرے روضہ حسین کا
 دیکھو تو مجھ پہ فضل ہے کتنا حسین کا
 کوئی نہ اس کو روکے گا باب بہشت پر
 ہے جس کسی کے پاس حوالہ حسین کا
 کیسے سلام لکھتا مظفر یہ تھا محال
 احسان جو مجھ پہ ہوتا نہ مولا حسین کا
 (مظفر نقوی)

روشن کیے ہے دہر کو جلوہ حسین کا
 عالم میں چار سو ہے اُجلا حسین کا
 پھیلا گیا زمانے میں نور خدا کی ضو
 سورج کو مات دے کے ستارا حسین کا
 ہم چل رہے ہیں اس لیے نقش حسین پر
 جنت سے ہے ملا ہوا جادہ حسین کا
 (اعجاز ثقلین بخاری)

اے افتخار مسجد و منبر سلام لے
 اے کشتی نجات کے لنگر سلام لے
 ممکن نہیں مثال تری عالمین میں
 صبر و رضا و عشق کے پیکر سلام لے
 (علی ضیغم ہمدانی)

میرے لبوں پہ ذکر تھا شب بھر حسین کا
 مہر کرم ہے دل کے افق پر حسین کا
 قدموں میں ہر مسرت دنیا پڑی رہے
 غم ہو اگر کسی کو میر حسین کا
 زیر قدم ظل ہما مستقل رہے
 محمود سایہ جس کے ہو سر پر حسین کا
 (راجہ رشید محمود)

چہرہ کہیں نہ زرد ہو مہر منیر کا
 لینے لگا ہوں نام جناب امیر کا
 سینے پہ داغ ماتم شہر کا ہے نور
 کام آئے گا لحد میں یہ توشہ فقیر کا
 (خوشتر علی خوشتر)

صد گو نہ کیوں بلند نہ ہو شان کربلا
 لخت دل رسول ہیں مہمان کربلا
 سجدہ گہہ جبین عقیدت بنی رہی
 دنیائے دل میں ارض شہیدان کربلا
 (فدا حسین فدا)

زور شہر دکھایا جائے
 خیر ظلم گرایا جائے
 پھر نہ لوٹ آئے کہیں دور یزید
 ذکر شہر سنایا جائے
 شاخ ظالم کا جو لگتا ہے امین
 اس پرندے کو اڑایا جائے
 مر کے جینا تو تجھے آتا ہے
 یہ ہنر سب کو سکھایا جائے
 (نقاش ہاشمی)

سلام نگاری سے متعلق لاہوری روایت کو پروان چڑھانے میں جن سلام نگاروں نے موضوع کی مطابقت کو پوری فکری و فنی توجہ سے قائم رکھا اور تاریخی واقعات کو منفرد نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ان میں سجاد باقر رضوی، ظفر شارب، زیبا ناروی، اثر ترابی، ڈاکٹر وجاہت حسین، سید راحت حسین، ہوش عابدی، امانت بخاری، کسریٰ منہاس، حسن عسکری کاظمی، مظفر نقوی، خالد احمد، عاصم گیلانی، حسن رضوی، شبیہ الحسن، عبدالکریم خالد اور نواز زیدی کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔ ان شعراء نے سلام نگاری کے موضوعات مثلاً عقیدت و احترام، خیر و شر کی آویزش، فلسفہ حیات و ممات، سوز و گداز اور تاریخی واقعات کو اس طرح بیان کیا کہ فکری تسلسل اور تقائی منازل طے کرتا چلا گیا۔ لاہور کی محافل مسالہ جو مختلف امام بارگاہوں اور ذاتی رہائش گاہوں پر منعقد ہوئیں سلام نگاری کو ارتقائی منازل سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ بنیں۔

لاہور کی طرح راولپنڈی میں سلام نگاری کی روایت مخصوص علاقائی اور سماجی روایات کے پیش نظر ارتقائی منازل طے کرتی چلی گئی۔ مذہبی اور ادبی ذوق و شوق کے حوالے سے راولپنڈی کا علاقہ ملک کے باقی علاقوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں سب سے عظیم الشان ادبی جلسہ میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر مختلف عنوانات و موضوعات کے تحت ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ یہ جلسہ دبستان انیس کے زیر اہتمام لیاقت ہال میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں پاکستان کے مشاہیر دانشور، ادیب اور شاعروں نے شرکت کی۔ دبستان انیس راولپنڈی کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس کے روح رواں ڈاکٹر سید سبط حسن تھے انہوں نے عمر بھر راولپنڈی کے لوگوں میں مرثیہ نگاری اور سلام نگاری کا ذوق پیدا کیا۔ دبستان انیس کے زیر اہتمام ہر سال محافل مسالہ منعقد ہوتی ہیں۔ یہ محافل و مجالس امام باڑہ کرل مقبول، امام باڑہ یادگار حسین، علی مسجد شاہ چن چراغ، حیدری مسجد میں منعقد ہوتی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی میں سلام نگاری کی روایت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدیم و جدید رنگ اور مخصوص علاقائی لہجے میں سلام نگاری نے اہل راولپنڈی کے ذوق و شوق سے ملک بھر کے ادبی حلقوں کو متعارف کرایا۔ جن سلام نگاروں نے اس علاقے کی روایت کے پیش نظر سلام لکھے ان میں صفی حیدر دانش نیساں، اکبر آبادی، سید فیضی، ناصر زیدی، کلیم سائلی، پیر صاحب گولڑہ شریف، افتخار عارف، ڈاکٹر ظہیر فتح پوری، تجل حسین اختر، سجاد بزر واری، نشاط مقبول نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان تمام شعراء کی سلام نگاری میں منفرد فکر و تخیل کے رنگ میں نظریہ زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ سلام نگاری میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ زندگی بہت بڑی قوت ہے جس کا عملی نمونہ امام حسین کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ عام طور پر سلام نگاری کے لئے سادہ اور صاف زبان استعمال کی گئی ہے۔ فکر و خیال کو سلیقے اور حسن اسلوب کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ حافظ سعدی، نظیری، انیس، داغ، اقبال، جوش، نسیم امر و ہوی، نجم آفندی اور سیما اکبر آبادی کے کلام کا رنگ راولپنڈی کے ماحول کو سلام نگاری کی پاکیزہ روایت سے سرفراز کرنے والے تمام شعراء کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ عظمت انسان، عظمت نفس اور حق و صداقت کا بیان ان تمام شعراء کی سلام نگاری کا بنیادی رجحان ہے۔

سرگودھا کے علاقے کو سلام نگاری سے متعارف کرانے میں جوہر نظامی کی کاوشوں کو بہت دخل ہے۔ انہوں نے خلوص اور دلی تقاضوں کے پیش نظر سلام نگاری کا آغاز کیا اور انیس و دہیر کا رنگ اختیار کیا۔ آپ قیصر بارہوی اور ڈاکٹر صفدر حسین سے بہت متاثر ہوئے۔ نجم آفندی نے ان کے سلاموں کو سنا اور بہت سراہا۔ جوہر نظامی نے سرگودھا میں مرثیہ و سلام نگاری کی ترقی و ترویج کے لئے بزم ادب قائم کی۔ انجمن ترقی اردو سرگودھا نے انہیں ”ممتاز الشعراء“ کے خطاب سے نوازا۔ فیض محمد گوہر جعفری اور ظہیر الدین حیدر نے جھنگ کے علاقے میں سلام نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔ فیض محمد گوہر جعفری کی سلام نگاری زبان و بیان، ندرت و جدت اور موضوع و مقصد کے حوالے سے شہرت کی حامل ہے۔ ظہیر الدین حیدر، میر انیس، میر نفیس، مرزا عشق اور سید آل رضا کے کلام سے متاثر ہیں۔ ان کی سلام نگاری میں روایتی اسلوب نظر آتا ہے۔ انہوں نے شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب اور حقائق کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا۔

خلش پیر اصحابی نے بھکر کے ادبی ماحول کو سلام نگاری سے متعارف کرایا۔ نجم آفندی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سلاموں میں نجم آفندی کا رنگ نمایاں ہے۔ زبان کا لطف، محاوروں کی چاشنی، تخیل کی بلندی اور الفاظ کا موزوں استعمال خلش کی سلام نگاری کی خصوصیات ہیں۔ خیال و فکر کے ساتھ تراکیب و اصطلاحات میں جدت خلش کی سلام نگاری کو انفرادیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ ساہیوال میں سلام نگاری کی روایت کے حوالے سے جعفر شیرازی کا نام محتاج بیان نہیں۔ انہیں سلام کہنے کا ملکہ ہے۔ ان کے جذبات میں پاکیزگی، خیال میں صداقت، الفاظ میں شیرینی اور اسلوب میں ندرت ہے۔ سلام نگاری کے مختلف محاسن مثلاً عقیدت و احترام، سوز و گداز اور اظہار خلوص ان کے سلاموں میں جلوہ گر ہیں۔ انہوں نے سلام نگاری کی روایت کے حوالے سے نامساعد حالات سے سمجھوتہ کی بجائے سینہ سپر ہونے کا درس دیا کیونکہ حق و باطل کے تصادم میں ہی راز بقائے دوام پوشیدہ ہے۔ ان کے سلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ دن بھی آئے اسیران کربلا کے لئے
کھڑے ہیں اہل ستم آج انتہا کے لئے
حسین کے مقابل یزیدیت ہے مگر
کوئی بقاء کے لئے ہے کوئی فنا کے لئے

عاصی کرنالی، حبیب محمد حبیب اور محسن نقوی نے ملتان کے ادبی حلقوں میں سلام نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔ ان شعراء کی سلام نگاری جوش، خطابت، جذبے اور احساس کے ساتھ ساتھ عقیدت، تقدس اور مقصد و مطلب کے اظہار کا موثر ذریعہ ہے۔ جب حسین شہدائے کربلا کا احترام اور آل نبی کی عظمت و بزرگی کے ذکر سے سلام میں عزائی تاثر اور پاکیزگی کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

سلام نگاری کے آغاز و ارتقاء ترقی و ترویج کے نقطہ نظر سے بہاولپور کے علاقے کو بھی نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ آغا سکندر مہدی نے بہاولپور میں سلام نگاری کی روایت کو پختہ کیا۔ اگرچہ انہوں نے غزلیں اور مرثیے بھی لکھے لیکن سلام نگاری میں انہیں اپنے کلام میں انفرادیت حاصل ہے۔ انہوں نے جدید تقاضوں کے پیش نظر سلام نگاری کو نئے اسلوب سے متعارف کرایا۔ تاریخی واقعات اور قرآن و حدیث کے اجزاء سے بھی سلام نگاری کو مزین کیا۔ ان کی سلام نگاری میں رقت آمیزی قابل غور ہے۔

اثر جلیلی، محشر رسول نگری، اور مقبول جان، پیرم غوری، رفیق راز، عابد شاہ عابد نے کونہ کے ماحول کو سلام نگاری کی محافل و مجالس سے بارونق بنا دیا۔ ان شعراء نے جذبہ دل کو عقیدت کے ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کی سلام نگاری میں الفاظ کا انتخاب، تشبیہ و استعارے کا استعمال سلام نگاری کے معنوی جوہر کو بخوبی نمایاں کرتا ہے۔

پاکستان میں اردو سلام کے فروغ میں چاروں صوبوں کا کردار مثالی رہا ہے تاہم پنجاب اور سندھ کے شعرا نے اس صنف کی خوب آبیاری کی جس کا مختصر سا خاکہ گزشتہ صفحات پر آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان کی سلام نگاری کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(ا) پاکستان میں ایسے سلام نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جو محض حصول ثواب کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ انہوں نے انیس و دہیر کے رنگ شاعری کو حرز جاں بنائے رکھا اور عمر بھر اس کا تحفظ کرتے رہے۔ ان میں نسیم امروہوی اور ان کے سینکڑوں عزیز شاگرد شامل ہیں۔

(ب) پاکستان میں ایسے سلام نگار بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنے سلاموں کو حسینی فکر اور پیغام حسینی کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ ”دماغ وضع کیے اور دل بنا دیے“ ان شعرا میں نجم آفندی، آل رضا اور ان کے مقلدین شامل ہیں۔

(ج) پاکستان میں ایسے سلام نگار شعرا کا بھی ایک طبقہ موجود ہے جنہوں نے سلاموں کو آزادی اور حریت کا علم بنایا اور اپنے سلاموں کے ذریعہ خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی بلخ سعی کی۔ ان میں جوش، مصطفیٰ زیدی، قیصر بارہوی اور اسی قبیل کے سینکڑوں شاعر موجود ہیں۔

(د) پاکستان میں سلام نگاروں کو ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جس نے فروغ سلام نگاری کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ انہوں نے محض خود سلام نہیں کہے بلکہ دوسروں کو اس پر آمادہ کیا۔ ان کی یہ مساعی جلیلہ کام آئیں اور آج پاکستان میں اردو سلام نگاروں کی ایک فوج ظفر موج موجود ہے۔ اس گروہ میں سید وحید الحسن ہاشمی (لاہور)، ڈاکٹر سبط حسن (راولپنڈی)، عاصی کرنالی (ملتان)، شاہد نقوی (کراچی)، جوہر نظامی (جوہر آباد)، مسعود رضا خاکی (لاہور) وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

سلام نگاروں کے یہ چاروں گروہ اپنی اپنی سطح پر کام کرتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی علمی اور شعری کاوشوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ عصر حاضر میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اردو میں سلام نہ کہا ہو۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مختصر پاکستانی سلام نگاری کے نمایاں رُخوں اور محاسن پر ایک نظر ڈال لیں۔
پاکستانی سلام نگاری کی روایت میں شہادت حسین کا حوالہ نئے انقلابی ابعاد کے ساتھ ملتا ہے۔ کردار حسین کی انقلابی معنویت کو روشن کرنے میں جوش کی شاعری نے نہایت اہم خدمت انجام دی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں حسین کو حریت و آزادی کے مظہر کے طور پر پیش کیا۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں قوم کو جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا شعراء کو ان کا پورا احساس تھا۔ انہوں نے قوم کو آزادی کی نعمت سے آگاہ کرنے کے لئے اپنے فکر و عمل میں انقلابی رنگ پیدا کیا اور اس انقلابی رنگ کو سانچہ کربلا کے حوالوں سے پختہ کر دیا۔ جوش کے علاوہ یہ انقلابی رنگ نجم آفندی، سید آل رضا اور ڈاکٹر سید صفدر حسین کے سلاموں میں بہت نمایاں ہے۔ نجم آفندی حضرت امام حسین کی انقلابی شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر ایک ذرہ بے حس میں اک تڑپ بھر دی

دماغ وضع کئے دل بنا دیئے تو نے

سلام نگاری کی پاکستانی روایت میں ایک اہم اسلوب خطیبانہ انداز ہے جوش نے مقصد کے اظہار اور عقیدت و احترام کے بیان میں جوش خطابت سے کام لیا ہے۔ جوش کی سلام نگاری کی اس خصوصیت کا دیگر شعراء نے بھی اطباع کیا۔ سلام نگاری میں بلند آہنگی کا تاثر خطیبانہ انداز کی بدولت ہے۔ جوش کا رنگ خطاب ملاحظہ ہو:

اہل بیت پاک کی ہر سانس کو اے مدعی

ہاں ملا کر دیکھ لے آیات قرآنی کے ساتھ

پاکستانی سلام نگاری کی روایت میں عصر حاضر کی سیاسی و سماجی صورت حال کے واضح نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان کی سلام نگاری سے متعلق شعراء مثلاً جوش، نسیم امروہوی، سید آل رضا، نجم آفندی، قیصر بارہوی اور وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری میں عصری شعور کے تقاضوں کی تکمیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ان شعراء نے اپنے دور کے آشوب اور زبوں حالی کے حوالے سے سلام لکھے اور اپنی ذاتی، سماجی، معاشرتی پریشانیوں کا حل اتباع رسول، اتباع علی اور اتباع حسین میں تلاش کیا۔ اس طرح سلام نگاری میں ایک جہت روشناس ہوئی۔

بڑے شکوہ سے باطل سے جنگ جاری ہے

نہ تب یزید سے مرعوب تھا نہ اب ہے حسین

اب اس سے بڑھ کر محبت کا قرب کیا ہو گا

اس انتشار میں انسان کی طلب ہے حسین

عقیدت و احترام کی پاکیزہ خصوصیت سلام نگاری کی بنیاد رہی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد سلام نگاری کی اس مقدس خصوصیت کا رنگ پختہ ہوتا چلا گیا۔ جوش نے اپنی سلام نگاری میں آہ و فغاں کی بجائے فلسفہ شہادت کو عقیدت و احترام کی بنیاد قرار دیا۔ نجم آفندی کی سلام نگاری میں شہدائے کربلا کے کردار کی عظمت اور فلسفہ شہادت جس حسن و تاثیر کے ساتھ پیش ہوا وہ عقیدت و احترام کے بیان میں انفرادیت کا رنگ ابھارنے کے لیے کافی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد آل رضا، نسیم امر و ہوی، رئیس امر و ہوی، ضیاء موسوی، صبا اکبر آبادی، صبا لکھنوی، شاہد نقوی، وحید الحسن ہاشمی، قیصر بارہوی، سیف زلفی، سہیل بنارس، کوثر پانی پتی اور دیگر تمام شعراء کی سلام نگاری میں عقیدت و احترام کی مستحکم روایت دکھائی دیتی ہے۔ نجم آفندی کے سلام میں عقیدت کا رنگ ملاحظہ ہو:

شہید ظلم غریب الدیار کیا کہنا
حسین * درد کے پروردگار کیا کہنا
بڑھا تھا کفر کہ اسلام کا نشان نہ رہے
تڑپ کے روک لیا دل پہ وار کیا کہنا

ارض پاکستان میں پروان چڑھنے والی سلام نگاری کی روایت میں خلوص و صداقت کا عنصر غالب ہے۔ سلام گو شعراء کی نظر میں میدان کربلا میں حق و صداقت کی آواز بلند کرنے والا مجاہد اعظم مثالی کردار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس مثالی کردار سے والہانہ عقیدت و احترام کے تقاضوں کو خلوص و صداقت کے ذریعہ ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔ خلوص و صداقت کی وجہ سے سلام نگاری میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کے سلام میں رنگ خلوص دیکھئے:

زباں پہ نام امام اٹام لایا ہوں
جواب جس کا نہیں وہ سلام لایا ہوں
فراٹ خون جگر میں ڈبو کے نوک قلم
پیام درد مئے خاص و عام لایا ہوں

قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری میں رٹائی و عزائی تاثر کو مقصدی عنصر کی حیثیت سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ سلام نگاری میں عزائی تاثر، آہ و فغاں اور نالہ و زاری کی کیفیت کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ صبر و ہمت، قناعت و استقلال، ایثار و قربانی کے رویوں کا اظہار ہے۔ یہی اظہار ہمیں جوش، سید آل رضا، نجم آفندی، قیصر بارہوی، صبا اکبر آبادی اور وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری میں غالب دکھائی دیتا ہے۔ سلام نگاروں نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے واقعات کے ساتھ ساتھ دیگر شہدائے کربلا خاص طور پر علی اکبرؑ اور علی اصغرؑ کی شہادتوں، حضرت زینبؑ اور حضرت سکینہؑ کے کرداروں کو پیش کر کے عزائی تاثر ابھارنے کی فنکارانہ کاوشوں کا ثبوت دیا۔

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا
 غریب دیتے ہیں پرسہ تمہارے پیاروں کا
 سلام اس پہ جو زحمت کش سلاسل ہے
 مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے

قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری عقیدت سے زیادہ تھقل پسندی کی طرف گامزن ہے۔ معاشرتی بے راہ روی کو بے نقاب کر کے اسوۂ سید الشہداء اور شہدائے کربلا سے آزادی فکر حق گوئی اور بے باکی کی روش کو اپنانے کی شدید خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ جدید شعراء کے نزدیک واقعہ کربلا فکر پیغام دعوت عمل اور درس حیات سے آگاہ کرتا ہے لہذا اب شعراء کے سلاموں میں فکری اشعار کی تعداد زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید صفدر حسین کا سلام ملاحظہ کیجئے:

حسین دہر میں تیرا پیام آج بھی ہے
 کہ اقتدار کو سجدہ حرام آج بھی ہے
 جو تیغ سے نہ جھکا اس کو سرکشی نہ کہو
 کہ اس غرور کا ایمان نام آج بھی ہے

پاکستان میں سلام نگاری کی روایت میں مقصدیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ پاکستانی سلام گو شعراء نے اپنے سلاموں میں واقعات کربلا کی بجائے اس پیغام جذبہ ایمان اور جوش کردار کا سبق دینے کی کوشش کی جس نے کربلا کے شہیدوں کو حیات جاوداں عطا کی۔ کربلا کے واقعات سید الشہداء حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء کی داستان ایثار و شہادت اور واقعہ عزم و قربانی اپنے اندر لازوال بصیرتیں رکھتا ہے۔ اس لیے سلام کے کہنے والے بعض صورتوں میں اس فن سے قوم میں ملی بیداری قومی شعور اور العزمی اور یقین پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستانی شعراء نے اپنے سلاموں میں حق و باطل اور خیر و شر کی آویزش میں آزادی ضمیر اور اعلیٰ انسانی قدروں کی پاسداری کا بیڑا اٹھایا۔ سہیل بناری کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

حسین کی حق و باطل کے درمیاں کاوش
 پیام عزم و صداقت ہے آدمی کے لیے

ارض پاکستان سے متعلق سلام نگار شعراء نے واقعات و حالات کے بیان اور فلسفہ شہادت کو فصیح و بلیغ انداز میں پیش کرنے کے لئے رزمیہ لہجہ اختیار کیا۔ اکثر سلام نگاروں نے جنگ کے مناظر بیان کر کے جذبہ احساس کو متاثر کیا۔ رجزیہ اشعار اور حرب و ضرب کے ہنگاموں کی تصویریں سلام نگاری کے عزائی تاثر کو نمایاں کرتی ہیں۔ سلام نگار شعراء نے شمشیر و شہسواری اور اہل کربلا کی شجاعت خوش خرامی تیز گامی کی ایسی دلاویز تصویر کھینچی ہے کہ فن جنگ میں مہارت بہادری اور استقامت پر دل سے داد و تحسین نکلتی ہے۔ حضرت امام حسین کی رجز میں زور آوری کا ذکر کم اور دیگر فضیلتوں کا ذکر خاص سلام نگاری میں تقدس پاکیزگی

اور عقیدت و احترام کے جذبات کو نکھارتا ہے۔ ڈاکٹر یا اور عباس کا رزمیہ لہجہ ملاحظہ ہو:

شہر کی یہ جنگ ہے اعظمت للہ
میدان نگاہوں میں ہے اللہ نظر میں
کیا فوج تھی کیا جنگ تھی انجام تو دیکھو
تاریخ کا رخ موڑ دیا چار پہر میں

سلام نگاری میں جدید رنگ کا آغاز جوش نے کیا اور قیام پاکستان کے بعد اس جدید رنگ کو مزید نکھارنے کا سہرا سید آل رضا، نسیم امروہوی اور نجم آفندی کے سر رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب پاکستان میں سلام نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو ہندوستان سے کثیر تعداد میں سلام کو شعراء پاکستان میں منتقل ہوئے۔ ان سلام گو شعراء میں سے اکثر قدیم رنگ میں سلام کہتے۔ پاکستان میں جدید سلام نگاری کا آغاز ہو چکا تھا چنانچہ سلام نگاری میں قدیم و جدید کے امتزاج سے حسین اور دلکش رجحان پیدا ہونے لگا۔ جن شعراء کے سلام قدیم و جدید کے سنگم دکھائی دیتے ہیں ان میں نسیم امروہوی، سید آل رضا، قیصر بارہوی، احسان دانش اور سید صفدر حسین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

اک حشر نو تھا معرکہ کربلا کے بعد
جب چادریں چھنی ہیں امام ہدیٰ کے بعد
ہر حادثہ ہے ایک پیام ثبات نو
یعنی بقا کی راہ کھلی ہے فنا کے بعد

قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری کی روایت میں رمز و ایمائیت کو فصاحت و بلاغت کی تکمیل کے لیے اپنایا گیا۔ جوش کی سلام نگاری میں تشبیہوں، استعاروں اور شوکت الفاظ کی ترکیبوں کو استعمال کرنے کا فنکارانہ سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ معانی میں وسعت پیدا کرنے اور سطح نظر کو بلیغ انداز میں بیان کرنے کے لئے نئے نئے الفاظ، رموز اور استعارے استعمال کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی سلام نگاری میں ندرت، جدت اور تازگی کے عناصر غالب نظر آتے ہیں۔ جوش کو الفاظ پر حکمرانی کا سلیقہ آتا تھا۔ ان کی سلام نگاری میں وجد آفریں رمز و ایمائیت دکھائی دیتی ہے۔ جوش کے علاوہ نسیم امروہوی، نجم آفندی، استاد قمر جلالوی، قیصر بارہوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، وحید الحسن ہاشمی، شاہد نقوی، عاصی کرناٹی اور ساحر فیض آبادی کے سلام رمز و ایمائیت کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ قیصر بارہوی کے ایک سلام کے اشعار دیکھئے:

پیاس کے ابر کی تخلیق ہیں گوہر کیا کیا
خشک ہونٹوں نے اُچھالے ہیں سمندر کیا کیا
جنگ بے شیر نے تسخیر کے در کھول دیئے
اک تبسم کو ملی قوت لشکر کیا کیا

پاکستان کی سلام نگاری سے متعلق شعراء نے واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے حوالے سے محاکاتی انداز بیاں میں جس فنکاری اور شاعرانہ مہارت کا ثبوت دیا وہ ہر سلام کے الفاظ سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ میدان جنگ، واقعات جنگ، شہدائے کر بلا کے ایثار و کردار کے بیان حضرت حسینؑ کے حسن سلوک، ہمت و جرأت کے واقعات کے بیان میں محاکاتی رنگ سلام نگاری میں حقیقت و صداقت کا عنصر نمایاں کر دیتا ہے۔ واقعات کے مناظر کی تصویروں کو فطری انداز میں بیان کر کے شعرائے کرام نے قوت تخیل اور خلوص و عقیدت کا ثبوت دیا۔ منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں جذبہ و احساس کی ترجمانی محاکاتی رنگ میں پختگی کا سبب بنی۔ سلام نگاری کے محاکاتی انداز میں جوش، نسیم امروہوی، نجم آفندی، سید آل رضا، صبا اکبر آبادی، زیبا ردولوی، قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی اور احسان دانش کو بہت نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ احسان دانش کا نمونہ کلام دیکھیے:

تلوار سے تلوار جو بجتی تھی جھٹا جھٹا
جھٹکار کا نوحہ تھا ہوا پر لب دریا
تیغوں سے کٹیں سرو صوبہ کی قطاریں
بجھتے ہوئے دیکھے مہ و اختر لب دریا

گزشتہ صفحات میں ہم نے پاکستان میں اردو سلام نگاری کے حوالے سے جو معروضات پیش کیے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں سلام کا مستقبل نہ صرف یہ کہ تابناک ہے بلکہ عصر حاضر کی بدلتی ہوئی شعری صورت حال میں یہ صنف مقبول عام و خاص ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ صفحات میں طوالت کے خوف سے ہم نے پاکستان کے اہم سلام نگاروں کی چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام سلام نگاروں کا علیحدہ علیحدہ خصوصی مطالعہ کیا جائے اور ان کے فن اور فکر پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔ آئندہ صفحات میں ہم پاکستان کے چند نامور سلام نگار شعرا کا اجمالی تذکرہ کر رہے ہیں تاکہ ان کی فکری و فنی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے۔

احسان دانش (۱۹۱۳ء-۱۹۸۲ء)

اصل نام احسان علی والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ اس نسبت سے احسان دانش کہلائے اور دانش ہی تخلص کیا۔ احسان دانش ۱۹۱۳ء میں کاندھلہ (ضلع مظفرنگر) یو۔ پی میں اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئے۔ معاشی عدم استحکام کے باعث چوتھی جماعت ہی میں سکول چھوڑنا پڑا۔ تلاش معاش میں در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ تعلیم کی عدم تکمیل نوکری کے راستے کا بھاری پتھر بنی۔ کاندھلے میں ادبی فضا سازگار تھی اس لئے اس محنت کش کو کبھی ایک آدھ شعر سننے کو مل جاتا تو رات بھر نیند نہ آتی۔ آخر شعری ذوق اور فطری صلاحیت رنگ لائی۔ انہوں نے امرتسر میں بھی ایک مرتبہ غزل پیش کی اور اول انعام کے حق دار ٹھہرے۔ قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنا پڑی۔ ایام اسیری میں مقدمے کی پیروی کے لئے کلکتہ گئے تو ان کی ملاقات جیل

مظہری ڈاکٹر اختر چند رائے پوری اور وحشت کلکوی سے ہوئی۔ دانش نے شعر و سخن کی آبیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی اور سلام بھی کہے۔

احسان دانش سلام نگاری کے قدیم مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کے سلام میں کربلا کے اسباب و نتائج بالخصوص موضوع بنے ہیں لیکن وہ اسوہ بشیرتی سے سبق دینے کا فرض فراموش نہیں کرتے۔ یوں ان کے سلام قدیم اور جدید طرز احساس کا آمینہ دار ہیں۔

ذیل میں احسان دانش کا ”نمونہ سلام“ دیکھئے:

ہر حادثہ ہے ایک پیامِ ثبات نو
یعنی بقا کی راہ کھلی ہے فنا کے بعد
کہنے کو قتل اور ادائے سجودِ شکر
دعویٰ رضا کا کون کرے اس رضا کے بعد
گو نجبا نہ ایسا نعرۂ حق پھر کسی طرف
ہے کربلا سکوت میں اس اک صدا کے بعد
درگاہِ ایزدی میں یہ سوئے ادب نہ ہو
محسوس کر رہا ہوں ندامت دعا کے بعد
دانش پڑھو درودِ محمد کے نام پر
اپنا تو اک وہی ہے سہارا خدا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں قتلِ حسین ہے
اسلام لہلہا نہ سکا کربلا کے بعد (۱۶)

جب آ کے رکا شام کا لشکر لب دریا
آتا تھا نظرِ عرصہ محشر لب دریا
تلوار سے تلوار جو بجتی تھی جھٹا جھٹا
جھنکار کا نوحہ تھا ہوا پر لب دریا
تیغوں سے کٹیں سروِ صنوبر کی قطاریں
بجھتے ہوئے دیکھے مہ و اختر لب دریا (۱۷)

اللہ اللہ یہ دنور شوق دیدار حسین
 ذرے ذرے میں نظر آتے ہیں انوار حسین
 زندگی میں جو رہے ہیں عاشق زار حسین
 وہ قیامت میں انھیں گے محو دیدار حسین
 دور تجدید شہادت غالباً نزدیک ہے
 اب نظر آتے ہیں ہر مومن میں آثار حسین
 جب یہاں ہوتے ہیں میدان بلا کے معرکے
 جسم میں رفتار خوں ہوتی ہے رفتار حسین
 یوں بھی کعبے میں دعائیں مانگتے ہیں اہل ذوق
 دل بدرگاہ خدا منہ سوئے دربار حسین
 تھکنہ تکمیل رہ جاتا ہے آئین جہاد
 ہو نہ جب تک ہر مجاہد آئینہ دار حسین
 مطمئن تفسیر قرآن سے بھی ہے دنیا مگر
 اب ضرورت ہے کہ ہو تشریح کردار حسین
 ہم مجاہد ہیں ہمارا گھر ہے میدان جہاد
 طالب دنیا نہیں ہوتے طلبگار حسین
 کاش دانش میرے لاشے پر پڑے بکر کفن
 وہ خشک سایہ کہ جو ہے زیر دیوار حسین (۱۸)

اسیر فیض آبادی (م ۲۷ جون ۲۰۰۳)

علی حیدر، تخلص اسیر قلمی نام اسیر فیض آبادی، اسیر و صی فیض آبادی کے بھائی تھے جو آل رضا کے شاگرد تھے۔ اسیر
 عرصہ سے کراچی میں مقیم تھے اور سلام کے علاوہ منقبت اور مرثیہ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ (۱۹) ان کے مجموعہ کلام میں مرتبہ
 کے علاوہ سلام بھی شامل ہیں۔ مجموعہ وجود خامہ کے عنوان سے ۱۹۹۹ میں شائع ہوا۔

اسیر فیض آبادی سلام نگاری کی قدیم روایت کے پاسدار ہیں۔ ان کے سلام ذکر آل محمد سے عبارت ہیں۔ اور وہ اس
 صنف کو اس کے قدیم لوازمات تک محدود رکھنے کے قائل ہیں جس کے مطابق ذکر حسین بذات خود عبارت ہے۔ اسے داد و دہش

کے حصول کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ تاہم وہ ذکر اہل بیت سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا سبق بھی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسینؑ نے جس عزم و ہمت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مظاہرہ کیا وہ امت مسلمہ کے لئے ایک روشن مثال ہے جس کی پیروی میں نجات ہے۔ اسیر فیض آبادی باقاعدہ ”عنوان“ کے تحت سلام کہتے ہیں۔

”جمود خامہ“ سے منتخب چند سلام ملاحظہ کیجئے:

جس روزے کردارِ حسینی پہ نظر ہے
 رخشندہ میری شام ہے تابندہ سحر ہے
 مقصود اگر جادۂ ایماں کا سفر ہے
 یہ دیکھ لو بس پرچمِ عباس کدھر ہے
 یہ نورِ ولا سلسلۂ ذکرِ حسینی
 ہر دور کی ظلمت میں اُجالوں کا سفر ہے
 میں ذرہ ہوں شہر کے قدموں میں پڑا ہوں
 جلوہ تو وہ دیکھیں جنہیں توفیقِ نظر ہے
 آسودہ تری چھاؤں میں ہے دینِ پیہر
 سربز ترے خون سے ایماں کا شجر ہے
 موقوف ہیں زہرا کی سفارش پہ دُعائیں
 ہو اُن کا وسیلہ تو دُعاؤں میں اثر ہے
 جو تیری طرح موت کو سینے سے لگا لے
 وہ مر نہیں سکتا ہے وہ انساں امر ہے
 تو نورِ سراپا بھی ہے صادق بھی امیں بھی
 اور کیوں نہ ہو آخر تو محمدؐ کا پسر ہے
 شہر کا سرِ شام کا بازارِ تلاوت
 کیا اب بھی یہ پوچھو گے کہ اسلام کدھر ہے
 یہ زخم ہے نیزے کا کہ اکبرؑ کے جگر میں
 سینے پہ سجا تمغۂ اعزازِ ظفر ہے

عابد سے نہ ٹکرا ابھی موجود ہے زیست
اے حاکم کوفہ یہ امامت کی پر ہے
گھر سے جسے بے گھر کیا خیمے بھی جلائے
اب ہر دل زندہ اُسی مظلوم کا گھر ہے (۲۰)

.....

جس دل میں عظمتِ شہِ دیں کی ضیا نہیں
پھر اس میں ظلمتوں کی کوئی انتہا نہیں
اب تک ترا مثل جہاں میں ہوئی نہیں
تاریخ میں حسین کوئی دوسرا نہیں
یہ زیست کچھ بھی خوابِ گراں کے سوا نہیں
گر محورِ شعور و نظر کربلا نہیں
شہرِ تو ہے گردشِ کونین سے بلند
سورج ترے جہاں میں کبھی ڈوبتا نہیں
دنیا پہ ہو گیا یہ اتامن سے آشکار
چھوڑا تجھے تو دین نہیں مصطفیٰؐ نہیں
ایثار و صبر و ضبط و وفا طاعتِ الہ
اے سبطِ مصطفیٰؐ تیری سیرت میں کیا نہیں
کعبے کو جس نے اپنی حفاظت میں لے لیا
وہ کون سی زمیں ہے اگر کربلا نہیں
ہاری ہے اس کے ایک تبسم سے فوجِ ظلم
کہتا ہے کون طفلِ شہِ دیں لڑا نہیں
پہنچا گئی فراتِ شہرِ جس جگہ
دیں اُس حدِ شعور سے آگے بڑھا نہیں
ہر کلمہ گو سے پوچھ رہا ہے شعورِ دہر
کیا شہ کا خونِ رگِ مصطفیٰؐ نہیں

دل میں حسین ہیں تو نبی ہیں خدا بھی ہے
 کعبہ وہاں نہیں ہے جہاں کربلا نہیں
 پا جائیں دخل اس میں اندھیرے تو کیا عجب
 جس گھر میں تیرے نام کا طغریٰ لگا نہیں
 خود قید بے ردا ہیں حرم راہِ شام سے
 عابد سا بھی اسیر اسیر جفا نہیں (۲۱)

اللہ اللہ کیا حسین ابن علی کی شان ہے
 روح زہراً قلب حیدر مصطفیٰ کی جان ہے
 جس کو حاصل فاطمہ کے لال کا عرفان ہے
 ہے قسم انسانیت کی بس وہی انسان ہے
 تیرے ہر اقدام کی تائید میں قرآن ہے
 تو محمد مصطفیٰ کے خون کی پہچان ہے
 سرفروشی کی ادا کی ہے تجھ سے اے حسین
 ذاتِ اقدس ہے تری یا سورۃ رحمن ہے
 اپنے دشمن پر بھی الطاف و عنایت اے حسین
 مرحلہ دار و رسن کا اب بہت آسان ہے
 معترض کیوں ہیں محبت پر مری اہل جہاں
 جب بیاضِ مدحتِ شہید خود قرآن ہے
 دیکھ کر ایثار تیرا دم بخود ہیں جن و انس
 کارناموں پر ترے کل بزمِ کن حیران ہے
 فاطمہ کا گھر سجا ہے مسکراتے ہیں نبی
 کس کی آمد کے لیے یہ جشن کا سامان ہے
 آج بھی فتنہ کو حاصل ہے تلاوت کا شرف
 گود میں شہید ہیں یا رحل پر قرآن ہے

ساری دنیا صدقِ پیغمبرؐ سے واقف ہو گئی
 اے نبیؐ کے لال یہ دیں پر ترا احسان ہے
 تیرے خوں کی موج سے شاداب ہے کثرتِ حیات
 مزرعِ ہستی پہ اک یہ بھی ترا احسان ہے
 از محمدؐ تا محمدؐ ایک جلوہ ایک نور
 سب کے سب مہرِ ولا ہیں گھر کا گھر قرآن ہے
 پیغمبرؐ کا مرتبہ کیا پوچھتے ہو اے اسیر
 جس کے دل میں یہ کہیں ہیں اُس کا دل قرآن ہے (۲۲)

امانت بخاری (۱۹۲۰ء)

اصلی نام سید امانت حسین، قلمی نام امانت بخاری اور تخلص امانت تھا۔ امروہہ میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ والد سید نیاز علی شاہ طب کے پیشہ سے وابستہ تھے اور مذہبی مزاج کے حامل تھے۔ امانت بخاری دس برس امروہہ کی عزائی فضا میں رہے۔ انہوں نے سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ غزل سے شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۵ء میں مدح اہل بیت شروع اور پچیس سال تک اسی وادی کی سیر کرتے رہے۔ (۲۳)

امانت بخاری کے نزدیک ذکرِ اہل بیت عبادت کا درجہ رکھتا ہے چنانچہ شعر گوئی نہ ان کا مشغلہ شب و روز ہے نہ انہوں نے اسے اپنا مشغلہ بنایا ہے وہ فقط ذکرِ آلِ رسولؐ سے قلب و روح کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ (۲۴)

ذیل میں امانت بخاری کے چند سلام حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ جو مقالہ نگار کے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ امانت نے سلام کو اس کی روایت سے بھی الگ نہیں ہونے دیا تاہم تشبیہات، استعارات اور محاورات کے بر محل استعمال سے سلام کی ادبی حیثیت بھی برقرار رکھی ہے۔

یہ شانِ منزلِ معراج تھی عبادت کی	سر حسینؑ نے نیزے پہ بھی تلاوت کی
شہید ہو گئے خود مٹ گئے نہ بیعت کی	گلا کٹا کے زمانے پہ بادشاہت کی
سر حسینؑ ہوا اس طرح جدا تن ہے	کہ کربلا سے حدیں مل گئیں قیامت کی
خیالِ بخششِ اُمت حسینؑ کیا کہنا	جھاؤں کی نہ خدا سے کوئی شکایت کی
زمانہ شرحِ بذبحِ عظیم اب لکھ لے	گھڑی قریب ہے شہیدؑ کی شہادت کی
یہ پاسِ مرضی حق تھا یہ شوقِ نصرت دیں	علیؑ نے سو کے گزاری ہے راتِ ہجرت کی

وہ پہلا نقش قدم ہے امام اول کا کہ جس کو منزل آخر کہیں عبادت کی
 غم حسین ہے دل میں تو خوف محشر کیا
 خبر وہ لینے کو آئیں گے خود امانت کی (۲۵)

صاحب ایماں ہے جو اس کو یہ ارماں کیوں نہ ہو
 اہل بیت پاک کا کوئی ثنا خواں کیوں نہ ہو
 کی عطا جبریل سے سائل کو جب انگشتی
 پھر ترے در کا گدا فخر سلیمان کیوں نہ ہو
 ہر لڑائی میں ہے تنہا فاتح کفر تمام
 میرا آقا میرا مولا کل ایماں کیوں نہ ہو
 کس قدر ہے جامع و مانع حدیث کربلا
 آدمی اتنا اگر سمجھے تو انساں کیوں نہ ہو
 ماتم شیر میں ہو جس کا دامن تار تار
 اس کے سر پر ساقی کوثر کا داماں کیوں نہ ہو
 جب فقط رنج و الم پر ہی ہے بنیاد حیات
 زندگی وقف غم شاہ شہیداں کیوں نہ ہو
 میں امانت دار مدح اہلیت پاک ہوں
 منتظر مرے لئے پھر قلب رضواں کیوں نہ ہو (۲۶)

جو پھول منتخب تھے باغ شہ زمیں میں
 باد خزاں نے لوٹے وہ کربلا کے بن میں
 ہے زلزلہ زمیں میں خورشید ہے گہن میں
 لو بجھ گیا چراغ قبر رسول رن میں
 تحویل ہو رہے ہیں وہ عمر جاوداں میں
 لمحے گزر رہے ہیں جو ذکر پختن میں

لے آئی فکر مدح آل رسولؐ بطحا
 ورنہ ازل سے آتا میں اور اس انجمن میں
 محشر میں یہ ہر اک کے پرسانِ حال ہوں گے
 پرسانِ حال جن کا کوئی نہیں ہے رن میں
 قدرت نے جن کی خاطر پیدا کیا یہ عالم
 ملتی نہیں اماں بھی ان کو اب اس چمن میں
 اے انقلابِ دوراں! لوٹے گئے ہیں مہماں
 پہلے یہ رسم کب تھی اس عالم کہن میں!
 چھوڑیں نہ چادریں بھی سیدانیوں کے سر پر
 کیا لوٹ پڑ گئی تھی کرب و بلا کے بن میں (۲۷)

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸-۱۹۸۲)

شبیر حسین خاں نام جوشِ تخلص، قلمی نام جوشِ ملیح آبادی تھا (خاندانی نام شبیر احمد خاں تھا) ملیح آبادی میں پیدا ہوئے ان کے دادا محمد احمد خاں صاحب دیوان شاعر تھے جبکہ پردادا فقیر محمد خاں گویا کوٹناخ سے تلمذ تھا۔

۱۹۵۵ء میں پاکستان آئے۔ ۱۹۲۸ء میں پہلا مرثیہ ”آوازہ حق“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں ”حسین اور انقلاب“ کے عنوان سے ایک اور مرثیہ شائع ہوا۔ اس عہد میں انہوں نے سلام بھی کہے جن میں انہوں نے کردارِ حسینؑ کی انقلابی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظم ”ذاکر سے خطاب“ نہایت اہمیت کی حامل ہے اس میں سانحہ کربلا سے معنوی تعلق قائم کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔ جوش کے سلاموں نے برصغیر کے عوام کے سیاسی شعور کو جلا بخشنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:

تو نے حسینؑ دہر کو ششدر بنا دیا
 طوفاں کو ناؤ سیل کو لنگر بنا دیا
 ان تلخیوں کو قند بنایا جو زہر تھی
 پھر مسکرا کے قند مکرر بنا دیا
 جس اک عدو میں دولت ذبحِ عظیم تھی
 تو نے اس اک عدو کو بہتر بنا دیا (۲۸)

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
بام جدال و گرورہ عزم کا ہے شوق
اورنگ کی ہوس ہے نہ افسر کی آرزو (۲۹)

.....

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ
دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ
حشر تک زندہ ہے ترا نام اے ابنِ رسولؐ
کر چکا ہے تو وہ احساں نوعِ انسانی کے ساتھ
ان کے آگے صولتِ دنیا کا ذکر او ابنِ سعد
کھیلتی ہے جن کی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ
باندھتی ہو کیا ہوا اے ابہرمن کی آندھیو!
کھیلنا آساں نہیں ہے شمعِ یزدانی کے ساتھ
ہمتِ معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر
یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ
آنکھ میں آنسو ہوں سینے میں شرابِ زندگی
موجہٗ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
اہل بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ
جوشِ ہم ادنیٰ غلامانِ علی مرتضیٰؑ

تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ (۳۰)

جوش کی سلام نگاری میں ان کے مرثیوں کا حسنِ سٹ آیا ہے چنانچہ نسیم امروہوی نے جوش کے حسن بیان کا تذکرہ

”مرثیہ جوش“ میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اے شاعرِ حیات! ترا ذہن برقِ طور
جلوہِ قلن ہے روحِ معانی کا جس میں نور

عہد آفریں تھا تیرا شعور آفریں شعور
الفاظ دست بستہ تھے حاضر ترے حضور
ہر شعر سے پناہ فصاحت پناہ تھا
الکیم لفظ و ملک معانی کا شاہ تھا (۳۱)

حسن رضوی (۱۹۴۶-۲۰۰۲)

اصلی نام سید حسن عباس رضوی۔ قلمی نام حسن رضوی اور تخلص حسن کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی۔ تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ حکومتی سطح پر انہیں پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ دیا گیا۔ حسن رضوی نے غزل، نظم، گیت، دوہے، نعت، منقبت اور سلام میں طبع آزمائی کی۔ نظم کے علاوہ نثر میں سفر نامے، انٹرویوز اور کالم بھی لکھے۔ انہیں بین الاقوامی مشاعروں اور سیمینارز میں شرکت کے مواقع بھی حاصل ہوئے چنانچہ بھارت، لندن، متحدہ عرب امارات، کلاسکو، ناروے کے متعدد سفر کئے۔ حسن رضوی کی صحافتی خدمات اظہر من الشمس ہیں وہ ”جنگ“ ”شہاب“ ”مشرق“ ”مسادات“ ”اخبار جہاں“ میں کالم لکھتے رہے اور ادبی ایڈیشن کے انچارج رہے۔ انہیں بین الاقوامی سطح پر پندیرائی نصیب ہوئی چنانچہ قاضی عبدالغفار ایوارڈ (بھارت)، ”جاز ایوارڈ“ (بھارت)، ”افتخار حسین ایوارڈ“ (اوسلو، ناروے) انہی کے حصہ میں آئے۔ صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ایف سی کالج رہے۔

ان کی ۲۱ کتابیں مختلف ادبی موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ وفات کے بعد مناقب و سلام کا مجموعہ ”عقیدتیں“ ۲۰۰۳ میں شائع ہوا اور انعام یافتہ کتاب قرار پائی۔ اس میں ۱۴ سلام ہیں۔
حسن رضوی مرحوم کے چند سلام بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

مانوس ہوں اتنا ترے کربل کی زمیں سے
میں فن کہیں ہوں مگر اٹھوں گا وہیں سے
کربل سے نجف تک ہو سفر آخری میرا
بس اس کے سوا کچھ نہیں مانگوں گا کہیں سے
مکہ ہو مدینہ ہو نجف ہو کہ مدائن
ہر ایک کو نسبت ہے فقط اپنے مکیں سے
تیروں کے مصلے پر ترا سجدہ آخر
ہوتا ہے عیاں روز نمازی کی جبیں سے

یکتا ہے فقط احمد مرسل کا گھرانہ
 اللہ بھی ملتا ہے تو ملتا ہے یہیں سے
 بیعت کے طلب گار کو یہ یاد رہے گا
 زندہ ہیں حسین " ابن علی " ایک نہیں ہے
 کر بل تری مٹی کا یہ اعجاز ہے ورنہ
 ملتی ہی نہیں خاک شفا اور کہیں سے
 جب چاند نکلتا ہے محرم کا سر شام
 اک ہوک سی اٹھتی ہے حسن قلب زمیں سے (۳۳)

حق کی صداقتوں کی نشانی حسین ہے
 دنیا میں انقلاب کا بانی حسین ہے
 صحرا میں اس کے صبر کی تحریر میں پڑھوں
 دریا کی موج پیاس ہے پانی حسین ہے
 سیرت ہے فاطمہ کی تو صورت علی کی ہے
 دنیا میں مصطفیٰ کی نشانی حسین ہے
 چھینٹے لہو کے لفظ کی صورت ہیں خاک پر
 ہے کربلا کتاب کہانی حسین ہے
 دشمن کو جس نے اپنے لہو سے شکست دی
 وہ مرد حق وہ حیدر ثانی حسین ہے
 رضوی ہر ایک لفظ ہے اُس کا دیا ہوا
 ہر موجہ نفس کی روانی حسین ہے (۳۴)

حسن رضوی کے سلاموں کے بارے میں سید وحید الحسن ہاشمی رقم طراز ہیں۔ پیغمبر اسلام کی مدحت سرائی کے بعد سب
 سے زیادہ اشعار امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کے بارے میں کہے گئے ہیں..... وہ مختلف اشعار میں یہ بات دہراتے ہیں کہ ذات
 امام حسینؑ ذات رسول کریمؐ سے مشتق ہے۔ (۳۵)

ذابر فتح پوری

اصلی نام محمد قاسم قلمی نام ذابر فتح پوری اور تخلص ذابر تھا۔ فتح پوری (بھارت) میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں ۱۶ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔

۱۹۶۹ء میں سلام گوئی کا آغاز کیا اور دیگر اصنافِ سخن سے منہ موڑ لیا۔ آپ نے ۳۰۰ سلام کہے۔ ذابر اس وقت تک سلام کے لئے قلم نہیں اٹھاتے تھے جب تک آپ کے احساسات اور مشاہدات آپ کو شعر گوئی کی تحریک نہ دیتے۔ ذابر کے ہاں فکری عناصر کی گہما گہمی ہے۔ وہ سلام کے حوالے سے اخلاقیات کا درس بھی دیتے ہیں اور معاشرتی ناہمواریوں کا تذکرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ذابر کے سلام میں غزل کا سار چاؤ موجود ہے۔ ادبی اعتبار سے ذابر کے سلام اس لئے اہم ہیں کہ ان میں نئی اور اچھوتی تراکیب نے جگہ پائی ہے اور ان کے ہاں ایسے بلیغ اشارے موجود ہیں جو قاری اور سامع کی سوچ کو متحرک کرتے ہیں۔ ذابر کے سلاموں میں نجم آفندی اور جوش کے طرزِ احساس کی بوباس محسوس ہوتی ہے۔ ذابر کے سلاموں کا پہلا مجموعہ ”سلام و کلام“ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا جس میں ۱۳۹ سلام ہیں۔

نمونے کے طور پر چند سلام ملاحظہ کیجئے:

دلوں پر نقش ہے نام شہ ابرار برسوں سے	رواں ہے گردنوں پر خنجر خوار برسوں سے
نہ کیوں نکرائیں ساحل سے سراپنا مضطرب ہو کر	بسی موجوں میں ہے عباہ کی لٹکار برسوں سے
سنا جب قاتلوں کا حشر کلیاں کھل گئیں دل کی	تھے محو آہ و گریہ عابد بیمار برسوں سے
کبھی کا ہو چکا ہے کربلا میں فیصلہ لوگو	مگر حق سے ہے باطل برسرِ پیکار برسوں سے
کتاب اللہ ہے خاموش لیکن نشر کرتے ہیں	پیام زندگی شہیر کے آثار برسوں سے
خدا جانے خدا والے بھٹک جاتے ہیں کیوں آخر	نشانِ راہ ہے شہیر کا کردار برسوں سے
خبردار اے عزادار غم شہ کی امانت سے	ہیں مائل ذکر شہ پر حاشیہ بردار برسوں سے
جنہیں بابِ دیارِ علم کی باتوں سے نفرت ہے	نہ جانے کیوں وہ بیٹھے ہیں پس دیوار برسوں سے
ولایت کا انہیں اقرار اب اس آ نہیں سکتا	ولایت سے جو کرتے آئے ہیں انکار برسوں سے
نقوشِ مذہبِ فطرتِ خطوطِ سیرتِ عترت	مٹانے پر تلے ہیں دین کے غدار برسوں سے
سیلتے سے نہ آیا آج بھی جینا مسلمان کو	نظر کے سامنے ہے زیست کا معیار برسوں سے
نظر آئیں نہ کیوں ابنِ زیاد و شراب ہر جا	ہے خفتہ میان میں مختار کی تلواریں برسوں سے

بنا دو ساری دنیا کو گلستاں اے عزادارو کہ پھر ہے آتش نمرود شعلہ بار برسوں سے
وہی تنگِ زمانہ ہیں جنہیں ظالم سے اُلفت ہے وہی ہیں ماتمِ مظلوم سے ہزار برسوں سے
قدمِ خفتہ زباں بیدارِ گم سم ہیں قلم جن کے نظر آتے ہیں وہ رہبر ہمیں بیمار برسوں سے
نہیں ہے رہبروں کے دل میں احساسِ توانائی کسی کی منتظر ہے منزلِ دشوار برسوں سے
وہ کہتا ہے کہ تو رہزن، وہ کہتی ہے کہ تو رہزن چلی آتی ہے روز و شب میں یہ تکرار برسوں سے
مزاراتِ مقدس کس کے باحالِ پریشاں ہیں ہیں گم سم کیوں مدینے کے درو دیوار برسوں سے
عدوئے آلِ احمد کو نہ حاصل ہو سکی ذاب

میسر ہے ہمیں وہ نعمت پندار برسوں سے (۳۶)

آگ دریا میں لگا کر جواڑی پیاس کی آج ہر طرف پھیل گئی حکمتِ عباس کی آج
کہنے کو ٹوٹ گئی بچوں کی اُمید۔ مگر آس کے پھولوں کو کھلا نہ سکی یاس کی آج
جذبہ کار نے ٹھکرا دیا دریا کا بھرم بس کے موجوں میں رہی حسرتِ عباس کی آج
دل بد عہد کو تنویرِ وفاداری کی آج بھی دیتی ہے سوزِ دل عباس کی آج
اللہ الحمد کہ لگنے ہی نہ دی دل کو کبھی الفت حضرت عباس نے وسواس کی آج
سایہ پرچمِ عباس سے باوصفِ وفا اخذ کیوں کرتے نہیں اہل ولا پیاس کی آج
یاس کی آج بنا پائی نہ کندن جن کو راس آ سکتی نہیں ان کو کبھی آس کی آج
جو پلے پل کے بڑھے بس کے رہے کانٹوں میں راس کیوں آئے انہیں پھولوں کی بو باس کی آج
نظر و قلب کو بے عیب بنا دیتی ہے آتشِ حُبِ علیؑ سورہ والناس کی آج
قوم کو مقصدِ حق تابِ طے گا کیسے رمنے جنے لگے جب قلب میں خناس کی آج
گرمیِ حُبِ علیؑ سے نہیں کچھ کم ذاب

دیکھئے کھا کے ذرا اُلفتِ عباس کی آج (۳۷)

ہنگامِ صبح کوفہ میں نفسِ نبیؐ کی موت شب کے سرہانے روشنیِ زندگی کی موت
پگھلا سکی نہ جن کے دلوں کو نبیؐ کی موت پگھلائے کیسے ان کے دلوں کو علیؑ کی موت
نفسِ خدا کو خلقِ خدا پر ہے اختیار! اس کی خوشی کی زندگی اس کی خوشی کی موت
اس موت کی نظیر بھی آتی نہیں نظر ہے لاجواب موتِ وصیِ نبیؐ کی موت

رکھتی ہے پھونک پھونک کے انسانیت قدم
 سچ پوچھیے تو مرگِ خلافت کی اوٹ میں
 قبلِ نشور حشر قیامت سے کم نہیں
 ہر گام پر ہے اہل نظر کی نگاہ میں
 مرنے کا گر سکھاتی ہے دنیا کی زندگی
 دنیا میں دوستی کی فضا سازگار ہو
 غربت نصیب، مفلس و نادار کا شباب
 ایمان بیچتا ہے جو مسجد میں بیٹھ کر
 ایسے ادب کو کرتے ہیں ہم دور سے سلام
 بھولے سے بھی نہ لیتا کوئی شاعری کا نام
 شاعر کی موت ہوتی اگر شاعری کی موت

ذابہ ملول ہوتے ہیں ہم غم کی موت پر
 ہم کو ملول کر نہیں سکتی خوشی کی موت (۳۸)

ساحر فیض آبادی

اصل نام سید اشتیاق حسین رضوی۔ قلمی نام ساحر فیض آبادی اور تخلص ساحر ہے۔ ۱۹۳۰ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور درس و تدریس کو پیشہ بنایا۔ ابتدا میں شعر و سخن کی طرف راغب تھے لیکن زندگی کی ناہمواری کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پاکستان آنے کے بعد صبا اکبر آبادی اور وحی فیض آبادی کی تحریک پر پھر سے سخن پوری کرنے لگے۔

ساحر کے سلام اور نوحے ۱۹۷۱ میں ”بیاض تنظیم العزرا“ کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۹۲ میں دوسرا مجموعہ کلام کعبے سے کربلا تک جبکہ تیسرا مجموعہ حرا سے حرم تک ۲۰۰۱ میں شائع ہوا۔

ساحر فیض آبادی صبا اکبر آبادی کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے حمد، نعت، سلام، منقبت، نوحے اور قطعات کہے ہیں۔ ان کے ہاں ادب برائے زندگی کا نظریہ موجود ہے۔ وہ مشکل زمینوں پر سلام کہنا پسند کرتے ہیں۔ ساحر سانحہ کربلا کے اسباب و نتائج کو بنیاد بنا کر سلام کہتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں مقصد حسینیؑ کی جا بجا جھلک موجود ہے۔ البتہ ایک تخصیص یہ ہے کہ وہ اصحاب حسینؑ کو بطور خاص اپنے سلاموں میں موضوع بناتے ہیں اور غم حسینؑ کے ساتھ ساتھ غم اصحاب حسینؑ سے بھی اپنے سلاموں کو اعتبار بخشنے ہیں۔ انہیں غم کی کیفیت کو سلام میں پیش کرنے پر پوری قدرت ہے کہ سلام کا ایک بنیادی مقصد یہی ہے۔

ذیل میں ساحر کے مجموعہ ہائے کلام سے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کہے ماں یہ کس سے جا کر کہ بگڑ گیا مقدر
میری کیا خطا تھی اصغر جو تجھے فضا نے لوٹا
ہوئے قتل شاہ دیں جب تو پکاری رن میں زینب
میرا بھائی مجھ سے چھوٹا مجھے کربلا نے لوٹا (۳۹)

ہنگام قیامت ہے مصیبت کی گھڑی ہے
شمیر کے ماتم میں مگر جان لڑی ہے
حق کے لیے ہم سینہ سپر بن کے رہے ہیں
تاریخ کے ہر موڑ پہ دیوار کھڑی ہے (۴۰)

ساحر دعائے فاطمہ زہرا کے نصیب
اشک غم حسین کی قیمت زہے نصیب
عزم و ثبات مہر و وفا دین و آگہی
صدقہ ہے سب حسین کا جتنا جسے نصیب (۴۱)

بیعت نہ کر کے سبط نبیؐ نے بتا دیا
اکثر غلط بھی ہوتا ہے اُمت کا فیصلہ (۴۲)

کربلا میں جو ہوا عزت اٹھاڑ کے ساتھ
ہوتے سرکار تو ہوتا یہی سرکار کے ساتھ (۴۳)

لب نہر کہتے ہیں غازی کے تیور
ہمارا ہے دریا ہمارا رہے گا
خدا اہل ایمان کے حق کا محافظ
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا (۴۴)

خُر مطمئن ہے چھوڑ کے یوں فوج شام کو
پھینکا ہو جیسے پاؤں سے کانٹا نکال کے (۴۵)

ایسی نہ اتحادِ عمل کی ملی مثال
جیسی بیک زبان بہتر نے بات کی (۴۶)

ذیل میں ”حراسِ حرم تک“ کے صرف تین سلام پیش کئے جاتے ہیں:

زیرِ خنجر یوں ادا شیر کا سجدہ ہوا	سُرخِ د اپنے خدا سے دلبر زہرا ہوا
خون کی برسات، صحرا دھوپ سے تپتا ہوا	اک مسافر پھر بھی دیکھا ہے یہاں ٹھہرا ہوا
دشتِ غربت میں ہیں پیاسے فاطمہ کے لونہال	ہے نبی کے باغ کا ہر پھول مرجھایا ہوا
کہہ کے بدعت تم نے توڑا ہے عزاداروں کا دل	جو نہیں سکتا کبھی یہ آئینہ ٹوٹا ہوا!!
شرک و بدعت کہنے والے دیکھ کر جلتے رہے	چل دیا میں سوئے جنت یا علیؑ کہتا ہوا
کہہ کے غاصب حکمرانوں کو امیر المومنین	نام پر اسلام کے سب سے بڑا دھوکا ہوا
شہ کے ماتم پر کوئی بندش ہو یہ ممکن نہیں	جان دیدیں گے علیؑ والے گر ایسا ہوا
ذوب کرا بھرے ہیں سب کے سب غم شیر میں	ہم ہوئے ساحل ہوا کشتی ہوئی دریا ہوا
زندگی کی ہے ضمانت تذکرہ شیر کا	کر بلا کو زندہ رکھنے والا خود زندہ ہوا
خُر در شیر پر ہے شامیوں کو چھوڑ کر	صبح کو آ جائے جیسے شام کا بھولا ہوا
لے چلا دریا سے پانی بھر کے سقائے حرم	مشک سینے سے لگائے موت سے لڑتا ہوا
مسکرایا اس طرح چھ ماہ کا طفلِ صغیر	چھید کر اصغر کی گردن تیر شرمندہ ہوا
کر بلا میں ہو گیا عاشور کا سورج غروب	پیاسے بچوں کی صدائے العطش سنتا ہوا
ہم وہیں رہ جائیں گے سائر ہمیشہ کیلئے	اب جو قسمت سے دوبارہ کر بلا جانا ہوا (۴۷)

غم کی موجوں میں ابھرنا سیکھو	ذوب کر پار اُترنا سیکھو
کر بلا والے کبھی زندہ ہیں	کر بلا والوں سے مرنا سیکھو
کعبہ بن جائے گا ہر نقشِ قدم	اپنی منزل پہ ٹھہرنا سیکھو
رن میں عباس کے تیور دیکھو	شیر کی طرح بھڑنا سیکھو

حسنِ تدبیر سے تقدیر بناؤ خر کی قسمت سے سنورنا سیکھو
 رخ کا غارہ ہے شہادت کی خوشی رنگ تصویر میں بھرنا سیکھو
 تم افق تاب بھی ہو سکتے ہو روشنی بن کے ابھرنا سیکھو
 علی اصغر کے اشارے پر چلو مسکراتے ہوئے مرنا سیکھو
 صبرِ شبیر بھی ہو پیشِ نظر سجدۂ شکر بھی کرنا سیکھو
 ظالمو! دشمنِ ایمان نہ بنو کچھ تو اللہ سے ڈرنا سیکھو
 چل کے پھولوں کی روش پر سآر خار زاروں سے گزرنا سیکھو (۴۸)

دن سے ہٹے نہ بیعتِ باطل قبول کی سبطِ نبیؐ نے جنگ لڑی ہے اصول کی
 بارہ دری یہ شہرِ علومِ نبیؐ کی ہے یہ انجمن نہیں ہے ظلم و جہول کی
 ٹھہرا ہے کاروانِ رسالتِ غدیر میں یہ کلامِ خدا کے نزول کی
 کیا کیا منافقوں کی ہیں ایذا رسانیاں جیسے بھری ہوں کانتوں سے شائیں بھول کی
 دورِ بنی امیہ کی تاریخ ہے گواہ کس کس نے کتنی دین کی قیمت وصول کی
 بھڑکا سکیں گی ہم کو نہ باطل کی ظلمتیں روشن ہے دل میں شمعِ عقیدتِ بتوں کی
 ہم کر رہے ہیں ذکرِ شہیدانِ کربلا خوشبوِ فضا میں پھیلی ہے زہرا کے پھول کی
 باطل کے آگے جھک ہی نہ سکتے تھے اہل حق بیعت کی بات آلا نبیؐ سے فضول کی
 شیرازۂ حیات کبھی منتشر نہ ہو امت کرے جودل سے اطاعتِ رسولؐ کی
 بے ساختہ نظر میں ابھرتی ہے کربلا سنتا ہوں داستاں جو کسی دل ملول کی
 آندھی اٹھی ہے دیکھ کے زعبت کو سرکھلے چادر تنی ہے دھتِ مصیبت میں دھول کی
 کرتا ہے جو خلوص سے مجلس کا اہتمام آتی ہے اس کے گھر میں سواریِ بتوں کی
 سآر یہ مجلسیں یہ جلوس و شہ عزاء ساری یہ کوششیں ہیں جتناں کے حصول کی (۴۹)

ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی (۱۹۹۲-۱۹۲۸)

ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی یو۔ پی (بھارت) کے ضلعِ اعظم گڑھ میں ۱۹۲۸ کو پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو اور ۱۹۸۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس سے قبل کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے انگلش کر چکے تھے۔ (۵۰) سجاد باقر رضوی پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج میں اپنی سبکدوشی (۱۹۸۸) تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۹۹۲ میں ان کا انتقال ہوا۔

سجاد باقر رضوی بنیادی طور پر نقاد تھے تاہم شاعری بالخصوص غزل ان کی پسندیدہ صنف تھی ان کے دو مجموعے تیشہ لفظ (۱۹۶۸) اور جوئے معانی (۱۹۹۱) میں شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں غزلوں کے علاوہ نعتیں، نظمیں، رباعیات اور سلام شامل نہیں ہیں۔

سجاد باقر رضوی نے ”سلام“ کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی اور ۹ سلام کہے۔ ان کا تعلق جدید سلام نگاروں، نجم آفندی، آل رضا اور سید وحید الحسن ہاشمی کی لڑی سے ہے۔ سجاد باقر رضوی کے سلام میں فکری عنصر کی بہار نظر آتی ہے۔ وہ سانحہ کربلا کے اسباب و نتائج کے ساتھ ساتھ اس سانحے کو جدید عہد کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں سانحہ کربلا اور اس کے متعلقات استعاروں کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کے سلام ان کی غزل کا ایمائیت اور رمزیت کی خوبیوں سے مملو ہیں۔ سجاد باقر رضوی کے سلاموں سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

عجب ہے ماہ عزا میں ہلال کی صورت
نگوں ہے سر تو ہے یکسر ملال کی صورت
جلے ہیں دھوپ میں گل، آندھیوں میں گل ہیں چراغ
نہ موسموں میں رہی اعتدال کی صورت
لہو کے ساز پہ آواز حق کا نغمہ جاں
ہے زندگی کے ہنر میں کمال کی صورت (۵۱)

سرد آہوں کی فضا غم کی گھٹا بھی چاہیے
شہر دل کے واسطے آب و ہوا بھی چاہیے
درد کی باتیں بہت ہیں کربلا کے غم کے ساتھ
ساتھ سننے کے دل درد آشنا بھی چاہیے (۵۲)

ہیں پیکران وفا بستہ رن سر شام
لنا ہے دشت غربی میں کاروان وفا
خود آج بچ کے خنجر کی دھار پر رگ جاں
متاع درد خریدیں گے کشتگان وفا (۵۳)

سیف زلفی (۱۹۳۱-۱۹۹۱)

اصلی نام سید ذوالفقار حیدر رضوی، قلمی نام 'سیف زلفی'، تخلص 'سیف زلفی'۔ ۱۹۳۱ کو بریلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ محکمہ ریلوے میں ملازمت اختیار اور ۱۹۸۸ میں فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ نظم، غزل، دوہے، قطعات، رباعیات، سلام، نعت، مرثیہ غرض یہ کہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ شیکسپیر کے ڈرامے "اوتھیلو" کا منظوم ترجمہ کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

سیف زلفی جدید لہجے کے شاعر ہیں۔ یہی طرز فکر ان کے سلاموں میں بھی موجود ہے۔ ان کے نزدیک فقط زبان سے اہل بیت سے اظہار محبت کافی نہیں بلکہ اعمال و افعال سے بھی اس محبت کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ یوں سیف زلفی، نجم آفندی کے مقلد نظر آتے ہیں۔ پروفیسر نواز حسین زیدی 'سیف زلفی کی سلام نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سیف زلفی بیسویں صدی کے ان سلام نگاروں کی صف میں شامل ہیں جن کے سلام ان کے عقیدے کی تپش سے عبارت ہیں۔ ان کی سلام نگاری نے زبان، اسلوب اور موضوعات کے حوالے سے سلام کی صنف میں گراں قدر اضافے کئے۔ سیف زلفی اپنے عہد کی موثر آواز میں ثابت ہوئے ہیں۔ دیگر اصناف کی طرح سلام کی صنف میں بھی سیف زلفی کی شاعرانہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں بے شک شاعری کے میدان میں آل راؤنڈر ہیں۔ (۵۵)

اب سیف زلفی کے چند سلام ملاحظہ کیجئے:

حق گو کو جب طریقہ اظہار آ گیا	اتنا ہوا بلند سر دار آ گیا
وہ شخص کائنات کی وسعت پہ ہے محیط	جس کی سمجھ میں نقطہ پرکار آ گیا
قربانی حسین کا معیار دیکھ کر	انسان کی سرشت میں ایثار آ گیا
تھرا ابھی ہے شب کہ محمدؐ کا نور عین	لیکر حسین صبح کے آثار آ گیا
ہوتی ہے گفتگو جو حیات حسینؑ پر	وہ سامنے رسولؐ کا کردار آ گیا
پڑھ کر ربز حسین علیہ السلام کے	میرے قلم میں شعلہ اظہار آ گیا
پھر یوں ہوا کہ زیست کے اُبلے جہاز پر	ہم اڑ رہے تھے موت کا کہسار آ گیا
اوروں کو مل گیا ہے لباس سخن وری	میرے بدن پہ خلعت فن کار آ گیا
وہ آ گئی نجف سے ہوا زندگی لیے	وہ کربلا سے ابر گھر بار آ گیا
مجھ سے گناہ گار سر ذکر کربلا	اک بار رو دیا تو انہیں پیار آ گیا
پیانہ یزید کو ٹھوکر سے مار کر	مے خانہ حسینؑ کا مے خوار آ گیا

سننے ہیں آفتاب شہادت کے تذکرے آنکھوں میں ایک اشک ضیا بار آ گیا
 پھیلا تو کوہ و دشت کی وسعت بھی پہنچ تھی سمٹا تو زیر سایہ دیوار آ گیا
 اصغر کورن میں دیکھ کے ہاتھ نے دی صدا شیر کے جہاد کا شہکار آ گیا
 اب مجھ میں کوندتی ہیں شجاعت کی بجلیاں بن کر وہ میرے خون کی لکار آ گیا
 لپکا حسین سیف صداقت لیے ہوئے جب تخت پر یزید ریا کار آ گیا
 دنیا لکھے گی اس کی شجاعت کے تذکرے حق بات کے لیے جو سردار آ گیا
 زلفی کو دیکھتے ہی پکارے ادب شناس
 دربار اہل بیٹ کا فن کار آ گیا (۵۶)

وہ ایک شخص خدا سا ہے جو بشر کی طرح ہمیں ملا ہے مقدر سے راہبر کی طرح
 حضور! ذات محمدؐ کو کوئی کیا سمجھے نہ یہ خدا کی طرح ہے نہ یہ بشر کی طرح
 بغیر حب علی معرفت نہیں ملتی ہزار سال جیئے بھی کوئی خضر کی طرح
 رہے گا پھر بھی اندھیرا بغیر حب حسینؑ ہزار مشعلیں روشن کرو قمر کی طرح
 کدورتوں کے تیر سے اسی کا کاٹ دیا جو خاندان تھے پھولے پھلے شجر کی طرح
 میں اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کروں مجھے حسینؑ ملا ہے تو راہبر کی طرح
 غم حسینؑ کا سورج سکوں کی چھاؤں لیے چمک رہا ہے مرے سر پہ دوپہر کی طرح
 ہوئے شہید جو اکبرؑ تو ہر گلستاں کے گلاب بھیگ گئے میری چشم تر کی طرح
 حسینؑ سے ہے محبت تو اے علیؑ والو اندھیری رات میں چمکا کرو قمر کی طرح
 اے حسینؑ کے در کا کوئی پتہ دے دے یہ رات ڈھونڈ رہی ہے نئی سحر کی طرح
 میں ایک پل میں مدینہ میں ایک پل میں نجف ملی اڑان کی رفعت بھی بال و پر کی طرح

ترا شعور دعا ہے کہ رات دن زلفی
 زمین عقل میں پھولے پھلے شجر کی طرح (۵۷)

شاداں دہلوی

اصلی نام مظفر حسین، قلمی نام شاداں دہلوی، تخلص شاداں تھا۔ ۲۶ اگست ۱۹۳۱ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اسٹیٹ بینک

آف پاکستان سے اسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر سبکدوش ہوئے۔ (۵۸)

نعت، منقبت اور سلام و نوحہ میں طبع آزمائی کی۔ ان کے سلام میں روایت کی پاسداری نظر آتی ہے اور سلام سے غم حسین ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ انہیں مداحی شہیر پر ناز ہے یوں وہ ان سلام نگاروں کی صف میں شامل ہیں جو سلام کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں روایتی سلام کے تمام عنصر موجود ہیں لیکن ادبیت کے جوہر بھی نظر آتے ہیں۔ وہ غم حسین اور غم اصحاب حسین کا ذکر کر کے روح کی بالیدگی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ شاداں کا مطالعہ تاریخ ان کے سلاموں سے عیاں ہے وہ ایک ہی سلام میں تاریخ کے بہت سے ابواب بیان کر جاتے ہیں ان کے سلام میں غزل کا سارنگ و آہنگ موجود ہے لیکن وہ سلام کے موضوعات سے دور نہیں ہوتے۔

شاداں دہلوی کے مجموعہ کلام ”مناقب قربی“ سے چند سلام نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان منتخب سلاموں سے ”شاداں“ کی سلام نگاری کے محاسن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

باپ کے سینے پہ سوتی تھی جو بچی ہائے ہائے
اس کا مدفن شام کا تاریک زنداں ہو گیا
کیسے کیسے پھول تہتی ریت پہ مرجھا گئے
منتشر مقتل میں زہراً کا گلستاں ہو گیا
چادرِ تطہیر کا وارث جو تھا سر ہائے ہائے
شام کے بازار میں وہ سر بھی عریاں ہو گیا
عصر تک شہیرِ مقتل میں اکیلے رہ گئے
دوپہر میں گلشنِ زہراً بیاباں ہو گیا
ہائے ناموسِ پیہر اور دربارِ یزید
کیا تیری شرم و حیا کو اے مسلمان ہو گیا
مل گیا مداحی شہیر کا مجھ کو شرف!
اس طرح شاداں مری بخشش کا ساماں ہو گیا (۵۹)

.....
ہے سب کا دار و مدارِ حیات پانی پر
کہ برقرار ہے یہ کائنات پانی پر
جو یاد آئی سیکھنے کی بات پانی پر
جری نے تیری دیکھی حیات پانی پر

عیاں ہے زندگی بے ثبات پانی پر
 یہ بلبلے ہیں کہ رمز حیات پانی پر
 ہٹائے نہر سے خیمے کہ کوئی یہ نہ کہے
 بڑھی تھی جنگ کے میدان میں بات پانی پر
 کچھ ایسی قرض ہوئی تنگی بہتر کی
 کہ شرمسار ہے اب تک فرات پانی پر
 علیؑ کے شیر نے دریا پہ کر لیا قبضہ
 مگر کیا نہ ذرا التفات پانی پر
 خلاف غیرت انسانیت تھی بندشِ آب
 دکھا رہے تھے شقی اپنی ذات پانی پر (۶۰)

یہ اسپ حضرت عباسؑ تھا لب دریا
 کہ ڈمگائے نہ پائے ثبات پانی پر
 تبسم علیؑ اصغرؑ کا کچھ جواب نہ تھا
 ہوئے تھے یوں تو بہت واقعات پانی پر
 وہ غم ہوا ہے کہ عابدؑ نے بعد قتلِ حسینؑ
 نگاہِ لطف نہ کی تاحیات پانی پر
 لکھی ہے عزت و ذلت کے ساتھ قدرت نے
 کسی کی موت کسی کی حیات پانی پر
 وہ تین روز کی پیاس اور اب قیامت تک
 ہے اقتدارِ شہِ خوش صفات پانی پر
 کہ جیسے منھی بھینچی چچا کے دوش پہ ہو
 گئے تھے مشک و علم ساتھ ساتھ پانی پر
 کبھی عرب کی حمیت سے یہ اُمید نہ تھی
 کہ پیش آئیں گی یہ مشکلات پانی پر

جو پی رہے ہیں سبیلِ حسین کا پانی
خدا نے لکھی ہے ان کی نجات پانی پر
وہ مشک کے دھن زخم سے بہا پانی
وہ آ کے رُک گئی قسمت کی بات پانی پر
رُخ سیکند و اصغر پہ وہ نگاہِ رباب
وہ صبر تا بہ حد ممکنات پانی پر
یہ معجزہ بھی ہے صبرِ حسین کا شاداں
کہ پھر ہوئی نہ کوئی واردات پانی پر (۶۱)

شاہد نقوی

شاہد حسین شاہد۔ قلمی نام شاہد نقوی۔ ۱۹۱۵ کو شکار پور بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان آئے۔ (۶۲)
تاسف جو رجوی، قمر جلالوی اور محشر لکھنوی سے تلمذ رہا۔ صبا اکبر آبادی کے بعد دبستان کراچی کے سب سے بڑے مرثیہ گو تسلیم
کئے جاتے ہیں۔ مراٹی، سلام، منقبت، نعت، رباعی، قطع غرض یہ کہ جملہ اصنافِ شعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔
شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ پھر عزائی ادب کی طرف آ گئے۔ ۱۹۲۱ میں سلام گوئی کا آغاز کیا۔ ان کے سر پرست آغا
قمر حسین نے ان کے سلام اور مراٹی ”لہو لہو کہکشاں“ میں شائع کئے ہیں۔ (۶۳) جبکہ ”نفس مطمئن“ (۱۹۷۶) بضعۃ الرسل
(۱۹۷۶) اور العصر (۱۹۸۶) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۲ میں ان کے سلاموں کا مجموعہ کرب جاوداں شائع ہوا۔
شاہد نقوی کے پہلے سلام کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

لباس دیں میں پھرتا ہے یزیدی کارواں اب تک
کوئی باقی ہے کیا اہل وفا کا امتحاں اب تک
تری کاوش کہ باقی ہے حسین * اسلام دنیا میں
ترا صدقہ کہ سن لیتے ہیں آواز ازاں اب تک (۶۴)
شاہد نقوی کے سلاموں کے مجموعے ”کرب جاوداں“ سے سلاموں کے مزید منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے:
نمازیں ڈھونڈتی ہیں سجدہ سرور نہیں ملتا
ازانیں رو رہی ہیں لہجہ اکبر نہیں ملتا
نہیں اس سے بڑا کوئی سہارا غم نصیبوں کا
بڑے بد بخت ہیں جن کو غم سرور نہیں ملتا (۶۵)

دلوں کے فاصلے کم ہوں یہ ہے مفہوم قربت کا
(۶۶) قریب آ بیٹھنے سے قرب پیغمبر نہیں ملتا

چٹانیں ٹوٹ تو جاتی ہیں لیکن خم نہیں ہوتیں
(۶۷) کبھی سوئے حکومت آل نے جھک کر نہیں دیکھا

علی کا شیر حکومت سے ڈر کے صلح کرے
(۶۸) تہی بتاؤ تمہیں اعتبار آتا ہے

برابری کا نبی سے اگر تھا اتنا شوق
(۶۹) کہیں سے وجی کا بھی انتظام کر لیتے

پوچھتا ہے نقش کار دیں سے یہ عزم حسین
(۷۰) کتنا خوں درکار ہے رنگینی تصویر کو

رُک سکا حکم زباں بندی سے کب ذکر حسین
(۷۱) لب سلے تو آنسوؤں سے داستاں لکھی گئی

ہے آل سے گریز حمک کتاب سے
(۷۲) کب تک لڑو گے حکم رسالت مآب سے

علیؑ کی شان درائے قیاس عالم ہے
(۷۳) عبادت ثقلین ایک ضرب سے کم ہے

گئے عباس سوئے خلد یوں دریا کو ٹھکرا کے
(۷۴) کہ تھوڑی دیر تک تو جانب کوثر نہیں دیکھا

ترک انا کی شرط طریق وفا میں ہے
مقصد کی زندگی کی بقا ہی فنا میں ہے (۷۵)

حرم کیا ہے عبادت کس کو کہتے ہیں خدا کیا ہے
یہ سب کچھ جان لو گے یہ سمجھ لو کربلا کیا ہے (۷۶)
علامہ طالب جوہری نے شاہد نقوی کی سلام نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
”شاہد نقوی کی شاعری روح عصر کی دریافت کی شاعری ہے جو ان کی ہر تخلیق سے عیاں ہوتی
ہے۔ لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ وہ روح عصر میں بھی ابدی اور آفاقی قدروں کی تلاش میں
رہی ہے۔“ (۷۷)

شہزاد احمد

شہزاد احمد، شہزاد تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۳۲ کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور
سے ۱۹۵۲ میں ایم۔ اے نفسیات کا امتحان پاس کیا اور اسی ادارے سے ۱۹۵۵ میں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔
نفسیات اور سائنس پسندیدہ موضوعات ہیں۔ نظم اور غزل میں استاد کے درجہ پر فائز ہیں۔ اب تک غزل اور نظم کے
درج ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

- (۱) ۱۹۵۸ میں صدف (غزلیات)
- (۲) ۱۹۶۹ میں جلتی بجھتی آنکھیں (غزلیات)
- (۳) ۱۹۷۷ میں ادھ کھلا دریچہ (غزل، نظم)
- (۴) ۱۹۸۵ میں خالی آسمان (غزل، نظم)
- (۵) ۱۹۸۷ میں بکھر جانے کی رت (غزل، نظم)
- (۶) ۱۹۹۱ میں مذکورہ مجموعہ کا مجموعہ
- (۷) ۱۹۹۳ میں ٹوٹا ہوا پل (غزل، نظم)
- (۸) ۱۹۹۳ میں کون اسے جاتا دیکھے (نظم، غزل)
- (۹) ۱۹۹۵ میں پیشانی میں سورج (غزل، نظم)
- (۱۰) ۱۹۹۶ میں جاگن والی رات (پنجابی شاعری)

(۱۱) ۱۹۸۷ میں اترے مری خاک پر ستارہ (پسیں کے بارے میں نظمیں)

(۱۲) ۱۹۹۸ میں معلوم سے آگے (نثری شاعری)

(۱۳) ۱۹۹۹ میں اندھیرا دیکھ سکتا ہے (غزل، نظم)

شہزاد احمد نے غزل کے علاوہ مدحیہ شاعری بھی کی ہے چنانچہ حمد اور نعت کے علاوہ سلام کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہیں شعری وادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد تعلیمی اور ادبی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے جن میں آدم جی پرائز، نقوش (شاعری) ایوارڈ، علامہ اقبال پرائز، مسعود کھدر پوش ایوارڈ اور صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی شامل ہے۔ شہزاد احمد کی سلام نگاری کے حوالے سے چند سلام نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

اس غم کی رات میں بھی اُجالا اسی کا ہے
 ہے آسمان پہ جو بھی ستارا اسی کا ہے
 ممکن نہیں کہ راہ سمجھائی نہ دے ہمیں
 روشن چراغِ نقشِ کفِ پا اسی کا ہے
 ہیں اس کے خاندان کو حاصل کئی شرف
 خیرِ ممکن بھی خیر سے بابا اسی کا ہے
 جنت کی بیبیوں کی ہے سردار اس کی ماں
 باغِ بہشتِ مثلِ مدینہ اسی کا ہے
 سیراب جس کے ابرِ کرم سے نواحِ دل
 شہر کی زباں پہ قصیدہ اسی کا ہے
 رحمت بھی اس کی سارے جہانوں پہ ہے محیط
 اور قتل گاہ میں بھی نواہی اسی کا ہے
 جس کی پناہ میں ہیں دو عالم کے قافلے
 اس دشت میں جلا ہوا خیمہ اسی کا ہے
 پیاسا کھڑا ہے وہ سرِ تسلیم خم کئے
 یہ جانتے ہوئے بھی کہ دریا اسی کا ہے
 شہزاد دل کے آئینے میں دیکھ اس کی شکل
 تسکینِ جسم و روح کی چہرہ اسی کا ہے (۷۸)

وعدہ کر کے بھی نہیں ساتھ نبھانے والے
 کتنے بیدرد ہیں یہ لوگ زمانے والے
 اہل کوفہ نے بلایا تو چلے آئے ہیں
 کیسے سادہ ہیں محمدؐ کے گھرانے والے
 رحم کرتے ہیں تو اس کی بھی نہیں حد کوئی
 کسی سفاک کو خاطر میں نہ لانے والے
 فیصلہ آپ کریں آپ کو کرنا کیا ہے؟
 آپ پر چھوڑتے ہیں شمع بجھانے والے
 ظلم کے تیروں سے چھلنی ہیں حسینؑ ابن علیؑ
 غلبہ کفر سے دنیا کو بچانے والے
 ظلم کرنے پہ تلی بیٹھی ہے دنیا ساری
 او ہم لوگ فقط سوگ منانے والے
 عرصہ مہر میں باقی نہیں رہتا کچھ بھی
 خاک ہو جاتے ہیں خیموں کو جلانے والے
 کس کو معلوم کہ دن بھر کے تھکے ہارے ہوئے
 شام کو اپنے لبو میں ہیں نہانے والے
 کیا بتائیں تجھے کیا چیز ہے یہ تشنہ لبی
 خشک ہو جاتے ہیں دریا نظر آنے والے
 جو بچاتے نہیں کل کے لئے اک دانہ بھی
 وہی درویش ہیں عقبے کے خزانے والے
 در مولا پہ پڑے ہیں تو بڑے ہیں شہزاد

یہ پرندے نہیں اڑ کر کہیں جانے والے (۷۹)

شہزاد احمد اس عہد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ شعرا میں سے ہیں۔ نفسیات فلسفہ اور ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غزل سے
 خصوصی شغف ہے چنانچہ ان کے سلام بھی عام سلام نگار شعرا سے قدرے مختلف ہیں جو بیسویں صدی کے طرز احساس سے ہم
 آہنگ ہیں۔ شہزاد احمد سلام کو محض رونے رُلانے کا ذریعہ خیال نہیں کرتے بلکہ اسوۂ حسینیؑ سے قوت کشید کرنے اور دور حاضر کے

خالموں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا بھی سبق دیتے ہیں۔ فی اعتبار سے ان کے سلاموں میں غزل کا رنگ آہنگ اور حسن و جمال پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید صفدر حسین

اصلی نام سید صفدر حسین، تخلص صفدر کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ کو ضلع مظفر نگر (یو۔ پی، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سید حسن رضا حسن مرثیہ گو تھے۔ (۸۰) ڈاکٹر صفدر حسین نے قیام پاکستان کے بعد شعر و سخن کا آغاز کیا اور سید عابد علی عابد سے کسب ہنر کرتے رہے۔ ۱۹۵۷ میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پاکستان کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے تاہم سرکاری فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور ۱۹۶۳ء میں پہلا مرثیہ ”آئین وفا“ کہا۔ ان کا مجموعہ کلام ”لپ فرات“ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ سید صفدر حسین مرثیے سے قبل رباعی اور سلام بھی پڑھتے تھے اس لئے ان کے پانچ مرثیوں کے ساتھ ساتھ پانچ سلام بھی موجود ہیں۔ ان کے مرثیوں کی طرح ان کے ”سلام“ روایتی اور جدید دونوں اندازِ فکر کا امتزاج ہیں۔ انہوں نے میر انیس کے ایک معروف سلام کی زمین میں جو سلام کہا وہ بہت مقبول ہوا۔ ذیل میں وہی سلام اور مزید ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

لگا کے ٹھیس حریفوں کے آگینوں کو	بڑا عروج دیا ہم نے ان زمینوں کو
غبار چھونے لگا آسمان کے زینوں کو	کہاں اُچھال دیا ہم نے ان زمینوں کو
بنا کے چھوڑ گئے ہیں جو شہ نشینوں کو	پکارتے ہیں در و بام اُن مکیں کو
چڑھا کے آئے تھے ہم پر جو آستینوں کو	وہ آج پونچھ رہے ہیں کھڑے جبینوں کو
غرورِ فن کے سبب جن کے خط نہ مٹتے تھے	ہماری تیغ نے کاٹا ہے اُن جبینوں کو
فلک نے دیکھ کے گلہائے کربلا یہ کہا	کہاں بسا گئے شہر ان حسینوں کو
جبینیں خاکِ شفا سے دمک کے کہتی ہیں	سلام اَرْضِ مقدس ترے مکیں کو
حسین آج نہیں ہیں مگر وہ راہ تو ہے	پکارتی ہے جو آب تک مآلِ بینوں کو
بہارِ غم ہے محرم سے صرف تا بَصر	خدا دراز کرے اور ان مہینوں کو
زمانہ ان کو سمجھ لے اگر تو جنگ نہ ہو	رواج دے گئے شہر جن قرینوں کو
کہاں دیا رنجوم اور کہاں درِ حکام	گرا رہی ہے ضرورت بلند بینوں کو
شہید ہوتے رہے اقربا مگر شہر	نگاہِ عفو سے دیکھا کئے لعینوں کو

اسی کا نام ہے طوفانِ زندگی صفدر

ہوا کہاں سے کہاں لائی ہے سفینوں کو (۸۱)

برستے ہیں ترے مشہد پہ سجدے بے حساب اب تک
گرفت ذہن سے بالا ہے اکبر کا شباب اب تک
ہنوز ان کی فضا میں ہے صدائے اعطش گونجی
حسین ابن علیؑ چُن چُن کے لائے تھے شجاع ایسے
فلک پر لہلہاتی ہے شفق خونِ شہیداں کی
ابھی تک ضربِ حیدر کی دھمک سینے میں ہے اس کے
ہے اب بھی ذرہ ذرہ مضطرب گنجِ شہیداں کا
علیؑ مرتضیٰ کا حکم رجعت یاد ہے اس کو
جلوسِ تعزیت میں بہت عباسؑ کہتی ہے
زمانہ کر رہا ہے شرحِ پیغامِ حسینی کی
مرضِ اُمت کا مہلک ہے مگر صحت کا امکاں ہے
ہمارے اشکِ خوشبوئے عقیدت لے کے آتے ہیں

جسیں رکھے ہوئے ہے آستاں پر آفتاب اب تک
زلیخا آرزوئے دید میں ہے محو خواب اب تک
کہ موجیں علقمہ کی کھاریں ہیں پیچ و تاب اب تک
مورخ دے رہا ہے داؤدِ حسن انتخاب اب تک
اُسے خونِ جگر سے سینچتا ہے آفتاب اب تک
پکار اُٹھتی ہے خیر کی زمیں یا بوتراب اب تک
محبت دے رہی ہے استغاثے کا جواب اب تک
گزر رہا ہے نجف سے تھر تھراتا آفتاب اب تک
علمدارِ حسینی چل رہا ہے ہمرکاب اب تک
خلا میں گونجتے ہیں نعرہ ہائے انقلاب اب تک
لو اپنا دیئے جاتا ہے اکبر کا شباب اب تک
چھڑکتے ہیں سرخاکِ شہیداں ہم گلاب اب تک

یہ تاثیرِ سخنِ فیضِ غمِ سرور نے بخشی ہے

کہ صفدر کی ہر اک مجلس رہی ہے لاجواب اب تک (۸۲)

ڈاکٹر صفدر حسین جس زمانے میں مرثیہ گوئی کی ابتداء کر رہے تھے اور مرثیہ خوانی میں نام پیدا کر رہے تھے اس وقت جلیل القدر مرثیہ گو پاکستان میں موجود تھے۔ سید آلِ رضاؑ، جوش ملیح آبادؑ، نسیم امروہوی اور جمیل مظہری مرثیوں میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ ایک نووارد کے لیے اتنی بڑی بڑی ہستیوں سے ٹکرانا بہت مشکل تھا لیکن ڈاکٹر صفدر نے اپنے ہم عصروں کو اپنے شعر کے تیروں کا نشانہ بنایا۔

ڈاکٹر صفدر نے بھی انیس کے سلام کے مقابل ایک سلام کہا جس کے وہ اشعار درج ذیل ہیں:

چڑھا کے آئے تھے ہم پر جو آستیوں کو
وہ آج پونچھ رہے ہیں کھڑے جبینوں کو
غرورِ فن کے سبب جن کے خط نہ مٹتے تھے

ہماری تیغ نے کاٹا ہے ان جبینوں کو (۸۳)

طاہر ناصر علی

طاہر ناصر علی، طاہر تخلص کرتے ہیں۔ طاہر کا شمار جدید دور کے نوجوان شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم سید رفاقت علی شاہ انجمن حسینیہ گجرات کے جنرل سیکرٹری تھے چنانچہ مجالس کا اہتمام کیا جاتا تو طاہر بھی ان میں آنے والے شعراء اور علماء سے کسب فیض کرتے تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ شعری ماحول نے ان کے اس ذوق کی آبیاری کی اور جلد ہی شعر کہنے لگے۔ شاعری کی اصلاح کے لئے انہیں زیبا ناروی اور استاد الاساتذہ سید وحید الحسن ہاشمی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔

غزل، منقبت اور سلام میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام 'فرات نجات (سلام)'، 'محبوبوں کے دکھ (غزل)'، 'مہکنے لگا پیکر اپنا (غزل)'، 'رزق مودت (منقبت)' شائع ہو چکے ہیں۔ تشنہ لبی کے عنوان سے انہوں نے معروف شعرا کے سلاموں کا ایک مجموعہ بھی ۲۰۰۰ میں شائع کیا۔

طاہر ناصر علی کا نمونہ سلام ملاحظہ کیجئے:

ہیں کربلا کی انہی سے علامتیں زندہ
 حسین زندہ ہیں جب تک ہیں آیتیں زندہ
 مدینہ و نجف و کاظمین و کرب و بلا
 ہمارے دل میں ہیں کتنی صداقتیں زندہ
 متاع علم ملی ہے علیؑ کے در سے ہمیں
 ہمارے دم سے ہیں دنیا میں عظمتیں زندہ
 وفا ضمیر حیا، غم خوشی رواداری
 غم حسین سے ہیں کتنی دولتیں زندہ
 جہی تو ماں مجھے مجلس میں لے کے جاتی تھی
 رہیں نگاہ میں پیاسوں کی چاہتیں زندہ
 یہ پختن کے وجود کرم کا صدقہ ہے
 ہیں دو جہان میں خالق کی رحمتیں زندہ
 سناں پہ کر کے تلاوت کٹے ہوئے سر سے
 رکھیں حسینؑ نے قرآن کی آیتیں زندہ

خُجری نے یہ اپنے لبو سے لکھا ہے
 درِ حسین پہ ہوتی ہیں قسمیں زندہ
 حسین و زینب و عباس کا ہے یہ اعجاز
 دل بشر میں ہیں اب تک محبتیں زندہ
 صفِ عزا پہ وہ آتے ہیں اپنے جد کے ساتھ
 انہی کے دم سے گھروں میں ہیں برکتیں زندہ
 رگِ قلم سے پکتے ہیں سوگوارِ حروف
 کہ اُس کے دل میں ہیں غم کی امانتیں زندہ
 ازل سے لے کے ابد تک شبابِ روئے گا
 ہیں قلبِ مادرِ اکبرؑ میں حسرتیں زندہ
 شکستِ فاش دی اصغرؑ نے حرما تجھ کو
 رہیں گی کم خنی کی نزاکتیں زندہ
 یہ فیصلہ ہے ہر اک دور کے مورخ کا
 ہیں کربلا کی بہتر شہادتیں زندہ
 غمِ حسین ہی طاہرِ دلوں کا مرہم ہے
 اسی سے اب ہیں ہماری روایتیں زندہ (۸۴)

ظہور حیدر چار چوی

ظہور حیدر رضوی، قلمی نام ظہور چار چوی، چارچہ ضلع غازی آباد، بلند شہر میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ (۸۵)
 انہوں نے مراٹھی، سلام، رباعیات، قطعات لکھے۔
 بقول فیصلہ بارہوی:

”ظہور صاحب نے رباعیات، قطعات، تاریخیں، قومی نظمیں، نوئے، قصیدے اور سلام

سینکڑوں کی تعداد میں کہے ہیں۔ نہایت زود گو اور محتاط شاعر ہیں۔“ (۸۶)

ان کے عزائی کلام کے مجموعے بعنوان ”ظہور فکر“ (۱۹۷۶) تحائف ظہور (۱۹۹۷) اور ”نورِ اول و حسنِ حسین“ (۱۹۹۸) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ظہور چار چوی نے ۱۹۷۰ء میں دبیر کے صد سالہ جشن کے موقع پر منعقدہ مسالہ میں جو سلام

پڑھا تھا وہ بہت مقبول ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اپنی اُلفت کا جو شہرِ صلہ دیتے ہیں
 کم سے کم مرجع مخلوق بنا دیتے ہیں
 درد کی شکل میں وہ ہم کو دوا دیتے ہیں
 حشر میں بننے کو شہرِ رلا دیتے ہیں
 ماہ کی طرح ظہورِ انجم الفاظِ دبیر
 فکر کی تیری فضاؤں میں ضیا دیتے ہیں

ظہورِ چار چوی سلام کے حوالے سے دبیر کے مقلد ہیں۔ اس لئے سلام نگاری کے قدیم لوازمات کو ترک کرنے پر تیار نہیں۔ ان کے نزدیک سلام کا مقصد ذکرِ حسین اور ذکرِ اصحابِ حسین ہے۔ اس کے باوجود وہ 'سلام' کے ذریعہ اخلاق کا سبق دینا نہیں بھولتے۔

ظہورِ چار چوی کا ایک طویل سلام ملاحظہ کیجئے:

فلکست کو جو ظفر سے بدل گئے ہیں حسین
 جہاد میں بہت آگے نکل گئے ہیں حسین
 خدا کو دیکھنے والو حسین * کو دیکھو
 جمال و نور کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں حسین
 عبور کر گئے یوں سخت امتحاں گا ہیں
 کہ جیسے باغ میں آ کر ٹہل گئے ہیں حسین
 جدھر سے طائرِ فکر و نظر نکل نہ سکے
 اودھر سے برق کی صورت نکل گئے ہیں حسین
 فرازِ عرش سے اونچا مقام ہے ان کا
 بلند اتنے بزدل عمل گئے ہیں حسین
 رہے گا راہنما اب انہیں کا نقشِ قدم
 رُخ ہوئے قیادت بدل گئے ہیں حسین
 حسد کی آگ سے کانٹے جھلس کے خاک ہوئے
 بہار بن کے خزاں میں جو پھل گئے ہیں حسین

منافقت جسے رکھتی تھی سر پہ فخر کے ساتھ
 وہ تاج اپنے قدم سے کچل گئے ہیں حسین
 ہمیشہ مد مقابل کی مات ہے جس میں
 بساط زیست پہ وہ چال چل گئے ہیں حسین
 نکل بھی آئے جو کوئل تو پھل نہیں سکتی
 یزیدیت کی جڑ ایسی کچل گئے ہیں حسین
 چلی ہیں فاطمہ جنت میں باپ سے کہنے
 برائے نصرت اسلام پل گئے ہیں حسین
 کسی کو جو شب عاشور تک نصیب نہ تھا
 دلوں میں بھر کے وہ جوش عمل گئے ہیں حسین
 جہاں کسی نے پکارا وہیں حسین آئے
 جہاں گئے ہیں وہاں بر محل گئے ہیں حسین
 زمانہ پاؤں سے چلتا ہے جانب منزل
 خدا کے پاس مگر سر کے بل گئے ہیں حسین
 نہ جانے لاشہ اکبرؑ پہ حال کیا ہوتا
 بہن جو خیمہ سے نکلی سنبھل گئے ہیں حسین
 ظہور آج بھی محسوس ایسا ہوتا ہے
 کہ جیسے جانب فردوس کل گئے ہیں حسین (۸۷)

عاصم گیلانی (پ ۱۹۲۹)

اصل نام سید عاصم گیلانی، قلمی نام عاصم گیلانی اور تخلص عاصم کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ میں ”اناوہ“ (یو۔ پی) انڈیا میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ معروف شاعر نصیر شادانی کی تربیت سے شعری ذوق پیدا ہوا۔ اختر حسین رائے پوری سے تعلق رہا۔ قیام پاکستان سے قبل آگرہ میں قیام کے دوران میں غزل سے شاعری کا آغاز کیا۔ جہاں نہال سیوہاروی نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ساتویں جماعت تھے جب پہلا شعر کہا۔ منقبت، نعت اور سلام کہتے ہیں۔ شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ حفیظ تائب کی نعت گوئی سے متاثر ہیں۔ پہلی کتاب ”وسیلہ“ ۱۹۸۵ میں

شائع ہوئی۔ دوسری کتاب ”وظیفہ“ ۲۰۰۲ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اب تک ۳۰ سلام لکھ چکے ہیں۔ سلام کی ترغیب سید وحید الحسن ہاشمی نے دلائی۔ تقلید کے بجائے طرز خاص کے موجد ہیں اور اپنی زمینوں میں شعر کہتے ہیں۔ شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن نعت کہنا شروع کیا تو غزل ترک کر دی۔

ان کے سلاموں میں منقبتی رنگ نمایاں ہے۔ اگرچہ سلام نگاری کے بنیادی لوازم کی پاسداری موجود ہے تاہم بیسویں صدی کے طرز احساس کا پورا لحاظ ہے وہ سانحہ کربلا کی جزیات سے قوت کشید کرتے ہیں اور عہد حاضر کو اس سانحہ سے اخلاق و کردار کی بلند یوں کا سبق دیتے ہیں۔

دو سلام نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

تھے رہنمائے شریعت یونہی اڑے تو نہ تھے
وہ جھکتے کفر کے آگے گرے پڑے تو نہ تھے
گلوئے اصغر بے شیر چھد گیا ناحق
پدر کی گود میں آئے تھے وہ لڑے تو نہ تھے
زبان حال سے کہتے تھے بے کفن لاشے
غنچے پھول پہ شاخوں سے خود جھڑے تو نہ تھے
بڑے سلیقہ سے اپنوں نے چن دیئے کانٹے
وگرنہ رستے وفاؤں کے کچھ کڑے تو نہ تھے
دو چار بوند بھی پانی نہ دے سکے اعدا
کہ شیر خوار کو مطلوب کچھ گھڑے تو نہ تھے

ابن حیدر ہے پاسباں اپنا
کیا بگاڑے گا آسماں اپنا
لے کے نکلے ہیں شمعِ یادِ حسین
کون روکے گا کارواں اپنا
یاد اُن کی ہے تذکرے اُن کے
گھرِ علی کا ہے اب مکاں اپنا
زمین لب ہے جب سے نام اُن کا
اک زمانہ ہے ہمزباں اپنا

داور حشر کو دم پرشش
کربلا سے ملا نشان اپنا

عاصی کرنالی (پ ۱۹۲۷)

۱۹۲۷ میں کرنال میں پیدا ہوئے۔ عاصی تخلص ہے۔ کرنال کی نسبت سے قلمی نام عاصی کرنالی ہے۔ ۱۹۴۴ میں شعری زندگی کا آغاز کیا۔ آٹھویں جماعت میں ’مسلم لیگ‘ کے عنوان سے پہلی نظم کہی۔ قیام پاکستان کے بعد ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ”رگ جاں“ کے نام سے ۱۹۵۶ میں شائع ہوا۔ وہ غزل، نظم، نعت، سلام اور منقبت میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نثر میں افسانہ، انشائیہ، خاکہ، تنقید اور طنز و مزاح پر بہت کچھ لکھا ہے۔

نعتوں کے گلاب ۱۹۸۶ء محدث ۱۹۷۶ء چادواں ۱۹۸۸ء اور حرف شیریں ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئیں جبکہ ۲۰۰۰ میں ”خاصان خدا کر بلا میں“ شائع ہوئی جس میں مراٹھی، سلام اور مناقبت شامل کئے گئے ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی چادواں میں بھی منقبت اور سلام شامل تھے۔

عاصی کرنالی کی سلام نگاری یا مقصد سرگرمی ہے وہ سانحہ کربلا کے ان پہلوؤں کو موضوع بناتے ہیں جن سے فکر کی روشنی پھوٹتی ہے وہ روایتی سلام نگاری کے بجائے جدید طرز احساس کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں یزید، کربلا اور حسینؑ استعارے کی حیثیت رکھتے ہیں وہ استفہامیہ انداز سے شعر کی معنویت میں بے پناہ اضافہ کرنا جانتے ہیں۔

ذیل میں ڈاکٹر عاصی کرنالی کے سلاموں سے منتخب چند سلام ملاحظہ کیجئے:

جب گل شاداب کو چھونے لگے دستِ خزاں
جب نگاہ بد کی زد میں ہو جمالِ گلستاں
جب مئے عشرت سے دامانِ شریعت بھیگ جائے
شورِ طبل و چنگ میں دب جائے جب باغِ ازاں
جب اڑا دی جائے گردنِ صدق کے اعلان پر
جراتِ گفتار پر جب کاٹ دی جائے زباں
جب بجھا دی جائے ہر شمعِ یقین و آگہی
بزمِ اندر بزمِ جب پھیلا دیا جائے دھواں
روئے قرآن جب چھپا دیں برقعِ تاویل میں
ڈال دیں آیاتِ حق پر جب حجاباتِ گماں

خیر کا آئینہ ہو جب ضربِ شر سے پاش پاش
 جب بکھیری جائیں پوشاکِ حیا کی دھجیاں
 جب کوئی فاسق امیر المومنین بنے لگے
 جب کعبِ اہلس میں ہو آبروئے قدیاں
 محسنِ اسلام بن کر تب ابھرتا ہے حسینؑ
 اُس کا خونِ پاک بن جاتا ہے دیں کا پاسباں
 کون ہے یہ عزم کا پیکر شجاعت کا نشان؟
 آنندھیوں کے رُخ چلا جاتا ہے لے کر شمعِ جاں
 تیرے چمکانے کی خاطر اے رُخِ صبحِ حیات
 کس کے تارے غرقِ خوں ہیں چاند کس کے خونچکاں
 کس نے کی منٹے ہوئے آثار پر تعمیرِ نو
 کس نے دیں بجھتی ہوئی اقدار کو تابانیاں
 آپ کے قدموں کو چھو کر اے حسینؑ جاوداں
 چند لمحے ہو گئے ہیں ہر صدی پر حکمراں
 جو لہو سے آپ کے روشن ہوئی اُس راہ پر
 تا ابد چلتے رہیں گے زندگی کے کارواں (۸۸)

آگہی کے نور سے حرفِ ثنا روشن کریں
 اس کرن سے محفلِ ارض و سما روشن کریں
 حمدِ ربِّ نعتِ رسولؐ پاک ذکرِ اہلبیتؑ
 دوستو آؤ یہ شمعیں جا بجا روشن کریں
 صرصر جو یزیدؑ اُن کو بجھا سکتی نہیں
 جن چراغوں کو خدا اور مصطفیٰؐ روشن کریں
 غازیانِ دیں کو بھی قدرت نے کیا سوچا ہے فرض
 دے کے خونِ پاک قندیلِ بقا روشن کریں

چاہتی ہو گی مشیتِ خونِ اصغر سے امام
 کربلا میں ایک ننھا سا دیا روشن کریں
 حکم یہ ہو گا کہ تاروں کی شہادت سے حسین
 آفتابِ انقلاب و ارتقاء روشن کریں
 حرمتِ جانِ شہیداں کی تجلی ڈال کر
 رنگ جس پر آ گیا وہ آئینہ روشن کریں
 روشنی ڈالیں گے ہم کیا عظمتِ شبیر پر
 وہ تو خود سورج ہے ہم سورج کو کیا روشن کریں (۸۹)

اک شخص ہے کہ رہبرِ دنیا ہے آج بھی
 تاریخ کو چراغ دکھاتا ہے آج بھی
 اک نام ہے جو کل بھی تھا بنیادِ انقلاب
 اور مضطرب حیات کا نعرہ ہے آج بھی
 اک ذات ہے جو اب بھی ہے فانوسِ لا الہ
 روشن چراغِ حرمتِ کعبہ ہے آج بھی
 اک محترم لبو ہے جو عنوان کی شکل میں
 تہذیب کی جہیں پہ چمکتا ہے آج بھی
 اک فقر ہے جو کرتا ہے سلطانیاں ہنوز
 کل کی طرح اُسی کا زمانہ ہے آج بھی
 اک عزم ہے جو فوجِ شیاطین کے سامنے
 اللہ کی طرف سے صفِ آرا ہے آج بھی
 اک پیاس ہے کہ جس کی ٹھوکر میں علقہ
 وہ پیاس اپنے ظرف میں دریا ہے آج بھی
 اک سجدہ ہے ادا جو ہوا گرم ریت پر
 انسانیت کا جس سے سر اونچا ہے آج بھی (۹۰)

اب ”جاوداں“ کے سلاموں سے منتخب چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

انساں کو حشر تک کے لیے قید جبر سے
آزاد کر گئے ہیں اسیرانِ کربلا (۹۱)

آدابِ جاں سپردن و آئینِ زیستن
صدقہ ہے سب حسین علیہ السلام کا (۹۲)

جب تک ہے یاں کسی نہ کسی بھید میں یزید
تب تک حسینِ معرکہ کربلا میں ہے (۹۳)

کچھ اور فیصلہ کرتی اگر تری حکمت
سوال یہ ہے کہ پہلا قدم اٹھاتا کون (۹۴)

قمر جلالوی (۱۸۸۷-۱۹۶۸)

اصل نام سید محمد حسین ہمدانی تھا۔ قلمی نام قمر جلالوی جبکہ تخلص قمر کرتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کے ایک قصبے ”جلالی“ میں پیدا ہوئے۔ صغیر سنی ہی میں شعر کہنے لگے اگرچہ باقاعدہ کسی استاد سے تلمذ نہ تھا تاہم امیر مینائی سے متاثر تھے اور انہیں غائبانہ استاد تسلیم کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پاکستان آ گئے اور کراچی میں قیام پذیر ہوئے۔ قمر جلالوی فن عروض میں یکتا تھے۔ ۹۱ برس کی عمر میں کراچی ہی میں ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا۔ قمر جلالوی نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، سلام، منقبت اور قطعات و رباعیات کہیں لیکن حیرت ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا۔ وفات کے بعد ”اویج قمر“ اور ”رُشک قمر“ دو مجموعے شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ جس میں مرثیے اور سلام ہیں ”غمِ جاوداں“ کے نام سے بھی شائع ہوا۔

قمر جلالوی نے سلام میں اساتذہ کی روایت کی پاسداری بھی کی اور ایک نئے انداز کا باکمین بھی شامل کیا اور یوں ”سلام“ کو غزل کا خون دینے کی روایت برقرار رکھی اور اپنے سلاموں میں غزلوں کی طرح تیکھاپن پیدا کر دیا۔ ”سلاموں“ کے چند اشعار اس حوالے سے پیش خدمت ہیں:

اصغر جگر کو تھام کر روتی ہے فوجِ شام
تم تیر کھا کے آئے ہو یا تیر مار کے

مرحب کا قتل بھی کوئی خیر میں قتل تھا
 پھینکا تھا ذوالفقار کا صدقہ اُتار کے
 جانے سوال کیا ہوئے تربت میں اے قمر
 چپ ہو گئے تھے ہم تو علی کو پکار کے (۹۵)

رک گئے ہیں دیکھ کر دریا کو لہراتے ہوئے
 شیر پھرتے ہیں ترائی کی ہوا کھاتے ہوئے (۹۶)

خون محبت سے کھلے کیا قصہ ضرب علیؑ
 یہ تو افسانے کی اک سرخی ہے افسانہ نہیں
 ساقی کوثر خدا رکھے تری دریا دلی
 اتنی سے بھر دی کہ جتنا میرا پیانہ نہیں (۹۷)

کوئی دیکھے علیؑ پیشتر سے کعبے کی تاریکیں
 خدا کے ایک گھر میں کتنے بت خانے نکل آئے (۹۸)

حرم لئے ہوئے بیٹھے تھے جس اندھیرے میں
 قمر وہی شب ظلمت سلام کہتی ہے (۹۹)

تاریکیاں یہ شام غرباں کی اے قمر
 تارے بھی چھپ گئے فلک کج مدار کے (۱۰۰)

مرضیٰ کو خانہ زاد رب اکبر دیکھ کر
 بیاہ دی بیٹی پیہر نے بڑا گھر دیکھ کر (۱۰۱)

قیصر بارہوی

اصل نام سید قیصر عباس زیدی۔ قلمی نام قیصر بارہوی، تخلص قیصر کرتے تھے۔ قیصر بارہوی کے والد کا نام وزارت حسین زیدی تھا۔ قیصر بارہوی ۱۹۲۸ء میں سادات بارہہ کی معروف بستی کیتھوڑا میں پیدا ہوئے۔ (۱۰۲) ۱۹۵۰ء تک لکھنؤ میں رہے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران ہی مرثیے کہنے لگے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں لاہور آنے کے بعد وہ عزائی ادب کی تخلیق میں سرگرم ہو گئے۔ ان کے مراٹھی کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سلام بھی شامل ہیں۔

قیصر بارہوی نے ۱۰۲ مرثیے کہے جو رنگ ان کے مرثیوں میں ہے وہی ان کے سلاموں میں بھی جھلکتا ہے۔ وہ اپنے سلاموں سے شہدائے کربلا کی سیرت اور ان کے کارہائے نمایاں کو موضوع بناتے ہیں۔ قیصر بارہوی فکری شاعر ہیں۔ ان کے سلاموں میں جدید طرز احساس موجود ہے۔ نجم آفندی نے اپنے نوحوں اور سلاموں کے ذریعے جس جدید فکر کی آبیاری کی تھی، قیصر بارہوی کے ہاں اسی روایت کی پاسداری موجود ہے۔

قیصر بارہوی کے سلاموں کی ادبی اور فنی خوبی یہ ہے کہ انہیں الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت ہے وہ لفظوں کی تجسیم کاری سے منظر کو زندہ کر دیتے ہیں۔ الفاظ و تراکیب میں مرثیے کی گھن گرج موجود ہے۔ بلاشبہ قیصر اپنے عہد کے بڑے سلام نگاروں میں شامل ہیں۔

قیصر بارہوی کا نمونہ سلام دیکھئے:

پاس کے ابر کی تخلیق ہیں گوہر کیا کیا
 خشک ہونٹوں نے اُچھالے ہیں سمندر کیا کیا
 درد کی بیج بنا خون گل تر کیا کیا
 زخم لہراتے ہیں خوشبو کے بدن پر کیا کیا
 کبھی طائف میں کبھی شام کے بازاروں میں
 وحشت فکر نے برسائے ہیں پتھر کیا کیا
 یاد ہے دامن تاریخ میں سورج کا لہو
 روشنی روئی ہے مقتل کی زمیں پر کیا کیا
 جنگ بے شیر نے تنخیر کے در کھول دیئے
 اک تبسم کو ملی قوت لشکر کیا کیا
 ایک مظلوم کا اندز فراست دیکھو
 بھر دیئے صبر کی شمشیر میں جوہر کیا کیا

دوستو! فکر گلستاں ہے تو اتنا سوچو
چند پھولوں نے ہے ناوک و خنجر کیا کیا (۱۰۳)

غیرت اہل عرب یہ داغ دھو سکتی نہیں
میزباں نوک سناں پر اپنے مہماں لے گئے
ان اسیروں پر دو عالم کے اُجالوں کا سلام
شام تک جو صبر کی صبح درخشاں لے گئے
فکر انسان آج بھی اس بات پہ حیراں ہے
کس طرح سے چادر زینت مسلمان لے گئے
کس قدر اسلام دشمن تھے ستم گاران شام
آیتوں کو لوٹ کر نیزوں پہ قرآن لے گئے (۱۰۴)

در و دیوار گلستاں کی صباحت کیا ہے
شام زنداں میں نقیبان سحر مہکے ہیں
اہل آیات سے آیات کی خوشبو نہ گئی
خاک مقل پہ بدن نیزوں پہ سر مہکے ہیں
چند پھولوں نے کچھ اس طرح ضیا بندی کی
آئینے پھول بنے آئینہ گر مہکے ہیں
زخم دل سوز جگر شام غریباں کی زمیں
کس قیامت میں گل دیدہ تر مہکے ہیں (۱۰۵)

کرامت بخاری (پ: ۱۹۵۸)

اصل نام کرامت حسین بخاری، قلمی نام: کرامت بخاری، تخلص کرامت ہے۔ ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ کو قصبہ ہرنولی (میاں والی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام زوار حسین بخاری تھا۔ ابتدائی تعلیم بھکر میں حاصل کی۔ بھکر ہی سے بی۔ اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۸۱ میں ایم۔ اے سیاسیات کیا۔ ۱۹۸۲ میں سی۔ ایس۔ ایس کرنے کے بعد سول سروس میں داخل

ہوئے۔

شاعری کا آغاز ۱۹۷۶ء میں کیا۔ غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی۔ اب تک چار مجموعہ ہائے کلام نکلی (۱۹۹۰) کیوں جاگتے ہو (۱۹۹۲) یادوں کا پیراہن (۱۹۹۴) اور رنج رایگاں (۱۹۹۸) میں شائع ہو چکے ہیں۔ حمد، نعت اور سلام میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کے سلام میں قدیم روایتی سلام کی بوباس محسوس ہوتی ہے۔ تاہم جدید طرز احساس بھی موجود ہے۔ کرامت بخاری جدید دور کے پڑھے لکھے شعرا میں بلند مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ ایک سلام ملاحظہ کیجئے:

دیارِ عشق میں جب آنکھ سے جوہر نکلتے ہیں
زمیں ہو سخت تو اشعار بھی بہتر نکلتے ہیں
میں جب شبیر کی توصیف پر تیار ہوتا ہوں
مری تحریر کے بالکل نئے تیور نکلتے ہیں
مرے مظلوم آقا کی محبت ایسا دریا ہے
جو اس میں ڈوب جاتے ہیں سر کوثر نکلتے ہیں
شفاعت اور بخشش بھی اسی گھر کی بدولت ہے
یہاں عاصی بھی آ جائیں تو خُڑ بن کر نکلتے ہیں
اگر مد مقابل ہو کوئی فاسق کوئی فاجر
تو ہم بھی اپنے مولّا کا علم لے کر نکلتے ہیں (۱۰۷)

کوثر پانی پتی

اصل نام سید کوثر حسین عابدی، قلمی نام کوثر پانی پتی اور تخلص کوثر تھا۔ کوثر عابدی ۱۹۱۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آغا شاعر سے تلمذ تھا۔ آپ نے سلام، غزل، نوحہ، قطعہ اور رباعی میں طبع آزمائی کی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی شاعری کا موضوع مذہب رہا۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ”سر محفل“ اور ”سر مقتل“ شائع ہو چکے ہیں۔ ”سر مقتل“ میں سلام، نظمیں، نوحے، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔

کوثر پانی کے سلاموں میں فکر تازہ کے آثار بھی موجود ہیں لیکن وہ سلام کی روایت کے جادہ سے دور نہیں ہٹتے۔ ان کے سلام قدیم لوازمات اور جدید فکر کے حسین امتزاج سے عبارت ہیں۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ”سر محفل“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”شاعری کے محاسن کی قوت اور عقیدت کی توانائی دونوں مل کر ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیتی

ہیں۔“ (۱۰۸)

کوثر پانی پتی کے ”سرمقتل“ سے منتخب چند سلام ملاحظہ کیجئے:

صبر میں شکر تھا یوں حضرت شہید کے ساتھ
لب تک آئی بھی کوئی آہ تو تکبیر کے ساتھ
فرد انصار میں اکبر پہ نہیں ختم جہاد
ایک ششماہہ مجاہد بھی ہے شہید کے ساتھ
پا بجولاں ہوئے عابد تو ہوا حشر پنا
دل کھنچے جاتے ہیں سادات کے زنجیر کے ساتھ
شام تک قافلہ سالارِ حرم آ پہنچا
چنچیں کوڑوں کی بھی ہیں نالہ زنجیر کے ساتھ
وہ اسیروں کا تماشا! وہ شہیدوں کا جلوس
ایک محشر ہے کہ ہے زینب دلیگر کے ساتھ
ہائے وہ غیرت مضطر کہ کئے جلد یہ راہ
ہائے وہ قافلہ اک بستہ زنجیر کے ساتھ (۱۰۹)

یاد کا چاند چڑھا خلق کو یاد آئے حسین
در و دیوار سے آتی ہے صدا ہائے حسین
شدتِ غم سے اسی خیمے کے مانند ہے دل
جس میں عاشور کو رخصت کے لیے آئے حسین
رمزِ قرآن کو سمجھنا ہے تو اقبال سے پوچھ
وہی قرآن ہے عمل کر کے جو دکھائے حسین
راہِ مولا میں مصیبت پہ مصیبت ٹوٹی
ہر مصیبت پہ مگر شکر بجا لائے حسین
دوشِ احمد سے تہہ خنجر و بالائے سناں
جادۂ عشق میں کیا کیا نہ رہی جائے حسین
ساتھ انصار نہ عباں نہ اکبر نہ سپاہ
پھر بھی شمشیر بکف ہمت یکتائے حسین

عصر کا وقت تھا جب فوج خدا ختم ہوئی
 آخری وقت میں اصغر کو بھی لے آئے حسین
 اُمتِ جد کے مظالم پہ یہ کیفیتِ دل!
 زہرِ خنجر بھی لبوں پر ہے دعا ہائے حسین
 سُن لو کوثر کو کہ خاموش ہوا چاہتا ہے
 کیا تعجب ہے جو یاد آئے یہ شیدائے حسین (۱۱۰)

کون مسلم ہے جو سمجھے نہ مقامِ شبیر
 تاجِ پیشانیِ اسلام ہے نامِ شبیر
 جب تک اسلام سے یہ محسنِ اسلام بھی ہے
 دینِ قیم کی ضمانت ہے دوامِ شبیر
 پیاس میں حق کے لیے تیغِ زنی ختم ہوئی
 اب نظر آئے کہاں گردشِ جامِ شبیر
 دوشِ احمد سے جہِ خنجر و بالائے سناں!
 اللہ اللہ رو حق میں مقامِ شبیر
 راہِ مولا میں شہادت بھی اسیری بھی قبول
 اب یہ آئینِ وفا ہو کہ نظامِ شبیر (۱۱۱)

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی (۱۹۲۶ء-۱۹۸۸ء)

مسعود رضا نام اور خاکی تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں میرٹھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام آغا محمود رضا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۵۴ء میں ایم۔ اے اردو کیا۔ ۱۹۵۶ء میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء میں ”اردو افسانے کا ارتقا“ پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور گورنمنٹ کالج باغبانپورہ سے ریٹائر ہوئے۔

خاکی کو ان کے گھر کے ادبی اور شعری ماحول نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے سلام سے شاعری کا آغاز کیا اور دس برس میں ان کے تین شعری مجموعے آیاتِ وفا، کیفِ غم اور لبِ کوثر شائع ہوئے۔ کیفِ غم میں ۲۱ سلام موجود ہیں۔ ان سلاموں میں

سلام کے روایتی لوازمات بھی موجود ہیں لیکن فکری بلندی بھی پائی جاتی ہے۔ فکری اعتبار سے وہ غم آفندی کی جدید شاعری کی تحریک سے متاثر تھے۔ ان کے نزدیک سلام کا ایک مقصد قوم کا اصلاح احوال بھی ہے تاہم وہ 'سلام' کو نام و نمود اور داد و دہش کا ذریعہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ سلام کا مقصد شہدائے کربلا سے عقیدت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک غم حسین دنیا کے غموں کا علاج ہے۔ کیف غم سے منتخب کلام ملاحظہ کیجئے:

ہماری زندگی مضبوط بنیادوں پہ قائم ہے
غم شہر نے مرنا نہیں جینا سکھایا ہے
غم شہر سے انسانیت پروان چڑھتی ہے
سلیقہ صبر کرنے کا اسی غم نے سکھایا ہے
غم شہر ہے کونین کی روح رواں خاکی
یہ دولت جس نے پائی ہے وہ دو عالم پہ چھایا ہے (۱۱۲)

فکر خاکی کو طواف کربلا سے کام ہے
چپے چپے پر نظر آتے ہیں آثار حسین
عرش سے کمتر نہیں ہے فرش خاک کربلا
ہم سفر جبریل کے ہوتے ہیں زوار حسین (۱۱۳)

کربلا کا یہ تصدق ہے کہ خاکی انسان
دیکھیے مرتبہ صدق و صفا تک پہنچا (۱۱۴)

جو لاولد تھا اسے نو پر دیئے کس نے
کلام حق ہے خدا کی قسم کلام حسین (۱۱۵)

نبی کے دوش پر میزان عدل قائم ہے
ادھر امام حسن ہیں ادھر امام حسین (۱۱۶)

فقط اک اشرفی فی شعر فردوسی کی اجرت تھی
ہم اہل بیت کے شاعر ہیں اونچے دام لیتے ہیں (۱۱۷)

خزاں بھی جن کی مہک سے بہار بن جائے
وہ پھول خود نہیں کھلتے کھلائے جاتے ہیں
کٹا کے ہاتھ جو لکھتے ہیں داستان وفا
انہیں کے قصے ہمیشہ سنائے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں
چراغ جن کے لبو سے جلانے جاتے ہیں (۱۱۸)

کسی کم ظرف کا احسان لینے کی ضرورت کیا
جو مے خانے کا مالک ہے ہم اس سے جام لیتے ہیں (۱۱۹)

مشکور حسین یاد

مشکور حسین نام یاد حخلص ۱۹۲۵ کو ضلع حصار موضع منڈی ڈیوالی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کیا اور ۱۹۶۰ میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۳ میں تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۸۶ میں ریٹائر ہوئے۔

مشکور حسین یاد نے غزل، مرثیہ، سلام، رباعی، قطعہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ سلاموں کی کتاب ”مفہوم زمانہ“ کے عنوان سے شائع ہوئی اور دوسرا مجموعہ ”نقطہ اعتدال“ کے عنوان سے شائع ہوا۔

مشکور حسین یاد اپنے سلاموں میں ذکر حسین کے ساتھ ان کے آباؤ اجداد کا ذکر بھی کرتے ہیں اور یہ روایت ہمیں نجم آفندی اور آل رضا سے قبل اردو سلام نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ مشکور حسین یاد نے ”مفہوم زمانہ“ کے سلاموں میں محمد و آل محمد کے بتائے ہوئے مفہوم زمانہ سے آشنا کیا ہے۔

مشکور حسین یاد کے ”مفہوم زمانہ“ میں شامل سلاموں سے منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے:

اسلام کی ہر فکر پہ غالب ابو طالب
ایمان کی خوشبو مئے مطالب ابو طالب (۲۰)

جو دل میں چپ محمدؐ کا بادہ رکھتے ہیں
وہی علیؑ سے تعلق زیادہ رکھتے ہیں (۲۱)

اعلان حق کا مطلع تاباں علیؑ کی ذات
ہمت فزائے عالم امکاں علیؑ کی ذات (۲۲)

اب مشکور حسین یاد کے دو تازہ سلام ملاحظہ کیجئے:

غمِ حسینؑ سمندر ہے مہریاں جو ہوا
ہر ایک دل میں اُترتا ہے بیکراں جو ہوا
غمِ حسینؑ سے ہر صدق رزق پاتا ہے
غمِ حسینؑ سخاوت کا آساں جو ہوا
غمِ حسینؑ سے ملتی ہے نعمتِ ہر فخر
غمِ حسینؑ شرافت کی داستاں جو ہوا
غمِ حسینؑ بچاتا ہے دل کو غفلت ہے
طلوعِ جاں جو ہوا صبحِ ضوفشاں جو ہوا
غمِ حسینؑ سے بڑھتے ہیں حوصلے دل کے
غمِ حسینؑ عزائم کی کھکشاں جو ہوا (۲۳)

انسانیت کی سمت سفر کا پتا چلے
نامِ حسینؑ لو کہ شر کا پتا چلے
رونا غمِ حسینؑ میں آسان تو نہیں
گریہ کریں تو شام و سحر کا پتا چلے
خاکِ شفا سے جس کا نہ ہو رشتہ اُستوار
کیا اُس کو ناتوانی زر کا پتا چلے
ہے دُور اگر مدینہ سوئے کربلا چلو
کچھ تو تمہارے ذوقِ سفر کا پتا چلے

ایسا تو کم سے کم ہو پچا ماتم حسینؑ
ہنسی کے زخم ہائے جگر کا پتا چلے
مٹکھور ہم وہ خاک نشین زمانہ ہیں
باتوں سے جن کی شمس و قمر کا پتہ چلے (۱۲۴)

ناصر کاظمی (۱۹۲۳-۱۹۷۲)

اصل نام ناصر رضا، قلمی نام ناصر کاظمی اور تخلص ناصر تھا۔ ناصر کاظمی ۱۹۲۳ میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد سلطان کاظمی انڈین فورس میں صوبہ دار میجر تھے۔ (۱۲۵) ناصر کاظمی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ ان کا پہلا مجموعہ غزل ”برگ نے“ ۱۹۵۲ میں شائع ہوا۔ (۱) بعد ازاں ’دیوان‘ (غزلیں) ۱۹۷۲، پہلی بارش (غزل) ۱۹۷۵، نشاط خواب (نظمیں) ۱۹۷۷ شائع ہوئے۔ ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انہیں میر سے ذہنی اور قلبی لگاؤ تھا جس کا اظہار انتخاب میر (۱۹۸۹) ہے تاہم انہوں نے انتخاب نظر (۱۹۹۰)، انتخاب ولی (۱۹۹۱) اور انتخاب انشا (۱۹۹۱) میں شائع کیا۔ ناصر کاظمی کی شاعری معاصر جذبات، احساسات، مسائل اور رجحانات کی عکاس ہے۔ آج کی غزل کے بیشتر رویے ناصر کاظمی کے جدید طرز احساس کی کوکھ سے پھولے ہیں۔ ناصر کاظمی کو اپنی غزل پر ناز تھا چنانچہ سلام کہا تو اس میں بھی ”غزل کا سوز رنگ سلام لانے“ کا ذکر کیا۔

ناصر کاظمی کا ایک سلام نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

زباں پہ نام امام اٹام لایا ہوں
جواب جس کا نہیں وہ سلام لایا ہوں
نہ مئے نہ خم نہ صراحی نہ جام لایا ہوں
فقط پیام شہ تشنہ کام لایا ہوں
بدل دیا ہے شہیدوں کے خون نے رنگِ فلک
نئی زمین نئے صبح و شام لایا ہوں
فراستِ خون جگر میں ڈبو کے نوکِ قلم
پیام درد پئے خاص و عام لایا ہوں
زمین دل پہ مری در فشاں ہے کرب و بلا
میں تیغ نور سرِ اویج شام لایا ہوں

ہلال ماہ محرم کو اشک خوں دے کر
 فروغ جلوہ ماہ تمام لایا ہوں
 بہت عزیز ہے رنگ غزل مجھے ناصر
 غزل کا سوز برنگ سلام لایا ہوں (۱۲۶)

نزہت حسین

نزہت حسین نام اور نرہت تخلص ہے۔ والد کا نام محمد تقی ہے۔ نرہت حسین ۱۹۲۴ میں سوئی پت (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں ترک وطن کر کے پہلے کراچی پھر ضلع خانیوال میں قیام پذیر ہو گئے۔

نرہت حسین نے ۱۹۴۴ میں اسٹیفن کالج دہلی سے گریجوایشن کیا۔ جنرل ضیا بھی ان کے کالج فیلو ہے۔ ۱۹۴۶ میں ایم اے معاشیات کیا اور ۱۹۴۷ میں آئی سی ایس کر کے پاکستان آ گئے۔ حسن شہید سہروردی کی وساطت سے وفاقی حکومت میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس آفیسر مقرر ہوئے دو سال کے بعد مشرقی پاکستان کے آڈیٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۰ میں پاکستان ریلویز میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل مقرر ہوئے چند ہی برس کے بعد واپڈا میں ممبر فنانس ہو گئے۔ ۱۹۸۴ میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۸۷ میں لاہور میں انتقال کر گئے۔

نرہت حسین کی پرورش مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی ان کے والد محمد تقی ایک بہترین سوز خواں تھے وہ ہمیشہ میر انیس کے مراٹھی مجالس میں پڑھا کرتے تھے اور نرہت حسین اپنے والد کے بازو بن کر ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ اسی عمل کی وجہ سے نرہت حسین کو انیس کے مراٹھی زبان یاد ہو گئے شاید اسی سوز خوانی کا اثر تھا کہ وہ منقبت اور سلام کہنے لگے۔ ۱۹۹۲ میں باقیات نرہت کے عنوان سے ان کا دیوان لاہور سے شائع ہوا جس میں ۶۴ مقبضیں ۱۵ سلام اور ایک مرثیہ ہے۔

نرہت حسین کے سلاموں میں عقیدت کی فراوانی ہے اشعار صاف اور رواں دواں پختہ کلامی تو ہے مگر جدید لہجے کے اشعار کم ہیں۔ ان کے دو سلام پیش قارئین کئے جاتے ہیں۔

مجلس شہ میں سلام اپنا سنانے آئے
 ہم بھی بگڑی ہوئی تقدیر بنانے آئے
 زور حیدر کی ہے تاریخ مسلم لیکن
 اس میں یاروں کے بھی جھوٹے فسانے آئے
 وحدت فکر و عمل، منزل تسلیم و رضا
 اپنے کردار سے شیر دکھانے آئے

میں غم شاہ میں گریاں ہوں میرا دم نکلے
 موت پیغام شہادت کا سنانے آئے
 ہم کو مولیٰ کی فقیری نے کیا مستغنی
 کس طرح اب کوئی احسان جتانے آئے
 صبح عاشور سنی جب علی اکبرؑ کی اذال
 یاد شبیرؑ کو نانائے کے زمانے آئے
 عشق معبودِ حقیقی سے ہیں سرشار حسینؑ
 صرف اُس کے لئے گھر بار لٹائے آئے
 تم نے نزہت نہ چکھاتھا غم دوراں کا مزہ
 اب جو بیتی ہے تو کچھ ہوش ٹھکانے آئے (۱۲۷)

نام شبیرؑ کا ہم شام و سحر لیتے ہیں
 روز اپنے لئے فردوس میں گھر لیتے ہیں
 آج مقصود ہے دیدار حسینؑ ابن علیؑ
 آئیے قدسیوں سے تابِ نظر لیتے ہیں
 ملحد و کافر و مشرک بھی تجھے مانتے ہیں
 گو ترا نام بہ عنوانِ دگر لیتے ہیں
 یہ کہ شبیرؑ نے سر دے کے بچایا اسلام
 لوگ اس بات کا اقرار تو کر لیتے ہیں
 لیکن آساں نہیں پیغامِ حسینؑ کا شعور
 اس سے تو اہل بصیرت ہی اثر لیتے ہیں
 یہ بھی ہے ظلم سے اظہارِ برائت کا طریق
 ہم عقیدت سے ترا نام اگر لیتے ہیں
 تیری سرکار کا ہے یہ کرم خاص حسینؑ!
 آ کے سب دامنِ اُمید کو بھر لیتے ہیں

اذن خالق سے عطا کر دیئے راہب کو پر
 ہو کے مس ان سے فرشتے بھی تو پر لیتے ہیں
 ہیں محمدؐ کے پر مظہر اوصافِ خدا
 دل سے گر اُن کو پکاریں تو خبر لیتے ہیں
 ہیں وہ اوروں کی نظر میں تو رہیں قطب و دلی
 اپنی مشکل میں مدد تجھ سے مگر لیتے ہیں
 گامزن ہیں جو رہ عشقِ خدا پر نزہت
 غمِ شبیر سے وہ زادِ سفر لیتے ہیں (۱۲۸)

نسیم امروہوی (۱۹۰۸-۱۹۸۷)

اصل نام سید قائم رضا۔ نسیم تخلص اور قلمی نام نسیم امروہوی تھا۔ ۱۹۰۸ میں امروہہ مراد آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے۔
 ابتدا میں قائم تخلص کرتے رہے لیکن نواب باقر علی کی خواہش پر نسیم تخلص کرنے لگے۔ ان کے والد دادا اور پردادا سبھی شاعر تھے۔
 ۱۹۵۰ میں پاکستان آئے اس سے قبل لکھنؤ کے مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔

شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ لیکن مزاجِ عزرائلی ادب کی جانب راغب تھا چنانچہ ۱۹۲۳ میں ۱۵ سال کی عمر میں پہلا
 مرثیہ کہا۔ مذہبی اور ادبی ماحول میں پرورش پانے والے نسیم امروہوی کو عزرائلی ادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے مرثیہ اور
 منقبت کے علامِ سلام کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے سلاموں میں اصحابِ حسینؑ کی عظمت کا خصوصی تذکرہ موجود ہے۔ وہ
 راسخ العقیدہ شیعہ مسلمان تھے۔ مذہب سے وفاداری ان کے سلاموں سے بھی ظاہر ہے تاہم یہ پراپیگنڈہ نہیں بننے پاتی۔ ان کے
 سلام مسائلِ جبلت بھی سلجھاتے نظر آتے ہیں۔

نمونہ کلامِ ملاحظہ کیجئے:

مصنف زانوئے زہرا کی نرالی شان ہے
 چادرِ تطہیر اس قرآن کا جزوان ہے
 فاطمہؑ کو اب مسلسل ہے تلاوت کا ثواب
 گود میں شبیر ہیں یا رحل پر قرآن ہے
 ہے خطوطِ رُخ سے ظاہر عندہ علم الکتاب
 پتلیاں ہیں آیتیں گویا وہی قرآن ہے

دہر سے غلد بریں تک سخت تر ہیں منزلیں
 راہِ مقتل سے مگر اب یہ سفر آسان ہے
 ان کی پیدائش کا موسم تک ہے اتنا محترم
 اب محمدؐ کا مہینہ حشر تک شعبان ہے
 دل کو کھلتا ہے حسینؑ ابن علیؑ کا تذکرہ
 بزمِ ایمان میں منافق کی یہی پہچان ہے (۱۲۹)

دبا دبا کر طرح طرح سے زمانہ جس کو چھپا رہا ہے
 ابھر ابھر کر وہ خون ناحق جہان میں رنگ لا رہا ہے
 حبیب و مسلم کے تیوروں میں نئی جوانی پھل رہی ہے
 الہی میدان کربلا میں شباب کس کس پہ آ رہا ہے
 وفا کو عباسؑ آ رہے ہیں کہ حشر گیتی میں آ رہا ہے
 زمیں کا بڑھتا ہوا تزلزل فلک کو جھولا جھلا رہا ہے
 بہشت حد کمال رضوانؑ نسیم باغِ ثنا پہ نازاں
 ہر اک بقدر مذاقِ فطرت چمن چمن گل کھلا رہا ہے (۱۳۰)

کربلا تجھ پر کرے سجدہ نہ کیونکر آفتاب
 خود ترے دامن میں پنہاں ہیں بہتر آفتاب
 رخ تو رخ کیا تاب دیکھے پشتِ حیدؑ آفتاب
 جلوہ گر ہیں قلب میں گیارہ منور آفتاب
 روبروئے مہر وحدت تھے جو چودہ آئینے
 ایک سورج سے بنے چودہ برابر آفتاب (۱۳۱)

نسیم اتنا مجھے کہنا ہے اپنے نوجوانوں سے
 علی اکبرؑ کے پیرو ہو نہ گھبرانا سنانوں سے

وجود و بختیجی سے چارہ معصوم ثابت ہیں
 یہ مضمون ہم کو ہاتھ آیا اناں کے نشانوں سے
 حبیب اٹھے جو نصرت کو گئی پیری شباب آیا
 تھے اور لے کے انگڑائی بڑھے آگے جوانوں سے
 علیؑ و مصطفیٰؐ کا یک زباں ہونا ہے کیا مشکل
 جب اک کلمہ نکلتا ہے قلم کی دو زبانوں سے (۱۳۲)

نسیم امر وہوی کی بدولت سلام نگاری میں شاعرانہ فنکاری، فنی حسن و جمال منطقیانہ استدلال اور عالمانہ افکار کو راہ ملی۔
 انہوں نے قرآن مجید احادیث اور تاریخ اسلام سے استفادہ کر کے سلام نگاری کو قرآن و حدیث کی اسناد سے مرصع کیا۔ چنانچہ
 ان کی تاویل قرآنی سے سلام نگاری میں علمی و تاریخی حوالے سے واقعات کے بیان میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ان کا ایک اہم
 کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو مستند الفاظ کا سرمایہ فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح اپنے کلام کو وجود و
 غیبت امام زمانہ، اصلاح رسوم، تجدید و احیائے روح اسلامی، فلسفہ مسرت و غم، تطہیر نفس، فضائل علیؑ اور فضائل شہدائے کربلا کے
 تذکروں سے معتبر بنایا۔

نسیم امر وہوی کے سلاموں میں جگہ جگہ منطقی اور استدلالی انداز پایا جاتا ہے وہ اپنی بات کو ذہنی اور جاندار بنانے کے
 لیے استدلال سے کام لیتے ہیں۔ استدلالی انداز کے باوجود انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ سلاموں کی شگفتگی اور
 روانی پر اثر نہ پڑے بلکہ ادبیت برقرار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے سلاموں میں شاعرانہ سجاوٹوں اور فنی حسن و جمال
 کے ساتھ منطقیانہ و عالمانہ استدلال کو درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

وحید الحسن ہاشمی (پ ۱۹۳۰ء)

نام سید وحید الحسن، قلمی نام وحید الحسن ہاشمی، تخلص وحید۔ ۱۹۳۰ء کو جنپور (یو۔ پی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ (۱۳۳)
 والد مولوی سید شبیر حسن، صفا اللہ آبادی تھے جو غزل میں صفا اور عزائی ادب میں حیدر تخلص کرتے تھے۔ وحید الحسن ہاشمی کے بڑے
 بھائی حبیب جو جنپوری (سید محبوب الحسن) صاحب طرز شاعر تھے۔ اللہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔
 اے کیا۔ (۱۳۴) ۴۰ سے زائد شعری و نثری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مرثیہ، غزل، سلام، نوحہ، منقبت، نظم میں طبع آزمائی
 کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید سے بھی خصوصی شغف ہے۔ کئی تحقیقی و تنقیدی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پنجاب میں استاذ الاساتذہ کا
 درجہ رکھتے ہیں اور ”وحید عصر“ کہلاتے ہیں۔ (۱۳۵)

سلام کے دو مجموعے ”چراغ صحرا“ (۱۹۸۳ء) اور ”تشنہ لب ہے حسین“ (۱۹۹۹ء) (۱۳۶) شائع ہو چکے ہیں۔ چراغ

صحرا میں ۷۲ سلام اور ”تشنہ لب ہے حسین“ میں ۱۲۲ سلام ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ۶۱ صفحات پر مشتمل طویل مضمون بعنوان ”سلام نگاری کا فن“ شامل ہے۔ یوں سید وحید الحسن ہاشمی نے ”اردو سلام“ کی تنقیدی تاریخ بھی مرتب کر دی ہے اور سلام کی فنی نزاکتیں بھی بیان کر دی ہیں۔

آرزو لکھنوی اور آل رضا سے تلمذ رہا ہے اس لئے ان کے سلاموں میں فکری عنصر در آیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے وحید عصر کی سلام نگاری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: (۱۳۷)

”دیگر اصناف کی طرح سلاموں میں بھی ہاشمی صاحب ادب برائے زندگی کے وسیع تر معانی پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کو محض واردات قلبی کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ بیداری شعور کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ وہ آل رضا اور نجم آفندی جیسے صاحبانِ کمال فن کے مقلد ہیں اس لئے وہ شاعری کے ذریعے جمود کو توڑ کر زندگی کا متحرک رخ پیش کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاشمی صاحب کسی مخصوص طبقہ فکر کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری قوم کے لئے اپنی شاعری (بالخصوص سلام نگاری) کو جوش و جذبہ اور درسِ حریت کا آئینہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ انقلابی فکر کا پیغام دیتے ہیں اور بیداری شعور کی اس تحریک کے ہم خیال دکھائی دیتے ہیں جس کے امام اقبال ہیں وہ اپنے سلاموں میں واقعہ کربلا کو ایک زندہ استعارہ کے طور پر بیان کرتے ہوئے اسوۂ آل رسول اور فکر اصحاب حسین کو فکر و عمل کا آئینہ بنا کر شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کے مجموعہ ہائے کلام (سلام) چراغ صحرا اور تشنہ لب ہے حسین سے منتخب چند سلام ملاحظہ کیجئے:

غم حسین * رہن بیاں نہیں ہوتا	یہ آگ وہ ہے کہ جس میں دھواں نہیں ہوتا
کوئی بھی جنگ ہو حق کی نظر میں قاتل کا	یہی نشان ہے کہ اس کا نشان نہیں ہوتا
حسین * عظمتِ انساں کی لاج تھے ورنہ	یہاں ضمیر کا سودا کہاں نہیں ہوتا
حسین کہہ کے یہ گزرے ہیں زندہ قوموں سے	لہو تو ہوتا ہے پانی جہاں نہیں ہوتا
دل رباب کو للہ بے زباں نہ کہو	دلوں کو جیت لے جو بے زباں نہیں ہوتا
یہ دور کیا ہے زمانہ حسین * کے غم کو	چھپا کے دیکھ چکا ہے نہاں نہیں ہوتا
نبیؐ کا لال یہ کہہ کر چلا مدینے سے	خدا پرستوں کا کوئی مکاں نہیں ہوتا
بدلتا رہتا ہے انداز امتحانِ وفا	ہر اک زمیں پہ وہی آساں نہیں ہوتا
مقابلہ حق و باطل کی آزمائش کا	جہاں حسین * نہیں ہیں وہاں نہیں ہوتا (۱۳۸)

غم حسین * کا مقصد بدل نہیں سکتا	خیام جل گئے پیغام جل نہیں سکتا
نہ شبہ کو صبحِ الم سے ڈرا شبِ عاشور	حسین * کہہ دیں تو سورج نکل نہیں سکتا
یہ بات بھول گئے دشمن ابوطالب	رسولؐ کفر کے دامن میں پل نہیں سکتا
بنا ہے اب دلِ مومن حسین * کا مسکن	یہ گھر کسی کے جلانے سے جل نہیں سکتا

طلب کریں نہ کسی بدنہاد سے اُلفت زمیں ہو شور تو پودا نکل نہیں سکتا
 اسی کا دعویٰ عشقِ حسینؑ ہے محکم جو مر تو سکتا ہے لیکن بدل نہیں سکتا
 یہ کمسنی یہ سیکنہ کا جذبہٴ تنظیم جگر میں درد ہے آنسو نکل نہیں سکتا
 نکل تو آئے گا ناکِ گلوئےِ اصغرؑ سے مگر رباب کے دل سے نکل نہیں سکتا (۱۳۹)

یہ جو اندازِ طریقت ترا تخیلی ہے تو نے کم ظرف کی آنکھوں سے کہیں پی لی ہے
 جب کبھی اُلفتِ حیدر میں لگے گا پیوند جسم خود بول اُٹھے گا کہ قبا ڈھیلی ہے
 چھوڑ کر جادۂ شہیرؑ کہاں جاتے ہو پاؤں دیکھو نہ پھسل جائیں زمیں گیلی ہے
 جادہ آلِ محمدؐ میں قدم کا رکھنا قلب تو قلب ہے تقدیر کی تبدیلی ہے
 حُبِ حیدر کی زمیں روزِ ازل سے شاداب بغضِ حیدر کی زمیں آج بھی پتھریلی ہے
 بعدِ شہیرؑ بھی ہے قافلہٴ شوقِ رواں فرق اتنا ہے کہ سالار کی تبدیلی ہے
 وقت آیا تو فسونِ اُموی کاٹ دیا لوگ سمجھے تھے کہ عابد نے زباں سی لی ہے
 جس کے ہونٹوں میں نہ ہو اُلفتِ شہیرؑ کا درس بات کیا سانس بھی اس شخص کی زہریلی ہے (۱۴۰)

نبیؐ کا لاڈلا مظہرِ کمالِ رب کا ہے
 حسینؑ صرف ہمارا نہیں ہے سب کا ہے
 کتابِ زیت میں اس کے عمل کی ہے تحریر
 بشر کا ذہنِ قلمِ عالمی ادب کا ہے
 اسی کے نور کے سورج سے دن کی ہے پہچان
 فضائے غم میں یہی تو چراغِ شب کا ہے
 برہنہ پائی بھی ہو لب پہ بھی درود و سلام
 یہ کربلا کی زمیں ہے مقامِ ادب کا ہے (۱۴۱)

حشر میں خوبیِ قسمت کے نظارے بھی تو ہیں
 مطمئن ہم ہیں کہ کچھ لوگ ہمارے بھی تو ہیں

ہم ہیں شبیر کے شیدا تو تحیر کیا ہے
چاند کے حلقہ بگوشوں میں ستارے بھی تو ہیں
کیوں مساوات نہ لے گنج شہیداں سے اثر
جون کے ساتھ محمد کے دلارے بھی تو ہیں
کیسے ہم سارے ستاروں پہ بھروسہ کر لیں
چرخ کی گود میں کچھ نخس ستارے بھی تو ہیں
عظمتِ کرب و بلا صرف شہیدوں سے نہیں
اس میں کچھ بولتے قرآن کے پارے بھی تو ہیں
کربلا یوں ہی تو عالم میں نہیں موج فشاں
اس تلاطم میں نئی فکر کے دھارے بھی تو ہیں
تنہا عباس سے اس واسطے لرزاں ہیں عدو
ان کے اجداد اسی تنہا کے مارے بھی تو ہیں
اس یقین سے سوئے حشر چلے ہیں زوار
اسی میدان میں بخشش کے سہارے بھی تو ہیں
اس توقع پہ اٹھاتے ہیں ستم اہل عزا
غم کا دریا ہے تو دریا کے کنارے بھی تو ہیں
کیوں نہ ہو قربتِ شبیر کا حقدار وحید
اس نے اُلفت میں شب و روز گزارے بھی تو ہیں (۱۳۲)

.....

علیؑ کو دل میں بسا کر سلام کہتا ہوں
زمیں کو عرش بنا کر سلام کہتا ہوں
مرے شعور میں آتا ہے جب خیال حسینؑ
ہر اک خیال بھلا کر سلام کہتا ہوں
جہاں حسینؑ کے غم کے سوا کچھ اور نہیں
میں اس مقام پہ آ کر سلام کہتا ہوں

امام وقت کے دم سے ہے سر بلند مرا
جبین وقت جھکا کر سلام کہتا ہوں
مناقت مرے شعروں تک آ نہیں سکتی
میں اس پہ ضرب لگا کر سلام کہتا ہوں
فضائے عشق پہ چھاتی ہے جب حسینؑ کی یاد
غزل کا نقش مٹا کر سلام کہتا ہوں
قسم ہے منظر شان خدا کے ٹھوکر کی
اجل سے آنکھ ملا کر سلام کہتا ہوں (۱۳۳)

سید وصی الحسن نقاش

سید وصی الحسن نام اور نقاش تخلص ہے۔ ان کے دادا سید شبیر حسن الہ آبادی غزلوں میں صفا اور منقبتوں میں حیدر تخلص کرتے تھے۔ نقاش کے تایا حبیب جو پوری صاحب دیوان تھے ان کے والد سید وحید الحسن ہاشمی حیات ہیں انہوں نے نعت، منقبت، سلام، نوادہ، غزل اور تنقید پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ نقاش ۱۹۶۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے ان کی منقبتوں اور سلاموں کا ایک دیوان بعنوان ”کوئی صحرا میں بنائے مقتل“ ۱۹۹۹ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے اس دیوان میں ۳۱ سلام ہیں آج کل امریکہ میں قیام ہے۔

وصی الحسن نقاش کے سلاموں میں جدید رنگ جھلکتا ہے۔ سلاست اور روانی کے ساتھ تخیل کی بلند پروازی قابل دید ہے۔ عام طور سے چھوٹی بحروں میں شعر کہتے ہیں مگر ان کے شعروں کا اسلوب اتنا کاٹ دار ہوتا ہے کہ جو سنتا ہے سردھنسا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے عصری حقائق کا ادراک رکھتے ہیں۔ واقعات کو بلا سے نفسیاتی حقائق نکال کر بڑی خوبی سے عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ان کے سلاموں میں جوش ملیح آبادی کی گھن گرج نہیں بلکہ آل رضا کا سکون اور ٹھہراؤ ہے مگر ایسا سکون جو قلب میں ولولہ اور ذہن میں تابناکی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے تین سلام پیش قارئین کئے جاتے ہیں۔

(۱)

آدمی کو جینے کا اک ہنر سکھاتا ہے
راستہ شہادت کا کربلا سے جاتا ہے
حق کی پاسبانی کا جب نہ کوئی ناصر ہو
اک حسینؑ عالم کا سارا بار اٹھاتا ہے

یہ حسینؑ کا دل تھا یہ حسینؑ کی ہمت
 کون باپ بیٹے کی قبر خود بناتا ہے
 شعلہٴ حسد سے جب باغ دیں کو خطرہ ہو
 باغ ہی کا رکھوالا باغ کو بچاتا ہے
 جذبہٴ حسینؑ سے جس کا دل منور ہو
 پھر وہ شخص ساحل پر کشتیاں جلاتا ہے
 لاکھ چارہ گر چاہیں ہاتھ کچھ نہ آئے گا
 جذبہٴ حسینؑ ہی زنگِ دل مٹاتا ہے
 کربلا کی عظمت کا اک نشان ہے یہ نقشِ
 یہ زمین کا ٹکڑا مہر و مہ اُگاتا ہے (۱۴۴)

(۲)

جو بھی مظلوم کا سہارا ہے
 وہ کہیں کا بھی ہو ہمارا ہے
 جس کو طوفانِ نوح چھو نہ سکے
 غمِ شیمڑ وہ کنارہ کنارا ہے
 بحرِ امداد آ گئے شیمڑ
 جب بھی اسلام نے پکارا ہے
 تیر کھا کر تو ہنس دیا بچہ
 اب بتاؤ کہ کون ہمارا ہے
 شہ سے لرزاں ہے اس لئے ظالم
 وہ عمل کے لئے اشارا ہے
 کربلا سے ہمیں ہے گر نسبت
 زندگی کا شجر ہمارا ہے
 ایک ہی نام کربلا ہے جہاں
 موت کو زندگی نے مارا ہے

جس کو شب بھر گنا کئے نقاش
اسم شہر وہ ستارا ہے (۱۳۵)

(۳)

بقا کا لفظ بنا ہے اس آدمی کے لئے
کہ جس نے شمع بجائی تھی روشنی کے لئے
نہ پوچھ ہم سے کہ کتنا بڑا ہے وہ خالق
کہ جس کے پاس ہے شہر بندگی کے لئے
یہ افتخار ہے حاصل حسین کو ورنہ
شہید کون ہوا رسم زندگی کے لئے
زباں پہ اس لئے نام یزید آتا ہے
کوئی مثال ہو دنیا میں تیرگی کے لئے
تمام وقت میں چپتا ہوں نام سرور کا
یہ نام کافی ہے ذہنوں کی تازگی کے لئے
مجھے تو آل نبی ہی کا گھر ملا کہ جہاں
ستارا اترتا ہے گردوں سے آدمی کے لئے
بڑے شعور کے مالک ہیں اس لئے نقاش
در حسین " سے لپٹے ہیں زندگی کے لئے (۱۳۶)

ہوش عابدی

اصل نام سید غلام حیدر قلمی نام ہوش عابدی اور تخلص ہوش کرتے ہیں۔

ہوش کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے غالب کی غزلوں کی زمین میں سلام کہے ہیں اور ہر غزل پر سلام کہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۳ میں یہ کام شروع کیا اور ۱۹۸۳ میں مکمل کر لیا وہ آسی الدنی کے شاگرد زخمی لکھنوی کے بیٹے ہیں۔ ان کے سلاموں کا مجموعہ ”علی کل غالب“ کے عنوان سے ۱۹۹۹ میں شائع ہوا جس میں شامل سلاموں کی تعداد ۲۳۸ ہے۔ ہر سلام کے اوپر غالب کی غزل کا پہلا مصرع جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔ پھر اسی غزل کی زمین میں سلام کہا گیا، سلام درج ہے:

ہوش اپنے سلاموں میں محمدؐ و آل محمدؐ کا ذکر غزل کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ لیکن سلام کے مزاج اور مجموعی آہنگ پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ وہ شہرؔ اور اصحاب شہرؔ کے عزم و ہمت اور حوصلے سے قوم کو توانائی بخشنے کے خواہش مند ہیں۔ ہوش مقطع میں غزل کی مانند کوئی نہ کوئی پیغام دیتے ہیں۔

ہوش کے مجموعہ کلام سے منتخب چند سلام ملاحظہ کیجئے:

پوچھ رہے ہیں ہم سے لوگ اشکِ عزا بہائے کیوں
دل کے معاملات میں کوئی سوال اٹھائے کیوں
تیر لگا تھا حلق پر کوئی تھی خوشی کی بات
اصغرؔ تشنہ کام ہے پوچھیئے مسکرائے کیوں
فعلِ رسولؐ و قولِ حق دونوں ہیں جب بہم تو پھر
آپ کی اپنی رائے کیا آپ کی اپنی رائے کیوں
رونے کی وجہ پوچھیئے رونے سے روکنا غلط
عشق کا غم سنگھار ہے کوئی یہ غم گھٹائے کیوں
مولا علیؑ سے تجھ کو پیار ان کا عرو بھی باوقار
دیں میں یہ زہرِ مصلحت کوئی مجھے بتائے کیوں
جب میں خلوصِ دل کے ساتھ جامپ کر بلا چلوں
راستہ میرا روکنے راہ میں کوئی آئے کیوں (۱۳۷)

کیوں کائناتِ عشق کا محور نہیں ہوں میں
کیا خاک پائے ساقی کوثر نہیں ہوں میں
دہلیزِ شہرِ علم کا پتھر نہیں ہوں میں
اے زندگی یہ کیا ہے کہ ہو کر نہیں ہوں میں
بچے نے تیز ظلم پہ ہنس کر جتا دیا
گو موت سامنے ہے پہ مضطر نہیں ہوں میں
اس رشک نے تو اور بھی بے چین کر دیا
کیوں مرتبے میں ثانیِ قصر نہیں ہوں میں

کرب و بلا پہ روؤں گا سو بار روؤں گا
 انسان ہوں دل ہے پہلو میں پتھر نہیں ہوں میں
 اصغرؑ نے مسکرا کے یہ پوچھا تھا باپ سے
 کیا کربلا کا فاتح خیر نہیں ہوں میں
 بچے نے مسکرا کے یہ پوچھا کہ اہل ظلم
 دنیا کا بے نظیر دلاور نہیں ہوں میں
 گردن میں تیر ظلم ہے ہونٹوں پہ ہے ہنسی
 اصغرؑ تو میرا نام ہے اصغرؑ نہیں ہوں میں
 ہے ہر نفس کی آمد و شد میں علیؑ علیؑ
 یہ کس نے کہہ دیا کہ تو نگر نہیں ہوں میں
 ہے مدح اہلبیتؑ سے ثابت یہ امر ہوش
 لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں (۱۳۸)

یہ دولت بڑی ہے یہ دولت سلامت
 ترا غم رہے تا قیامت سلامت
 کٹانے کو سر ہم ہیں موجود آقا
 یہ اصحاب کہتے تھے حضرت سلامت
 زماں و مکاں تیرے قیدی ہیں مولاً
 ہے ہر دور میں تیری عظمت سلامت
 بچا سکتے تھے جان شیر اپنی
 نہ رہتی مگر آدمیت سلامت
 یزیدی تبختر فنا ہو چکا ہے
 شیر کربلا کی ہے عظمت سلامت
 کوئی زیر مخنجر دعا کر رہا ہے
 رہے حشر تک دین و ملت سلامت

جلا ڈالا جبر یزیدی کا پیکر
 یہ ننھا تبسم یہ قوت سلامت
 یہ دیوان ہو جائے گا ہوش پورا
 اگر رہ گئے تھوڑی مدت سلامت (۱۳۹)

ایک زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا مزاج داخلی تھا۔ آدمی کے ذہن و دل میں جو خیالات پیدا ہوتے تھے ان کا اظہار کلام میں کر دیا جاتا تھا۔ قدرت نے انسانی جسم میں جن جذبات کی نشوونما کی تھی ان میں محبت کا جذبہ بڑا دیر پا اور زود اثر تھا۔ اس لیے قدیم شعراء نے اپنی شاعری کا مرکز محبت کو بنایا۔ فرق یہ تھا کہ ظاہری انسانی محبت کے پس پشت خدا کی محبت کا جذبہ پیش کیا جاتا تھا۔ قدیم اردو شاعری میں زیادہ تر محبوب خدائی کو تسلیم کیا گیا۔ ایک تو اس کی محبت دین و ایمان کا حصہ تھی دوسرے شعراء اپنے دل کی بھڑاس بڑے محتاط انداز میں نکال لیا کرتے تھے۔

جب نظریات میں تبدیلی ہوئی اور مذہب نے اپنے پاؤں مستحکم کر لیے تو ان ہستیوں کی طرف محبت کا قافلہ مڑ گیا جنہوں نے اسلام کے لیے اپنا تن من و دھن لٹا دیا۔ صوفی شعراء نے تصوف کے اشعار میں خدا کی ذات اور کائنات کا تذکرہ کیا لیکن کچھ شعراء نے محبوب خدا کے حسن کا اور اس کے جذبات و خیالات کا ذکر کرنا اپنی سعادت سمجھا۔ یہیں سے نعت نگاری اور سلام نگاری کی ابتدا ہوئی۔

۶۱ھ کے بعد کربلا کے واقعات نے اسلامی سیاست کا رخ موڑ دیا۔ امام حسینؑ اور ان کے اعزاء کی قربانی نے لوگوں میں فکر و عمل کا جوش بھر دیا۔ عمل کے مقابلے میں رد عمل، ظلم و جبر کے مقابلے میں بے کسی و بے چارگی، تخت کے مقابلے میں درویشی اور بادشاہت کے مقابلے میں امامت کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ اسلامی ملکوں میں اس واقعے نے لوگوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس تناظر میں امام حسینؑ تحریک آزادی کا نشان اور یزید جبر و بربریت کی علامت سمجھا گیا۔ جگہ جگہ عوامی انقلابات آئے۔ حکومتیں بدلیں، لوگوں کے نظریات بدلے، مرہیے لکھے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلام نگاری کا پودا بھی لگایا گیا چونکہ واقعہ کربلا کے تاثر میں غم و اندوہ کی فضا حاوی تھی اس لیے سلاموں میں یا تو واقعات دوہرائے گئے یا مصائب کا تذکرہ کیا گیا۔

واقعہ کربلا کے بعد عربوں کی کثیر تعداد سندھ کے ساحل پر بس گئی۔ جنہوں نے ہر سال محرم کی یاد میں جلسے کئے۔ جلوس نکالے اور حسینیؑ عزم و ہمت کا تذکرہ کیا اس کے ساتھ ساتھ حریت فکر اور آزادی کے جذبے سے سرشار افراد نے سندھ میں تبلیغ اسلام اور تبلیغ حسینیت کا بیڑا اٹھایا۔

آپس کے میل جول اور دیرینہ مصاحبت کی وجہ سے جب لوگ سمندر کے ساحل سے دکن میں آباد ہوئے تو فروغ مرثیہ کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ دسویں صدی عیسوی تک عربوں کے ساتھ ایرانی بھی دکن میں آباد ہو گئے اور بادشاہوں کی اعانت سے عزاداری کے رسوم ادا ہونے لگے یہی وہ جگہ ہے جہاں سلام نگاری کا ختم ہوا گیا اور متعدد شعراء نے

سلام کہنے شروع کیے۔ لیکن ابتداء میں سلاموں کا وہی رویہ رہا جو مرثیے کے ساتھ مختص تھا یعنی تذکرہ غم حسین اور واقعات کربلا کا حال بیان کیا جاتا تھا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اور نصیر الدین ہاشمی کے قول کے مطابق دکن میں ایسے شعراء پیدا ہوئے جنہوں نے سلام کہے اور سلام نگاری کو وسعت دی۔ (۱۵۰)

جب مغلوں نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو اپنی حدود میں شامل کر لیا تو یہاں کے شعراء کا دہلی کے شعراء سے ربط و ضبط بڑھا اور اکثر شعراء دکن سے دہلی آ گئے۔ دہلی کی نکسالی اردو اپنے بچپن کے دور سے گزر رہی تھی۔ جب یہاں کے شعراء نے دکنی شعراء کا کلام سنا تو ان کے دلوں میں بھی رشک پیدا ہوا اور دہلی میں بھی سلام نگاری کی فضا پیدا ہو گئی۔ مسکین، گدا، یک رنگ، شاکر ناجی اور دوسرے شعراء نے سلام کہے جن میں زبان کا تغیر تو آ گیا لیکن اسلوب میں کوئی نمایاں اور قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی۔ نہ مفاہیم میں کوئی ارتقاء ملتا ہے البتہ میر و سودا کے زمانے میں سلام نگاری نے ایک نئی کروٹ لی۔ سودا کو مذہب کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی عشق تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ شعر میں ادب اور فن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مرثیے اور سلام کو صرف رونے رلانے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ وہ پہلی کوشش تھی جس کی بدولت سلام نگاری کو ادبی منزل مل گئی۔ اس دور کے اکثر شعراء سلاموں میں نئے نئے گوشے اور نئی نئی تراکیب استعمال کرنے لگے۔ غالب کے زمانے تک آتے آتے سلام ادبی لحاظ سے مضبوط پیرایہ اختیار کر چکا تھا۔ خود غالب کا سلام اس بات کا ثبوت ہے کہ دہلی میں سلام نگاری کا فن عروج کی طرف رواں دواں تھا۔

زوال دہلی کے بعد نہ وہ فضا رہی اور نہ وہ لوگ، پورا نظام تتر بتر ہو گیا۔ محفلیں اور مجلسیں ختم ہو گئیں۔ شعراء بے دست و پا ہو گئے۔ روز روز کی لوٹ کھسوٹ نے معاشی حالات تبدیل کر دیے۔ ادب تو ایک طرف رہا بنیادی عقائد میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے شعراء لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ انشاء میر تقی میر اور سودا کے آجانے سے لکھنؤ کا مزاج دو آتشہ ہو گیا۔ میر خلیق اور میرزا ضمیر مرثیے کے آسمان کے مہر و مد تھے اور سلام نگاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن غزلوں کے رواج کی وجہ سے سلام صرف مجلسوں تک محدود رہا اور عوام میں اس کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں۔ واجد علی شاہ کے دور تک آتے آتے لکھنؤ کے مزاج میں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ دہلی کی داخلیت نے لکھنؤ پہنچ کر خار جیت کا روپ دھار لیا۔ اب لکھنؤ کے غزل گو محبوب کے سراپا اور چوٹی، کنگھی، انگلیا کی شاعری کرنے لگے۔ انشاء رند اور اسیر سب کے سب اس خارجی شاعری کے اسیر ہو گئے۔ اس قسم کی شاعری سے معاشرے میں جو ابتذال پیدا ہوا اس کا تذکرہ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں بڑے دلدور اور پردرد الفاظ میں کیا ہے۔ انیس و دہیر کی انگلیاں عوام کی بنیوں پر تھیں وہ سوسائٹی کے زیر و بم کو دیکھ رہے تھے۔ اخلاقی گراؤ بھی ان کے سامنے تھی۔ معاشرے کی تباہی مہذب انسانوں کو برباد کر رہی تھی۔ ایسی صورت میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ سلاموں کو معتبر رنگ دے کر غزلوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جائے۔

اب سلاموں کی فضا میں ایک عام سی تبدیلی نظر آنے لگی، جن سلاموں میں پہلے واقعات کربلا بیان ہوتے تھے اور

مصائب کا تذکرہ کیا جاتا تھا ان میں اب اخلاقی مضامین، تصوف کے مضامین اور کبھی کبھی تغزل کا لہجہ بھی شامل کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر میر انیس کا ایک سلام دیکھئے جس کا مطلع ہے:

شبِ امام زمانہ کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں
اس مطلع میں تغزل اپنے بھرپور لہجے میں نمایاں ہوا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے سلام کا یہ مطلع:
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

بھی بھرپور تغزل لیے ہوئے ہے جس میں حسینوں کا لفظ استعمال کر کے عمومیت پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سلاموں میں اخلاقیات کے جس قدر مضامین انیس و دیر نے باندھے ہیں ان سے سلاموں کا مرتبہ بھی بڑھا ہے اور اس کی عزت میں بھی اضافہ ہوا ہے مثلاً انیس کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت رزق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

اس کے علاوہ سلاموں میں شاعرانہ چشمک کا بھی وجود ملنے لگا حالانکہ سلام کی فضا میں اس قسم کے اشعار کی بالکل گنجائش نہیں تھی مثلاً انیس کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انیس نے دانستہ طور پر یہ تبدیلی کی لیکن اس کے دو اثرات واضح طور پر نمایاں ہونے لگے۔ ایک تو پوری اردو شاعری مرعے اور سلام کی وجہ سے مخرب اخلاق رویے کو ترک کر بیٹھی اور دوسری طرف سلاموں کے دائرے میں بہت زیادہ وسعت آ گئی۔ ان مرثیہ گوئیوں کے سلاموں کا سب سے اچھا اثر یہ ہوا کہ غزلوں کی تکنیک سلاموں میں استعمال ہونے لگی۔ غزلوں کے مضامین سلاموں میں در آئے اور پورے لکھنؤ میں مسالوں کا رواج شروع ہو گیا۔ مسالوں کے رواج عام کی وجہ سے اردو غزلوں کا ابتداء بھی بہت حد تک کم ہونے لگا۔ اس زمانے میں داغ اور امیر مینائی سامنے آئے اور انہوں نے اردو غزلوں کے معیار کو ابتداء سے نکال کر زبان اور لہجے کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ خصوصیت سے داغ نے اردو زبان کو جو عوامی ذہن دیا اور امیر مینائی نے جو غزلوں میں لہجے کی تبدیلی کی وہ اپنی اپنی جگہ بہت اہم کام ہیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں روس میں انقلاب آ گیا۔ روس ہندوستان کا پڑوسی ملک تھا وہاں عوام نے بادشاہ سے تخت و تاج چھین کر شاہی کا خاتمہ کر دیا۔ روس کے انقلاب سے اہل ہند کا متاثر ہونا بہت ضروری تھا چنانچہ پوری اردو شاعری

کا رخ مادر وطن کی آزادی کی طرف مڑ گیا۔ اردو غزلوں اور نظموں میں ظلم کے خلاف بغاوت اور تخت کے خلاف نفرت کے جذبات نمایاں ہونے لگے۔ سلام نگار شروع ہی سے بڑی ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ اب پورا ہندوستان سلام نگاروں کی آواز میں آواز ملانے لگا۔ انگریزوں نے اہل ہند پر تشدد برقرار رکھا۔ ہزاروں لیڈر قید کیے گئے لیکن ظالموں، جابروں، قاتلوں کے خلاف نفرت کم نہ کر سکا۔ سلاموں کے سلسلے میں خاندان اجتہاد نے بڑی کاوشیں کیں۔ ایک طرف میرزا دبیر کے پوتے میرزا رفیع طاہر سلاموں کا معیار بڑھا رہے تھے۔ دوسری طرف ذاکر مرحوم اور صفی مرحوم سلام میں غزلوں کی رنگین اور اس کی پہلوداری منتقل کر رہے تھے۔ ذاکر مرحوم نے ان قوانی اور ردیفوں میں سلام کہے جن میں داغ اور امیر کی غزلیں بہت مشہور ہو چکی تھیں۔

ابھی یہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک جاری ہوئی اور غزلوں کا سارا پرانا سانچا تبدیل ہو گیا۔ اب عشق و عاشقی، گل و بلبل، شمع و پروانہ کی بجائے وطن کی محبت اور آزادی کے جذبے کا اظہار کیا جانے لگا۔ غزلوں کی اس تبدیلی سے نظموں کو عروج ملا اور جوش ملیح آبادی، سردار جعفری، اختر الایمان، واثق جونپوری، سلام مچلی شہری، فیض احمد فیض اور دوسرے بہت سے شعراء سامنے آئے۔ اسی زمانے میں سلاموں کو نجم آفندی کی شکل میں ایک شخصیت مل گئی۔ نجم آفندی انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے سلاموں میں تخت و تاج، شاہی اور حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی۔ نجم کے ساتھ ساتھ زائر سیتاپوری، جمیل مظہری، اختر تہمیری، رزم ردوئی، مہر جانیسی، صفی لکھنوی، فضل لکھنوی، محسن اعظم گڑھی اور دوسرے بہت سے شعراء منظر عام پر آئے۔ اس طرح تقسیم ہند سے قبل سلاموں کے ذخیرے میں معتد بہ اضافہ ہو گیا اور سلام آزادی، اخوت، مساوات اور حریت فکر کا مظہر بن کر سامنے آیا۔

قیام پاکستان کا مطالبہ دو قومی نظریے کی پیداوار تھا جس کا واضح مقصد یہ تھا کہ مسلمان ایک ایسا ملک چاہتے ہیں جہاں وہ اپنی مذہبی رسومات، اپنے عقائد کے لحاظ سے ادا کر سکیں اور ہندوستان میں اسلام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اسے ختم کر کے قرون اولیٰ کی اسلامی تہذیب کو ابھارا جائے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمان پاکستان میں اسلام کا نشاۃ ثانیہ چاہتے تھے۔ اس نقطہ نظر سے جب مذہبی فضا ابھری تو خدا اور رسول کے ساتھ آل رسول کا امیج بھی ابھر کر سامنے آیا اور ذکر شہادت امام حسین گلی گلی کوچے میں ہونے لگا۔ اس صورت حال کے پیش نظر شعراء کی ایک کثیر تعداد سلام نگاری کی طرف مائل ہو گئی۔ اس کے علاوہ ریڈیو ٹی۔ وی نے بھی سلام نگاری کے فن کو بہت عروج دیا۔ ہر سال محرم کے موقع پر ریڈیو ٹی۔ وی پر محافل سالانہ منعقد ہوتی تھیں اور شرکائے مجلس کو حکومت کی طرف سے نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ایسے شعراء سلام نگاری کے میدان میں آ گئے جو مذہب کے نام سے کتراتے تھے۔ ان کیونٹ روس نواز اور چچن نواز شعراء نے ٹی۔ وی اور ریڈیو میں شرکت کرنے کی وجہ سے سلام کہنا شروع کر دیے۔ حکومتی امداد کے علاوہ ملک کے روساء، زمیندار اور تاجروں نے بھی سلام نگاری کے فن کے عروج میں بڑا حصہ لیا۔ خاص طور سے کراچی اور لاہور میں تاجروں کی طرف سے سلام نگاروں کو نذرانے دینے کی رسم

چلی جواب فی شاعر ایک ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے۔ اس لیے کچھ ایسے شعراء بھی پیدا ہوئے جو سلام نگاروں کو منفعت بخش سودا سمجھ کر اختیار کرنے لگے۔ بہر حال سبب کچھ بھی ہو پاکستان کے قیام کے بعد سینکڑوں سلام نگار منظر عام پر آئے اور سینکڑوں سلام کی کتابیں طبع ہوئی۔ جن شعراء نے سلام نگاری میں شہرت پائی ان میں جوش ملیح آبادی، سید آل رضا، نجم آفندی، احسان دانش، قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی، مشکور حسین یاد شاہ نقوی، ڈاکٹر صفدر حسین، استاد قمر جلالوی، ساحر فیض آبادی، ذاب فتح پوری، عاصی کرنالی، کوثر پانی پتی، مسعود رضا خاکی شامل ہیں۔ ان تمام شعراء کے سلاموں میں واقعات سے زیادہ مقصدیت کی طرف رجحان ملتا ہے۔ انہوں نے مقصد حسین کی تبلیغ کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنالیا اور حق کی حمایت کے لیے دیوانہ وار کام کرنے لگے۔ حق و باطل کی یہی کشمکش ان کے سلاموں کی روح ہے۔

ان کے علاوہ جن جدید شعراء نے پاکستان میں سلام نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار انجام دیا اور مستقبل میں اس صنف کی ترقی کے امکانات واضح کیے ان میں ڈاکٹر یاور عباس، ضیاء الحسن موسوی، شوکت تھانوی، حفیظ ہوشیار پوری، ماہر القادری، نصیر ترائی، راغب مراد آبادی، سبط حسن انجم، اسیر فیض آبادی، کوثر نقوی، ہلال نقوی، نیر اسعدی، قمر شکار پوری، ساحر لکھنوی، اقبال کاظمی، معجز جونپوری، فہیم ردولوی، انعام نقوی، ثاقب مظفر پوری، زاہد فتح پوری، عابد رضا خلیب، سردار نقوی، شاداں دہلوی، سرفراز ابد، فیض محمد گوہر جعفری، نیساں اکبر آبادی، فارغ بخاری، ابرار عابد، شاہد جعفر، آصف عابدی، عاصم گیلانی، افسر رضوی، حسن عسکری، کاظمی، حفیظ تائب، وجاہت حسین، ظفر شارب، نزدوش ترائی، اسرار زیدی، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر حسن رضوی، گلزار بخاری، ڈاکٹر شبیہ الحسن، عباس تابش، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، نشاط واسطی، وصی الحسن نقاش، ڈاکٹر نواز زیدی اور علی رضا کاظمی کے نام اہم ہیں۔ ان شعراء نے شعوری طور پر عصری آگہی کے حوالے سے سلام نگاری کا آغاز کیا۔ ان کے نزدیک سلام نگاری آہ و فغاں اور حسرت و یاس کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ سیرت حسین کا ایسا دلاویز مرقع ہے جس سے انسانیت قیامت تک رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہر زمانہ، معاشرت، تہذیب، تمدن، ثقافت اور تاریخی روایت اپنے عہد کے شعری ادب کو متاثر کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں برصغیر میں بہت سی سیاسی، معاشی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے اردو ادب اور شاعری کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ شاعری چونکہ سوسائٹی کی تابع ہوتی ہے اس لیے یہ ضروری تھا کہ صنف شاعری میں بھی تبدیلیاں رونما ہوں تاکہ وہ وقت کے اہم تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ شاعر معاشرے کا نباض ہوتا ہے وہ بگڑے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر معاشرے کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی کوششوں کے نتیجے میں پاکستان کے اہم سلام گو شعراء نے اپنی جدت طبع اور اختراع کا ثبوت دیتے ہوئے فکر و نظر کے مختلف نظریے پیش کیے ان سلام نگاروں نے تاریخی واقعات اور سماجی تحریکوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلام کو جدید آہنگ سے روشناس کیا۔

دور غلامی میں آزادی حاصل کرنے کے لیے شعراء نے واقعات کو بلا ایثار و کردار حسین کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہوئے عوام میں بیداری کی لہر دوڑادی۔ عوام میں فلسفہ شہادت حسین نے وہ ہمت اور ایثار کا جذبہ پیدا کیا کہ انہوں نے آزادی

کے حصول کے لیے ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور جان کا نذرانہ پیش کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی اور معاشرتی حالات کے بدلنے بننے اور سنوارنے کے عمل کا سلام نگاری نے گہرا اثر قبول کیا۔ سلام نگاری میں حقیقت پسندانہ رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا اس کے ساتھ ساتھ سلام نگاری اصلاح احوال اور سبق آموزی کا رجحان اختیار کرتی چلی گئی۔ معاشرتی انتشار میں عوام کو کوفنے کے شر پسندانہ رجحان کی تصویر دکھائی دی۔ معاشی ابتری اور قحط سالی کے دنوں میں عوام نے کربلا میں محصور حسینی قافلے کا تذکرہ کیا۔ بھوک و پیاس اور معاشی عدم استحکام میں عوام کے ذہنوں میں کربلا میں پیاس کی شدت کا احساس ابھرا۔ سختی اور تنگ دستی کے دنوں میں کربلا کی گرمی کو مد نظر رکھ کر ہمت و استقامت کے خطوط متعین کئے گئے۔ غرض اخلاق و عادات کو سنوارنے میں سلام نگاری نے اہم کردار ادا کیا۔

اس وقت جو سلام لکھے جا رہے ہیں ان میں سماجی اور سیاسی نقطہ نظر کی وضاحت بہت صاف نظر آتی ہے۔ استعاروں اور تشبیہات کی مدد سے قدیم واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے جدید مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں جوش، آل رضا، نجم آفندی کے سلاموں کے علاوہ وحید الحسن ہاشمی کے سلاموں میں اس قسم کے سیاسی اور سماجی نقطہ ہائے نظر بڑی آسانی سے معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں وحید الحسن ہاشمی کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

کیوں مساوات نہ لے گنج شہیداں سے اثر

جون کے ساتھ محمدؐ کے دلارے بھی تو ہیں

جمہوریت ہی کے سلسلے میں وحید الحسن ہاشمی نے اس نظریے کی تبلیغ کی ہے کہ اگر دنیا کے تمام فیصلے اکثریت ہی کے زور سے ہوتے ہیں تو آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ ووٹر امام حسینؑ ہی کے ہیں۔ اس لیے افکار حسینی کو خلافت کرنے کا حق ہے۔ بقول سید وحید الحسن ہاشمی:

جمہور کا اگر کوئی دستور ہے تو آج

حاصل حسین کو ہے حمایت عوام کی

دیگر شعراء نے بھی اس قبیل کے اشعار کہے جن میں شہنشاہیت کے خلاف اور تخت و تاج کی مخالفت میں عوامی حکومت کا ساتھ دیا گیا ہے۔ جب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگائی تو پاکستان میں اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا گیا۔ چنانچہ ساحر فیض آبادی نے اپنے ایک شعر میں اس واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ بقول ساحر فیض آبادی:

ظلم کے ہاتھوں نہ پوچھو ہائے کیا کیا جل گیا

مسجد اقصیٰ جلی کعبے کا پردہ جل گیا

اسی طرح انہوں نے جمہور کے حقوق کے لیے بھی لب کشائی کی ہے اور اپنے ایک شعر میں یہ بتایا ہے کہ جمہوری حقوق کے خلاف جو لوگ کام کر رہے ہیں یا جو حکومت کام کر رہی ہے وہ حقیقت میں انسانیت سے بغاوت کر رہی ہے۔ بقول ساحر فیض آبادی:

تابع ہوں اقتدار کے جمہور کے حقوق
انسانیت سے ہے یہ بغاوت کا فیصلہ

کسی زمانے میں علامہ اقبال نے خانقاہی نظام کے خلاف اشعار کہے تھے اور یہ بتایا تھا کہ جب تک اس خانقاہی نظام کو تبدیل نہیں کیا جائے گا اور دور کثرت کے اماموں کو اسلام کے تصور سے باخبر نہ کیا جائے گا حقیقی آزادی کا ملنا دشوار ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک مسجد کے یہ ملا نماز کی اجازت کو ملک کی آزادی سمجھتے ہیں۔ اقبال کا یہ خیال مختلف طریقوں سے شعراء نے اپنے شعروں میں باندھا ہے اور علمائے سوء کے خلاف بڑی سخت تنقیدیں کیں ہیں۔ سلام نگاروں نے بھی اس خیال کو سلاموں میں نظم کیا ہے چنانچہ ذابریغ پوری جب علماء کے ٹھاٹ بھاٹ، بناوٹ اور حسد دیکھتے ہیں تو وہ اس کا اظہار اپنے سلاموں میں بڑی خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ بقول ذابریغ پوری:

عداوت، بناوٹ، حسد، کتہ چینی
مجالس میں ہم کچھ یہی دیکھتے ہیں

دنیا میں انقلاب ایران اسلام کی فضا کے لیے نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انقلاب ایران کا پاکستان پر بڑا گہرا اثر پڑا اور سلام نگاروں نے مختلف طریقے سے اس سیاسی و مذہبی رجحان کو اپنے سلاموں میں جگہ دی۔ شاہد نقوی اس سلسلے میں کہتے ہیں:

معجزہ ہے قوت ایمان کا
انقلاب حق نما ایران کا

واقعہ کربلا کا اثر ہر جگہ پہنچا اور اس واقعے سے فکر انسانی نے آزادی کی نعمت وصول کی۔ عاصی کرنا لی نے اپنے سلاموں میں اس خیال کو جگہ دی اور بتایا ہے کہ اگرچہ امام حسین کے حرم اسیر ہو گئے لیکن انہوں نے انسان کو ہمیشہ کے لیے قید جبر سے آزاد کروادیا۔ بقول عاصی کرنا لی:

انسان کو حشر تک کے لیے قید جبر سے
آزاد کر گئے ہیں اسیران کربلا

آج کل کے شعراء کا بنیادی موقف یہ ہے کہ کربلا کس خاص طبقے یا خیالات کی حدود میں مقید نہیں بلکہ جہاں بھی جبر و تشدد کی حکومت ہوگی وہیں حقانیت کے پرستار شہیدان کربلا کی عظمت کا نام بھی لیا جائے گا۔ یہی کربلا کی وہ آفاقیت ہے جس کی وجہ سے آج دنیا کی ہر قوم واقعہ کربلا کے ثمرات سے اکتساب کر رہی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد قلیل عرصے میں سلام نگاری کی روایت کو جو استحکام نصیب ہوا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ سلام نگاری کا مستقبل بہت امید افزا اور تابناک ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سلام نگار شعراء کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ سلام نگاری کے اسلوب بیان، اثر انگیزی اور عزائی تاثر میں قلیل ذکر اثر پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں سلام نگاری کے موضوعات

اور دیگر روایات کی ادائیگی میں خوشگوار تبدیلی دکھائی دیتی ہے جس کی بدولت سلام نگاری میں جدیدیت کا رنگ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ قدیم روایت سے متاثر شعراء کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو رہا ہے لیکن جدید رنگ اور طرز بیان نے سلام نگاری کو ایک نئے اسلوب اور موضوعاتی تاثر سے ہمکنار کیا ہے جسے بجا طور پر قدیم و جدید کا حسین امتزاجی رنگ کہا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سلام خوانی کے مراکز میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا۔ مختلف علاقوں میں نئے امام باڑے تعمیر ہوئے۔ نجی رہائش گاہوں میں سلام خوانی کی محافل منعقد ہونے لگی ہیں۔ عوامی جگہوں، پارکوں، جلسہ گاہوں اور دیگر سنٹروں میں سلام خوانی کی محافل منعقد کی جاتی ہیں جن میں ملک کے نامور سلام نگار شعراء اپنا تازہ کلام سناتے ہیں۔ ان محافل میں ہر مکتب فکر سے متعلق افراد شرکت کرتے ہیں اور بارگاہ شہدائے کربلا میں خلوص، احترام اور عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد سلام خوانی کی حوصلہ افزائی کے لئے جہاں مختلف مراکز قائم کئے گئے وہاں مختلف انجمنیں بھی معرض وجود میں آئی ہیں۔ جن کے زیر اہتمام محافل مسالہ منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یہ انجمنیں سلام خواں حضرات کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ان انجمنوں کی مساعی کی بدولت ملک کے طول و عرض سے سلام خواں حضرات محافل مسالہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سلام نگار شعراء کے کلام و سلام کی تدوین و تالیف اور تصنیف و اشاعت کا کام بہت امید افزا ہے۔ قدیم شعراء کے علاوہ جدید شعراء کے کلام کی اشاعت کی جارہی ہے جس کی بدولت سلام نگاری کی روایت کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع ملے رہے ہیں۔ سلاموں کی اشاعت سے سلام کہنے کی روایت کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور نئے نئے شعراء کرام اپنے سلاموں کی عقیدت مندانہ کاوشوں کی بدولت محافل مسالہ کی رونقوں کو دوبالا کر رہے ہیں۔ سلام نگار شعراء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ پاکستان کی سلام نگاری کی روایت کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ان رسائل و جرائد کی تعداد میں امید افزا اضافہ ہوا ہے۔ جن میں تمام ملک سے متعلق شعراء کرام کے سلاموں کو شائع کیا جا رہا ہے۔ شعراء کرام کے سلاموں کی اشاعت کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد ایسی تنقیدی کتابوں کی اشاعت میں بھی حوصلہ افزا اضافہ ہوا جن میں سلام نگاری کی مختلف خصوصیات، خدوخال اور محاسن کو مد نظر رکھتے ہوئے سلام نگار شعراء کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح سلام نگاری کی ترقی اور اشاعت میں اضافہ کا سبب عوام کی اندھی تقلید نہیں بلکہ ہوش و خرد اور عقل و شعور کی صلاحیتوں کو بہت دخل ہے۔ عوام میں عینیت کے ساتھ ساتھ حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

عقل و شعور کی بدولت عوامی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلی سلام نگاری کی روایت کی ترقی کے لئے بہت سازگار اور اہمیت کی حامل ہے۔ عوام نے عصری تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فکری اور شعوری سطح پر جس رد عمل کا اظہار کیا ہے اس کے پیش نظر یہ قیاس مہمل نہیں ہے کہ پاکستان میں سلام نگاری کو اس قدر عروج حاصل ہوگا کہ ماضی کی تمام روایات ماند پڑ جائیں گی۔ سلام نگاری میں اضافے اور ارتقاء کا اندازہ ۱۹۴۷ء سے دور حاضر تک ہونے والی سلام نگاری کی روایت کی پیش رفت سے بخوبی لگایا جا

سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جن حضرات نے سلام نگاری کی روایت کو دوام بخشا ہے ان میں تمام سلام نگار شعراء کے علاوہ سلاموں کی تدوین و اشاعت، تصنیف و طباعت، محافل مسالہ کے انعقاد و انصرام اور دیگر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنے والے حضرات قابل ذکر ہیں۔ ان میں جناب شاہد نقوی، جناب ڈاکٹر یاور عباس، جناب قیصر بارہوی، جناب وحید الحسن ہاشمی کی خدمات لائق تحسین و آفرین ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں جناب طالب جوہری کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں سلام نگاری کے روشن مستقبل کا اندازہ جناب سید ہاشم رضا کی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ مملکت خدا دا پاکستان کا فیض ہے کہ کراچی، حیدر آباد، سکھر، بہاولپور، ملتان، لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میں ہر مکتب فکر کے شعراء کرام ہر سال نئے نئے مرثیے اور سلام کہتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہتے جاتے ہیں۔“

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں

بڑھا دیتے ہیں کلڑا سرفروشی کے فسانے میں.....“

قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری کے مختلف حوالوں میں امید افزا ترقی و ترویج کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں جدید رنگ و روایت کی بدولت مستقبل قریب میں سلام نگاری کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہونے والا ہے۔

حواشی

(اردو مرثیہ قیام پاکستان کے بعد)

- (۱) احراز نقوی، ڈاکٹر ”جدید فن مرثیہ نگاری“ مرتبہ: وحید الحسن ہاشمی، لاہور: مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۲
- (۲) محمد رضا کاکلمی ”جدید اردو مرثیہ“ کراچی: مکتبہ ادب، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳
- (۳) شجاعت علی سندیلوی، تعارف مرثیہ، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۷۰
- (۴) اسد ارباب، ڈاکٹر ”اردو مرثیہ کی سرگزشت“ لاہور: کاروان ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۸۹
- (۵) حامد حسن قادری، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۰
- (۶) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر ”اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۹
- (۷) شجاعت علی سندیلوی، تعارف مرثیہ، الہ آباد: ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۸۶

- (۸) ضمیر اختر نقوی (مرتب) جوش کے مرہے، کراچی: ادارہ فیض ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲
- (۹) نواز حسین زیدی، سید، ختم آفندی۔ فکرون لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۸۱
- (۱۰) شبیہ الحسن، سید ڈاکٹر ”باقیات آل رضا“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۳
- (۱۱) ضمیر اختر نقوی ”جوش طبع آبادی کے مرہے“، کراچی: ادارہ فیض ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۵
- (۱۲) وحید الحسن ہاشمی ”چراغ صحرا“ لاہور: حلقہ مصطلین پاکستان، ۱۹۸۳ء، ص ۲۱
- (۱۳) اس باب میں مختلف شعرا کے سلاموں کے انتخاب کے لیے درج ذیل کتب سے مدد لی گئی:
- (i) عبدالرؤف عروج، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال، کراچی: شارق پبلی کیشنز، س۔ن
- (ii) آغا قمر حسین (مرتب)، لہولہو کہکشاں (جلد ایک سے تین)، کراچی: ادارہ نقد لیس قلم، ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۳ء
- (iii) علی رضوی سید (مرتب)، حسین پر سلام، کراچی: میراثیں اکیڈمی، ۱۹۸۶ء
- (iv) وحید الحسن ہاشمی (مرتب)، سلام وفا، لاہور: ۱۹۶۹ء
- (v) اسرار زیدی (مرتب)، کر بلا کر بلا حسین حسین، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
- (vi) علی حسین جاوید (مرتب)، روشنی کا مستقر، ملیسی: زر تاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
- (vii) طاہر ناصر علی (مرتب)، تشنہ لبی، لاہور: علی پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (viii) ماہنامہ ”شام و سحر“ لاہور، مفت روزہ رضا کار، لاہور، پندرہ روزہ ذوالفقار پشاور، ماہنامہ پیام عمل لاہور کے دس برس کے شمارے
- (۱۴) شاہد نقوی، سید ”عزاداری“ لاہور: اظہار سنز، ۱۰۰۲ء، ص ۳۵۰
- (۱۵) وحید الحسن ہاشمی ”سلام وفا“ لاہور: ۱۹۶۹ء، ص ۱۰
- (۱۶) وحید الحسن ہاشمی، سید (مرتب)، سلام وفا، لاہور: شیخ محمد تقی جاوید، ۱۹۶۹ء، ص ۷۲
- (۱۷) ایضاً، ص ۲۲
- (۱۸) ایضاً، ص ۲۳
- (۱۹) اسیر فیض آبادی، سلام، مطبوعہ: لہولہو کہکشاں (مرتبہ آغا قمر حسین)، کراچی: نقد لیس قلم، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲
- (۲۰) اسیر فیض آبادی، سلام، سجاد خامہ، کراچی، فیڈرل بی ایریا، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۶
- (۲۱) ایضاً، ص ۱۷۷
- (۲۲) ایضاً، ص ۱۱۵
- (۲۳) وحید الحسن ہاشمی، حالات مصنف، آیات مقتل (امانت بخاری) لاہور، حلقہ شعرائے اہل بیت، ۱۹۷۶ء، ص ۷۸-۷
- (۲۴) مرتضیٰ حسین فاضل، پیش لفظ، آیات مقتل، ص ۹

- (۲۵) ایضاً، ص ۵۷
- (۲۶) ایضاً، ص ۵۶
- (۲۷) ایضاً، ص ۴۷
- (۲۸) جوش ملیح آبادی، سلام، مطبوعہ پیام عمل لاہور، جولائی۔ اگست ۱۹۸۷ء، ص ۱۴
- (۲۹) جوش ملیح آبادی، سلام: آیات و نعمات، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۳
- (۳۰) جوش ملیح آبادی، سلام، مطبوعہ حسین پر سلام، ص ۱۹۹-۱۹۸
- (۳۱) نسیم امروہوی، مرثیہ جوش، کراچی، لشکر ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲
- (۳۲) شبیر الحسن سید، ڈاکٹر، کوائف، ڈاکٹر حسن رضوی، ایک جائزہ، مطبوعہ عقیدتیں (حسن رضوی)، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۷
- (۳۳) حسن رضوی، عقیدتیں، ص ۶۰-۵۹
- (۳۴) حسن رضوی، عقیدتیں، ص ۷۱-۷۲
- (۳۵) وحید الحسن ہاشمی، سید، حسن رضوی کی مدیہ شاعری، مشمولہ عقیدتیں (حسن رضوی)، ص ۱۳
- (۳۶) ذابرخ پوری، سلام و کلام، لاہور، کاروان ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۶۳
- (۳۷) ایضاً، ص ۶۴
- (۳۸) ایضاً، ص ۶۲
- (۳۹) ساحر فیض آبادی، کبجے سے کر بلا تک، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۲ء، ص ۹۴
- (۴۰) ایضاً، ص ۱۲۳
- (۴۱) ایضاً، ص ۱۱۵
- (۴۲) ایضاً، ص ۹۳
- (۴۳) ایضاً، ص ۱۲۹
- (۴۴) ایضاً، ص ۱۱۴
- (۴۵) ایضاً، ص ۱۱۹
- (۴۶) ایضاً، ص ۱۱۶
- (۴۷) ساحر فیض آبادی، سلام، حراسے حرم تک، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸۴
- (۴۸) ایضاً، ص ۱۹۰
- (۴۹) ایضاً، ص ۱۸۹
- (۵۰) عارف ثاقب، ڈاکٹر، سجاد باقر رضوی کی ادبی خدمات، لاہور، غالب نمائندہ، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲

- (۵۱) سجاد باقر رضوی، سید ڈاکٹر 'سلام' مطبوعہ شام و سحر لاہور جون ۱۹۹۵ء، ص ۵۳
- (۵۲) سجاد باقر رضوی، 'سلام' مطبوعہ سجاد باقر رضوی کی ادبی خدمات
- (۵۳) (عارف ثاقب) ص ۵۳۶
- (۵۴) ایضاً ص ۵۳۶
- (۵۵) نواز حسن زیدی، 'سید' سیف زلفی کی سلام نگاری، جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی (مرتبہ: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن لاہور الحسن پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۲۲۸)
- (۵۶) سیف زلفی، سلام مطبوعہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (مرتبہ: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن) ص ۳۷۳
- (۵۷) ایضاً ص ۳۷۲
- (۵۸) شاداں دہلوی (تعارف) 'مناقب قربی': کراچی سید اینڈ سید ۱۹۹۳ء، ص ۱
- (۵۹) شاداں دہلوی، سلام، مناقب قربی، ص ۱۱۰
- (۶۰) ایضاً ۱۱۲-۱۱۱
- (۶۱) ایضاً ص ۱۱۳
- (۶۲) طاہر حسین کالمی، ڈاکٹر "اردو مرثیہ انیس کے بعد" دہلی جامعہ مگر ۱۹۹۷ء، ص ۳۶۲
- (۶۳) آغا قمر حسین (مرتبہ) "ہولہو کہکشاں" کراچی ادارہ تقدیس قلم ۱۹۸۹ء
- (۶۴) شاہد نقوی، کرب جاوداں، کراچی پاکستان انٹرنیشنل آرگنائزیشن
- (۶۵) ایضاً ص ۳۶
- (۶۶) ایضاً ص ۳۶
- (۶۷) ایضاً ص ۳۸
- (۶۸) ایضاً ص ۱۵
- (۶۹) ایضاً ص ۱۶
- (۷۰) ایضاً ص ۲۵
- (۷۱) ایضاً ص ۲۰
- (۷۲) ایضاً ص ۲۵
- (۷۳) ایضاً ص ۲۲
- (۷۴) ایضاً ص ۲۲
- (۷۵) ایضاً ص ۲۳

- (۷۶) ایضاً، ص ۳۸
- (۷۷) طالب جوہری دیباچہ کرب جاوداں (شاہ نقوی) ص نمبر ۸
- (۷۸) شہزاد احمد، سلام مطبوعہ بیاض (سلام نمبر) لاہور۔ مارچ۔ جون ۲۰۰۳ ص ۱۵۶۔
- (۷۹) ایضاً، ص ۱۵۷
- (۸۰) طاہر حسین کاکلی، ڈاکٹر، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، ص ۲۵۳
- (۸۱) صفدر حسین، ڈاکٹر، سلام، ”پہ فرات“ لاہور بارگاہ ادب، ۱۹۷۶، ص ۳۲
- (۸۲) ایضاً، ص ۵۰
- (۸۳) ایضاً، ص ۳۲
- (۸۴) طاہر ناصر علی، سلام، مطبوعہ تشہ لہی، لاہور، علی پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۵۰
- (۸۵) طاہر حسین، ڈاکٹر، ”اردو مرثیہ پر انیس کے بعد، ص ۹۴۴
- (۸۶) قیصر بارہوی، مقدمہ، ظہور فکر (ظہور چارچوی) لاہور نامی پریس، ۱۹۷۶ء، ص ۸
- (۸۷) ظہور چارچوی، کل گئے ہیں حسین، نور اول و حسن و حسین، لاہور رضا سنز، ۱۹۹۸، ص ۱۶۰
- (۸۸) عاصی کرمانی، ڈاکٹر، ”سلام“، امام حسین، خاصان خدا، کربلا میں کراچی: آل شفق پرنٹرز، ۲۰۰۰، ص ۱۵۲-۱۵۱
- (۸۹) ایضاً، ص ۱۳۹
- (۹۰) ایضاً، ص ۱۵۳
- (۹۱) ایضاً، ص ۷۸
- (۹۲) ایضاً، ص ۷۲
- (۹۳) ایضاً، ص ۷۱
- (۹۴) ایضاً، ص ۷۰
- (۹۵) قمر جلالوی، غم جاوداں، کراچی شیخ شوکت علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲، ص ۴۰
- (۹۶) ایضاً، ص ۴۷
- (۹۷) ایضاً، صفحہ نمبر ۵۳
- (۹۸) ایضاً، ص ۵۵
- (۹۹) ایضاً، ص ۳۹
- (۱۰۰) ایضاً، ص ۴۰
- (۱۰۱) ایضاً، ص ۵۶

- (۱۰۲) ضمیر اختر نقوی 'اردو مرثیہ پاکستان میں پاکستان میں' ص ۲۷۸
- (۱۰۳) قیصر بارہوی 'سلام' مطبوعہ ماہنامہ پیام عمل لاہور اگست ۱۹۹۲ء ص ۹
- (۱۰۴) ایضاً 'پیام عمل جون ۱۹۹۲ء' ص ۱۲
- (۱۰۵) ایضاً 'ص ۱۲
- (۱۰۶) احسان اللہ ثاقب (مرتب) کرامت بخاری فن اور شخصیت لاہور ارفع پبلشرز '۲۰۰۰ء' ص ۶۰
- (۱۰۷) کرامت بخاری 'سلام' مطبوعہ کرامت بخاری فن اور شخصیت (مرتبہ احسان اللہ ثاقب) '۲۰۰۰ء' ص ۱۰
- (۱۰۸) سجاد باقر رضوی 'ڈاکٹر (تبصرہ)' سر مقتل (کوثر پانی پتی) لاہور افتخار بک ڈپو ۱۹۸۹ء ص ۱۵
- (۱۰۹) کوثر عابدی پانی پتی 'سر مقتل' لاہور افتخار بک ڈپو ۱۹۸۹ء ص ۵۶
- (۱۱۰) ایضاً 'ص ۵۷
- (۱۱۱) ایضاً 'ص ۵۷
- (۱۱۲) خاکی مسعود رضا 'کیف غم' لاہور: حلقہ شعرائے اہل بیت '۱۹۷۳ء' ص ۳۰
- (۱۱۳) ایضاً 'ص ۲۶
- (۱۱۴) ایضاً 'ص ۳۶
- (۱۱۵) ایضاً 'ص ۲۱
- (۱۱۶) ایضاً 'ص ۳۳
- (۱۱۷) ایضاً 'ص ۳۳
- (۱۱۸) ایضاً 'ص ۵۴
- (۱۱۹) ایضاً 'ص ۴۴
- (۱۲۰) یاد مشکور حسین 'مفہوم زمانہ' ملتان شاہراہ ادب '۱۹۷۳ء' ص ۵۵
- (۱۲۱) ایضاً 'ص ۲۵
- (۱۲۲) ایضاً 'ص ۲۸
- (۱۲۳) یاد مشکور حسین 'تشنہ لبی' (مرتبہ طاہر ناصر علی) لاہور علی پبلی کیشنز '۲۰۰۰ء' ص ۴۲
- (۱۲۴) ایضاً 'ص ۴۳
- (۱۲۵) حسن رضوی 'ڈاکٹر "وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر" ناصر کاظمی (فن اور شخصیت) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز '۱۹۹۶ء' ص ۲۹
- (۱۲۶) ناصر کاظمی 'سلام' مطبوعہ حسین پر سلام (مرتبہ سید علی رضوی) '۲۳۹
- (۱۲۷) نزہت حسین 'سلام' باقیات نزہت لاہور '۱۹۹۲ء' ص ۵۸

- (۱۲۸) ایضاً، ص ۵۹
- (۱۲۹) نسیم امر وہوی، چشمہ غم، کراچی: محفوظ بک انجینی، س۔ن، ص ۱۷۰
- (۱۳۰) نسیم امر وہوی، سلام، مطبوعہ پیام عمل محرم نمبر جنوری۔ فروری ۱۹۷۴، ص ۱۰
- (۱۳۱) نسیم امر وہوی، چشمہ غم، ص ۱۹۲
- (۱۳۲) نسیم امر وہوی، سلام، مطبوعہ بجھی وہ شمع، مرتبہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷، ص ۷۲
- (۱۳۳) عباس رضا، پروفیسر ”سید وحید الحسن ہاشمی۔ ایک نظر میں“، وحید عصر، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۱۳
- (۱۳۴) وحید الحسن ہاشمی، میں کون ہوں اے ہم نفساں، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۱۳، وحید عصر (مرتبہ: عباس رضا)، ص ۵۵
- (۱۳۵) وحید الحسن ہاشمی، چراغ صحرا، لاہور: حلقہ مصنفین پاکستان، ۱۹۸۳
- (۱۳۶) وحید الحسن ہاشمی، تشنہ لب ہے حسین، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹
- (۱۳۷) وحید قریشی۔ ڈاکٹر، رائے، قلیپ، تشنہ لب ہے حسین“ (سید وحید الحسن ہاشمی)
- (۱۳۸) وحید الحسن ہاشمی، سلام، چراغ صحرا، ص ۲۰
- (۱۳۹) ایضاً، ص ۲۱
- (۱۴۰) ایضاً، ص ۳۲
- (۱۴۱) وحید الحسن ہاشمی، سلام، تشنہ لب ہے حسین، ص ۸۵
- (۱۴۲) ایضاً، ص ۸۱
- (۱۴۳) ایضاً، ص ۷۶
- (۱۴۴) وحی الحسن نقاش، سلام، کوئی صحرا میں بنائے قتل، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۱۰۹
- (۱۴۵) ایضاً، ص ۱۱۱
- (۱۴۶) ایضاً، ص ۱۱۳
- (۱۴۷) ہوش عابدی، علی کل غالب، لاہور، ۱۹۹۹، ص ۱۴۳
- (۱۴۸) ایضاً، ص ۲۷۱
- (۱۴۹) ایضاً، ص ۸۱
- (۱۵۰) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۰، ص ۷۸

باب چہارم

اُردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ

اردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ

تاریخی، فکری، جمالیاتی اور فنی محاکمہ

گذشتہ ابواب میں ہم نے اردو شاعری کی تقریباً چار صدیوں کو محیط روایت کے تناظر میں سلام نگاری کی ابتداء اور عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورتحال کے ساتھ ساتھ اس کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزے کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو شاعری میں سلام نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ اگرچہ ابتداء میں اس کی ہیئت کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا تاہم اس کی فکری اساس مختلف صورتوں میں اپنی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ انیسویں صدی کے لکھنؤی شعراء تک آتے آتے سلام نگاری مختلف شعری سانچوں میں اخلاقی و تہذیبی اور فکری موضوعات کو پروان چڑھاتی رہی تاہم یہ شعری سانچے اور ہیئتیں اپنی تنگی داماں کے سبب سلام نگاری کے مخصوص موضوعات کے آفاق کو وسعت دینے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کر بلا کو بطور واقعہ کے بیان کرنا اور محض اس کی تفصیلات کا ذکر ”سلام“ کا مقصد نہیں تھا بلکہ اس صنف کا مطلب نظر کر بلا کی معنویت قائم کرنا اور اس کی فکری بنیادوں کو استوار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے موزوں ترین ہیئت غزل کی ہی قرار پائی۔ اس اعتبار سے لکھنؤ کے سلام گو شعراء میر ضمیر، دلگیر اور فصیح وغیرہ کا یہ اجتہاد سلام نگاری کی صنف کو ایک مضبوط اساس فراہم کر گیا جنہوں نے اسے غزل کی ہیئت میں رواج دیا اور یوں اس کے معنوی اور فکری آفاق کو وسیع تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ غزل کی ہیئت اختیار کر کے ”سلام“ نے نہ صرف غزل کے مخصوص رموز و علامت اور اس کے استعاراتی انداز کو اپنایا بلکہ غزل کی رومانی اور فکری جہتوں کو اپنے اندر سمو کر بدلتے ہوئے حالات میں ہر عہد کے طرز احساس کے ساتھ ایک گہرا معنوی ربط بھی قائم کیا۔ بقول گوپی چند نارنگ:

”رہائی ادب کی اہمیت اور معنویت مسلم ہے لیکن..... شہادت حسین کا تاریخی حوالہ دہی رہائی

ادب سے ہٹ کر ایک نئے اظہاری اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے جو اپنی جگہ ہے

حد اہمیت و معنویت کا حامل ہے..... رہائی ادب میں دوسری جہات بھی کارفرما ہو سکتی ہیں لیکن

وہاں بنیادی محرک اہل بیت کے مصائب کا بیان ہے جبکہ عام شاعری میں بنیادی محرک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عام شاعری میں بنیادی حوالہ آتا تو ہے۔ مذہبی تاریخی روایت بھی ہے لیکن اس میں نہ درتہ استعاراتی اور علامتی توسیع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس میں ایک عالم گیر آفاقی معنویت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اطلاق تمام انسانی برادری کی عمومی صورتحال پر اور موجودہ عہد میں جبر و تعدی اور استبداد و استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے یا حق و صداقت کے لئے ستیزہ کار ہونے کی خصوصی صورت حال پر بھی ہو سکتا ہے۔“ (۱)

درج بالا رائے کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ رکی رٹائی ادب (جس میں اردو مرثیے کی مستحکم روایت بھی شامل ہے) مصائب اہل بیت کے بیان اور عقیدت و احترام سے لبریز درد و غم کے جذبات کے اظہار کا وسیلہ رہا ہے۔ تاہم اس کے ذریعے عصری تقاضوں کی معنویت اور گہرے فکری عوامل کی پیش کش اس سطح پر ممکن نہیں جس میں کر بلا تمام بنی نوع انسان کے دکھوں اور غموں کی مشترکہ علامت بن کر نمایاں ہو اور شاعر اپنے تخیل میں آزاد ہو کر اس کی ہمہ گیریت کا ارداک کر سکے اور اسے ایک عالمگیر سچائی اور صداقت کے طور پر اپنے دائرہ خیال میں شامل کر سکے چنانچہ اس صورت حال کو وسیع تر تناظر میں پیش کرنے کے لئے اردو غزل نے اپنا دامن کشادہ کیا اور نہ صرف کر بلا اور اس کے محترم اور برگزیدہ کرداروں کے حوالے سے کر بلا کو ایک موضوع کے طور پر اختیار کیا اور اسے ایک نئے تخلیقی رجحان کے طور پر قبول کیا بلکہ اس مقصد کے لئے اپنی ہیئت بھی وقف کر دی جس میں سلام نگاری کے نام پر شعراء کرام نے مضامین نو کے انبار لگا دیئے۔

سلام نگاری کے لئے غزل کی ہیئت اس اعتبار سے بھی موزوں ترین قرار پاتی ہے کہ اردو غزل اپنی صدیوں پرانی روایت میں کر بلا اور اہل کر بلا سے بہت مانوس رہی ہے اور واقعہ کر بلا کے تاریخی حوالے کو کہیں استعاراتی انداز میں اور کہیں واضح طور اپنے دامن میں جگہ دیتی رہی ہے اور اپنی رمزیہ اور ایمائی کرشمہ سازی سے اس موضوع کی داخلی جہتوں تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنے عہد کے طرز احساس سے ہم آہنگ کرتی رہی ہے چنانچہ اردو غزل کی ساڑھے تین سو سالہ روایت کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس صنفِ سخن نے اپنی عشقیہ اور رومانی فضا کے باوجود جس گہرائی میں جا کر کر بلا کی معنوی اور فکری جہتیں آشکار کی ہیں وہ شاید کسی دوسری صنفِ سخن میں سامنے نہیں آسکیں۔ اس سلسلے میں سید ضمیر اختر نقوی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے غزل کے مخصوص مزاج کو کر بلا کے موضوع سے ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”غزل کی بنا عشق و محبت پر ہے اور عشق میں غم زیادہ خوشی کم ہوتی ہے۔ عشق و محبت کا مال اور خاتمہ غم ہے تو پھر غزل میں غم و رنج کی کمی کیوں رہتی اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ دل کو مسرت سے زیادہ غم کے مضامین میں مزا ملتا ہے۔ واقعہ کر بلا داستانِ عشق بھی ہے اور داستانِ غم بھی، امام حسینؑ عشقِ الہی کے میدان میں قربانی پیش کر رہے تھے۔ عشقِ الہی کی مکمل داستان سے غزل کیسے متاثر نہ ہوتی جبکہ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہی رہا ہے۔“ (۲)

غزل انسانی زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان ہے۔ ظاہر ہے زندگی کی یہ حقیقتیں درد و غم، دکھوں اور مصائب ہی سے ترتیب پاتی ہیں۔ واقعہ گربلا میں بھی زندگی کے یہی حقائق عکس ریز ہیں۔ اس حوالے سے غزل اور کربلا میں ایک فطری مماثلت نظر آتی ہے چنانچہ اردو غزل میں جہاں بھی کربلا کا لفظ آیا ہے وہ اسی مفہوم اور معنوں میں استعمال ہوا ہے اور خالص رثائی ادب کے مقابلے میں زیادہ ہمہ گیریت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں میر تقی میر کی ایک پوری غزل کربلا کے حوالے سے اپنے عہد کی صورتحال کو واضح کرتی ہے:

آہ اور اشک ہی سدا ہے یاں روز برسات کی ہوا ہے یاں
کیسے کیسے مکان ہیں سترے اک اذراں جملہ کربلا ہے یاں
اک سکتا ہے ایک مرتا ہے ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یاں
صد تمنا شہید ہیں یک جا سینہ کو بی ہے تعزیا ہے یاں
خانہ عاشقاں ہے جائے خوب
جانے رونے کی جا بجا ہے یاں

اس پس منظر میں غزلیہ اشعار کی چند اور مثالیں دیکھئے:

لکھوں جس میں کوئی مضمون ظلم چرخ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں (ذوق)

جتنا وہاں بہا تھا خون جذب اس آئینے میں ہے
اپنے ہی دل پر کر نظر مقتل کربلا نہ دیکھ (آرزو لکھنوی)

ترے کوچے میں لاکھوں بے گنہ مارے گئے ظالم
جسے سمجھے تھے کعبہ کربلا کی وہ زمیں نکلی (رند لکھنوی)

لاکھوں ہی بے کس اس میں تڑپے ہیں خاک و خون میں
کوچہ ہے ترا ظالم یا دھت کربلا ہے (حسرت دہلوی)

جہاں بچے شہیدان وفا کہ خون کی بو آئی
قدم جس جس جگہ رکھے زمین کربلا پائی (شاد عظیم آبادی)

دل ستم زدہ بھی کربلا کا مقتل ہے
کبھی بلاؤں سے خالی یہ سرزمین نہ رہی (اثر لکھنوی)

وطن کو چھوڑ کر جس سرزمین سے دل لگایا تھا
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر (یاس یگانہ)

جدید شعراء کی غزل میں بھی کربلا کا حوالہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے ان شعری رویوں کا پتہ دیتا ہے جو اس
موضوع کی نسبت سے اپنے عہد کے آشوب کا منظر نامہ دکھاتے ہیں۔

بس اک حسین * کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی (خلیل الرحمن اعظمی)

کیوں ہے ہر ذرہ کربلا منظر
ہے ہمیں اُن پہ اعتبار بہت (حامدی کاشمیری)

دل ہے پیاسا حسین کے مانند
یہ بدن کربلا کا میدان ہے (محمد علوی)

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان جائے
خواہ اس کرب و بلا کے معرے میں جان جائے (مظفر حنفی)

اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن
اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا (عبداللہ علیم)

آباد پھر اک کرب و بلا ہو کے رہے گی
یہ رسم بہر حال ادا ہو کے رہے گی (شہرت بخاری)

ان اشعار کی روشنی میں کربلا کا استعارہ اپنی وسیع تر معنویت میں آلامِ زمانہ کی تمام صورتوں کو محیط ہے اور اپنے اپنے عہد کے آشوب میں اس سانچہ عظیم سے فکری توانائی حاصل کرتا ہے جو ریزار کربلا پر ہی نہیں گزرا، بلکہ عہد بہ عہد آنکھ کھولنے والے ہر انسان کے دل پر گزرا ہے۔ ہماری غزل نے اس غم کو ایک لازوال غم کا درجہ دے کر کربلا کو ایک مستقل کرب کی صورت میں قبول کیا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

”جدید اردو شاعری میں کردار حسینؑ واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات ایک مسلسل موضوع کی حیثیت سے موجودہ شعری رویوں کا حصہ بن کر جاری و ساری ہیں۔ ایسا غزل میں ہو رہا ہے اور نظم میں بھی۔ اس موضوع کی اتنی کیفیتیں، اتنی شکلیں اور اتنے ابعاد ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اظہار براہِ راست بھی ہو رہا ہے اور خالص استعاراتی حیرائے میں بھی۔ کسی تاریخی حوالے کے تخلیقی یا شعری استعمال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی مدد سے معنیات کی ایسی دنیا میں وجود میں آتی ہیں جن کا الفاظ کے لغوی اور ظاہری معانی سے علاقہ رکھنے والی معنیات میں قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ (۳)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کا شاعر کسی عہد کا اور کسی زمانے کا ہو، واقعہ کربلا کی ایمائیت، اشاریت یا اصطلاحات لفظی سے بچ کر نہیں نکل سکا۔ اردو شاعری پر واقعہ کربلا کے اثرات اس حد تک غالب آئے کہ زبان کے لسانی پیرہن پر بھی اس کے نقش کندہ ہو گئے۔ یہ نقوش اس قدر عمدگی سے زبان کے قالب میں بٹھائے گئے کہ ان کی باریک در باریک جہیں انسان کی جودت فکر کے لئے مہمیز بنتیں اور کشادگی فکر و نظر کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔

غزل سے سلام نگاری تک

اردو غزل نے کربلائی فکر کا آموختہ سلام نگاری کے حوالے کیا تو گویا اپنا جگر نکال کر اُسے سوئپ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سلام نگاری کو ایک قابلِ لحاظ صنف کا مقام حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے دروں میں غزل کا توانا لہجہ اور اس کی فنی اور تخلیقی قوت موجود تھی۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ”سلام“ کو اس کے مخصوص مفہوم و معانی سے آگے بڑھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بعض نقاد مجالسِ امام حسینؑ میں پڑھے جانے والے سلاموں تک محدود ہو کر سلام نگاری کے وسیع تناظر اور الاحد و امکانات سے صرف نظر کرتے جاتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مجالسِ سلام کی تفہیم و تذکیر کا ایک ذریعہ ہیں لیکن ان

کی نوعیت سراسر جذباتی اور محسوساتی ہے۔ درد کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے اور بحر جذبات میں تموج پیدا کر کے احساس کے کناروں سے ٹکراتی اور کناروں پر ہی بچھ کر آسودہ خواب ہو جاتی ہے چنانچہ سلام کو اس وقتی تموج اور سیل جذبات سے باہر نکل کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ صفحات میں سلام کے فن اور تاریخی ارتقاء کے حوالے سے جو جائزہ پیش کیا گیا ہے اس میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ سلام مذہبی مزاج رکھنے کے باوجود رمزیہ پیرائے میں اس واردات کا بیان ہے جو کربلا کی نسبت سے کہیں شاعر کی ذاتی واردات اور کہیں اجتماعی طرز احساس کی آئینہ دار بن جاتا ہے اور یہی وہ صورتحال ہے جو کلاسیکی اور جدید غزل کے مزاج سے مطابق رکھتی ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

”اگر سلام کو زندہ رکھنا اور فن پارہ بنانا ہے تو اس کی ہیئت وہی رکھنا پڑے گی جو اس وقت غزل کے لئے مختص ہے۔ جذبہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو اگر اسے شعری جامہ پہنانا ہے تو اس کے لئے شعر میں شعریت، اشاریت اور ندرت پیدا کرنا ضروری ہے۔ سپاٹ شعر خواہ کسی صنف میں ہو دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ اس میں جب تک کوئی جاندار اور تڑپا دینے والی کیفیت نہ ہوگی آدمی مسحور نہیں ہو سکتا۔ یہ شے لطیف اور باریکی سر دست غزل میں موجود ہے۔ اس لئے سلام کا فارم غزل ہی کے فارم کی طرح مناسب و موزوں ہوگا۔“ (۴)

درج بالا اقتباس کی رو سے بات صرف غزل کی فارم یا ہیئت تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ شعریت، اشاریت اور ندرت کے حوالے سے غزل کی دیگر فنی اور معنوی خصوصیات سے استفادہ بھی سلام کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ وہ بے کیف اشعار کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گا اور وہ اثر انگیزی اور درد و غم کی کیفیت، جو موضوعی اعتبار سے سلام کا وصف ہے، ناپید ہو کر رہ جائے گی۔ اس پس منظر میں امداد امام اثر کا یہ کہنا کہ: ”سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر ان میں غزل کا رنگ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہئے۔“ (۵) کلاسیکی غزل کے خالص عشقیہ رنگ کے ذیل میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن جدید غزل کے تناظر میں اس پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہماری جدید اردو غزل بڑی حد تک کلاسیکی رنگ سے آزاد ہو چکی ہے خصوصاً اپنے موضوعات اور اسالیب کے حوالے سے قدیم تاریخ اور تہذیب کی بازیافت نے اسے ایک نیا اور منفرد منظر نامہ فراہم کر دیا ہے جس میں وہ جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی اور ظالم قوتوں کو لاکارتی نظر آتی ہے۔ گذشتہ صفحات میں غزلیہ اشعار سے دی گئی مثالوں سے یہ بات عیاں ہے کہ جدید غزل بجائے خود واقعہ کربلا سے ایک خاص نسبت کی بنا پر بے دھڑک ان تاریخی واقعات اور تلمیحات سے مالا مال ہے جو کہیں احتجاج کی لے میں اور کہیں آواز حق کی صورت اپنے معنوی نظام کو ترتیب دیتی ہے۔ اس سلسلے میں علی جواد زیدی کی درج ذیل رائے کو محل نظر رہنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”سلام کا خمیر جمالیاتی احساس توازن، خلوص، دردمندی اور اخلاق دوستی سے بنا تھا۔ غزل کے

عروضی سانچے اور عام معتقداتی فضا نے اس پر کچھ مزید پابندیاں لگا دی تھیں۔ رندی کی گنجائش نہ تھی لیکن وہ سرمستی ضرورت تھی جو معیار پسندی اور دردمندی عطا کرتی ہے۔ موتی بھی پروئے جاتے تھے لیکن اس طرح کہ صنائی کا عنصر غالب نہ آنے پائے اور فنکارانہ خلوص مجروح نہ ہو۔

مضمون آفرینی ہو لیکن نہ ایسی کہ سلام کی جمالیاتی فضا دھندلی پڑ جائے۔“ (۶)

چنانچہ یہ رائے قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ سلام غزل ہی کا عکس جمیل ہے جس کی بنیاد میں غزل کا جمالیاتی احساس توازن، خلوص، دردمندی اور اخلاق دوستی موجود ہے۔ اس میں وہ سرمستی بھی ہے جو معیار پسندی اور دردمندی عطا کرتی ہے۔ فنکارانہ ہنرمندی بھی ہے اور وہ مضمون آفرینی بھی جو اس کی جمالیاتی فضا کو حسن بخشی ہے۔

جہاں تک سلام کے موضوعات کا تعلق ہے تو ان کی اساس واقعہ کر بلا پر قائم ہے اور اس حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کے فضائل، ذکر مصائب شہیدان و اسیران کر بلا اور آئمہ کرام کی عظمت کا ذکر ہوتا ہے اور اس پس منظر میں اخلاقی، روحانی اور مذہبی مضامین پیش کئے جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو غزل کی طرح سلام کے موضوعات میں بھی تنوع موجود ہے۔ تاہم یہ تنوع فکری سطح پر شہادت عظمیٰ کے مختلف العباد اور کئی جہات کی شکل میں شاعر کے حیطہ خیال میں نمود پاتا ہے۔ واقعہ کر بلا کی معنویت اتنی گہری اور بے مثال ہے کہ اس سرچشمہ حیات سے سیراب ہو کر زندگی کی اخلاقیات ہمہ جہت پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے اور نسل انسانی کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ یہاں ایک لمحے کے لئے اس منظر نامے پر نگاہ ڈال لیجئے جہاں تاریخ انسانی کے عظیم الشان کردار ایک عالمگیر سچائی رقم کرنے کے لئے جمع ہیں۔ قافلہ حسین میں شامل افراد میں ہر فرد اپنے مقصد کی عظمت سے پوری طرح آگاہ اور شہادت کی قدر و قیمت کا ادراک رکھتا ہے اور راقی میں اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہے۔ یہ قافلہ سرزمین کر بلا میں سرفروشی کے عزم سے وارد ہوتا ہے۔ اہل قافلہ کے دل ہر قسم کے ڈر اور خوف سے پاک ہیں۔ رضائے الہی ان کی سوچوں کا محور اور حسینی مشن ان کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ ان سرفروشیوں میں ہر عمر کے افراد شامل ہیں۔ بچے، نوجوان اور بوڑھے اور خواتین سبھی لوگ موجود ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اس عظیم الشان قربانی میں شریک ہونے کو اپنا شرف سمجھتا ہے اور آخر دم تک کسی کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ پھر یہ قافلہ عام لوگوں کا نہیں، خانوادہ رسول کا قافلہ ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

”اس مقدس کنبے کے افراد اپنے خون کے ہر قطرے سے دعوت حق کی توثیق کرتے ہیں۔ وہ نو دس برس کے دو بھانجے عمون و محمد ہوں، تیرہ چودہ برس کا بھتیجا قاسم ہوا، اٹھارہ برس کا بیٹا علی اکبر ہو، بیس برس کا بھائی عباس یا دودھ پیتا بچہ علی اصغر ہو، سب ایک کے بعد ایک برچھیاں اور تیر کھاتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہی حسین ابن علی جو اسلام کی مقدس ترین ہستی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی اولاد فاطمہ زہرا سیدہ بتول کے جنے

تھے اور ان کے گودوں کھیلے اور لاڈوں پالے تھے اور خود نبی اکرمؐ ٹانا ہونے کے ناتے جن کے ناز اٹھاتے ہوں گے ان کے سامنے نہایت بے دردی سے ان کے بیٹوں، بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو قتل کیا گیا، بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ کیا کیا اذیتیں نہ دی گئیں اور پھر جب اسی گردن کو جس پر رسول اللہ کے بوسوں کے مقدس نشان ہوں گے انتہائی سفاکی اور بے رحمی سے تپتی ریت پر کاٹا گیا لاش کی بے حرمتی کی گئی اور اس کو گھوڑوں سے پامال کیا گیا تو آسمان بھی خون کے آنسو کیوں نہ رویا ہوگا اور زمین کا سینہ بھی کیوں نہ شق ہو گیا ہوگا۔“ (۷)

خانوادہ رسولؐ پر کر بلا میں جو گزری اس کی تمام تفصیل اور واقعات کی جزئیات تک تاریخ میں محفوظ ہیں۔ سلام نگار شعراء نے ان واقعات اور ان کی جزئیات سے لہو کشید کر کے اپنے اشعار کی جہیں پر سجایا اور ایک ایک واقعہ سے وہ تاریخی شہادتیں قلم بند کی ہیں جو فکری سطح پر متنوع معنوی مضمرات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ واقعاتی سطح پر اردو مرثیہ زیادہ تفصیل کے ساتھ صورتحال کو بیان کرتا ہے جبکہ سلام ان تفصیل کو ایک مٹھی میں سمیٹ لیتا ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے سلام نگاری کے حوالے سے اس صنف کی جو بنیادی خصوصیات گنوائی ہیں ان میں جہاں سلام نگاری کی بنیاد تخیل اور احساسات و جذبات پر رکھی ہے وہاں اس امر پر زور دیا ہے کہ سلام کے شعر میں شعریت کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا خمیر راستی اور ازلی وابدی صداقتوں سے اٹھایا گیا ہو چنانچہ سلام نگاری احساس بھی ہے اور صداقت بھی۔ اسی لئے اس میں نعرے بازی یا اپنے عقیدے کو زبردستی ٹھونسنے کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔ سلام نگار کو سلام کہنے کے لئے ان تجربات سے گزرنا ضروری ہے جہاں زمان و مکان کے تمام خدو خال اور تمام بشارتیں اس کی نظر کے سامنے ہوں۔ شاعر کو ہر صورت اور ہر حال میں منصب شاعری سے منسلک رہنا چاہئے۔ کر بلا کے واقعات اور مصائب کا ذکر اس انداز میں ہو کہ سلام کی فضا اور اس کا فن مجروح نہ ہو۔ اگرچہ مقصد کی اشاعت کا پہلو بھی پیش نظر رہنا چاہئے لیکن اس کا انداز ان خاموش لہروں کا سا ہونا چاہئے جو سطح آب کے نیچے حرکت پذیر ہوتی ہیں اور تلاطم یا اضطراب پیدا نہیں کرتیں۔

سلام کی دنیا اخلاقی صفات اور انسان کے تزکیہ نفس کی دنیا ہے۔ سلام نگار کا فرض ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہے اس میں خلوص کی چاشنی، راست گوئی کی مٹھاس اور صداقت کی شیرینی ہو۔ اگر اس میں ذرا بھی دروغ گوئی کا عنصر ہوگا تو اثر آفرینی کی لے معدوم ہو جائے گی۔ بقول سید وحید الحسن ہاشمی:

”خلوص ہی کے شجر سے حقیقت نگاری کی شاخیں نکلتی ہیں۔ حقیقت نگاری ایک خاص انداز فکر ہے جس کی بنیاد دینی تو انائی اور شدت جذبات پر ہے اگر یہ دونوں عناصر اعتدال پر ہوں تو شعر فوری طور پر اثر کرتا ہے اور معنی کی کٹی تہیں لے کر نمودار ہوتا ہے۔ ان تہوں کا اگر غیر متعصبانہ تجزیہ کیا جائے تو ان سے ذوق نظر اور جمالیاتی حس پر سکون، پر بہار اور پرمسرت ہوتی ہے۔

اخلاقی بلندی کے لئے مقصد کی بلندی لازمی ہے۔ اپنے مقاصد کو ارفع و اعلیٰ بنانے کے لئے واقعیت حقیقی سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔ سلام نگار کو وہی کچھ بیان کرنا چاہئے جو ہر واقعہ ہو۔ ادھر ادھر کی غیر حقیقی معلومات اور سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے سلام کی پاک فضا کو ناپاک اور غیر شائستہ نہیں بنانا چاہئے۔“ (۸)

اسی تناظر میں تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے بھی احتیاط لازم ہے۔ سلام کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ تاریخی واقعات کا انتخاب کیا جائے۔ تاریخ اور تخلیق دو الگ الگ راستوں کے مسافر ہیں۔ تاریخ کا اپنا مزاج ہے اور تخلیق کا اپنا۔ تاہم ان دونوں کو ایک مقام پر یک جا کر کے تخلیق کار کی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری پر منحصر ہے۔ اس طرح کہ نہ تاریخ پر حرف آئے اور نہ تخلیق ژولیدہ ہو۔

سلام کی ایک اہم خصوصیت اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو اس نے براہ راست غزل سے مستعار لی ہے۔ جس کی پوری عمارت رمزیت، ایمائیت اور اشاریت پر استوار ہے۔ جو اپنا ایک حسن اور نکھار رکھتی ہے۔ اصل چیز سلیقہ شعر ہے جس کی سلام نگاری میں قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔ غزل کی طرح سلام کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل اور اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول سید وحید الحسن ہاشمی:

”ایک شعر کے دو مصرعوں میں دونوں جہانوں کو یاد کر دینا بڑے مشتاق اور پختہ کار سلام نگار کا کام ہے۔ ایک شعر میں شاعر کی تمام فنی صلاحیتیں اور فنی کاوشیں بروئے کار لانا پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کے حقیقت کا حسن آشکار ہوتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس کی زمین سپاٹ اور ہموار نہیں۔ اس میں کچھ اونچے نیچے مقامات بھی آتے ہیں۔ سپاٹ شعر کہنے والے شعراء اس منزل سے گزر رہی نہیں سکتے۔ ایک شعر میں لطف کلام کو باقی رکھنا، انسانی تجربات کی عکاسی کرنا، حقائق سے روگردانی نہ کرنا اور شعر کے پاؤں میں تاثیر کی مہندی لگانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ رمزیت اور ایمائیت انسانی تخیل کے دریا کا وہ دھارا ہے جو دریا میں رہتے ہوئے اپنا الگ وجود رکھتا ہے۔ اگر سلام نگار اس فن سے آگاہی رکھتا ہے تو کامیابی اور کامرانی اس کے قدم چومنے کو تیار ہے۔“ (۹)

سلام نگاری کے سلسلے میں یہ بات اپنی جگہ بے حد اہم ہے اور جس کا ذکر درج بالا اقتباس میں بھی موجود ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل وحدت اور بہ لحاظ خیال و موضوع مکمل ہونا چاہئے۔ یہ خصوصیت بنیادی طور پر غزل سے منسوب ہے لیکن وحدت شعر کے حوالے سے غزل اور سلام یوں الگ ہو جاتے ہیں کہ غزل کے مختلف اشعار متحد المعنی اور تسلسل خیال کے حامل نہیں ہوتے۔

بقول شمیم احمد:

”ان میں سے کوئی شعر شاعر کی کسی داخلی واردات یا کیفیت کا عکاس ہو سکتا ہے تو کوئی حسن یا حسن محبوب کی تصویر اُتار سکتا ہے۔ کوئی شعر دنیا کی بے ثباتی کو پیش کر سکتا ہے تو کوئی فلسفہ و اخلاق کے کسی نکتے کو منظر ہو سکتا ہے۔ کسی شعر میں سیاسی صورتحال کا نقشہ پیش کیا جاسکتا ہے تو کسی میں زمانے کی زبوں حالی اور ستم شکاریوں کو بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ کوئی شعر مناظر فطرت کا مرقع بن سکتا ہے تو کوئی انسانوں کی سیرت و شخصیت اور کردار کے کسی پہلو کو نمایاں کر سکتا ہے۔ گویا پوری غزل ’معنی‘ خیال اور موضوع کے لحاظ سے بے مثل تنوع کی حامل ہو سکتی ہے۔“ (۱۰)

غزل کی اس منتشر الخیالی کو اس کی بہت بڑی قوت قرار دیا جاتا ہے اور اس کی صنفی شناخت کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ غزل کی یہ خصوصیت ایک ذرا فرق کے ساتھ سلام میں بھی موجود ہے کہ سلام کا ہر شعر بھی اپنی جگہ ایک وحدت میں ڈھلتا ہے لیکن سلام میں موضوعات کا تنوع غزل کے موضوعی تنوع سے مختلف انداز میں سامنے آتا ہے۔ سلام میں ہر شعر ایک مکمل اکائی تو بنتا ہے لیکن یہ اکائی شاعر کے خیال اور فکر کی ایک جہت کی صورت میں مکمل ہوتی ہے اور سلام کے تمام اشعار اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہونے کے ساتھ ساتھ خیال اور فکر کی سطح پر ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوتے ہیں جیسے مختلف رنگوں کے پھول ایک دھاگے میں پرو دیئے گئے ہوں۔ غزل کا ہر شعر ایک الگ موضوع کا حامل ہوتا ہے جبکہ سلام کا بنیادی موضوع ایک ہوتا ہے اور ہر شعر اس موضوع سے اپنا رنگ چُن کر اپنی تکمیل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سلام کے اشعار دیکھئے:

نظر سے شام غریباں کا وہ سماں نہ گیا
فراخ دشت سے پھر ایسا کارواں نہ گیا
جھلک اٹھا ہے کنارِ شفق سے تابہ اُفق
ابد کنار ہوا خونِ رائیگاں نہ گیا
وہ شب چراغ جو تیرے لہو سے روشن تھا
شعاعِ مہر ہوا تو کہاں کہاں نہ گیا
ہزار شکر کہ وہ ایک لمحہ اُمید
جہانِ جبر سے بے صوت بے اذّاں نہ گیا
ہوائیں تیز تھیں لیکن ہمارے ہاتھوں سے
وہ اک نشانِ وہ دامنِ خونچکاں نہ گیا (ثروت حسین)

درج بالا سلام کا ہر شعر ایک الگ اور جدا کیفیت کا مظہر ہے۔ پہلے شعر میں فراخ دشت میں لٹ کر شامِ غربیاں کا منظر پیش کرنے والے کارواں کا ذکر ہے۔ دوسرا شعر کربلا کی زمین پر بہنے والے خون کا تابہ اُفقِ شفق بن جانے کا منظر کرتا ہے۔ تیسرا شعر اسی خون کا شعاع مہربن کر تمام عالم پر چھا جانے کا منظر سامنے لاتا ہے۔ چوتھا شعر واقعہ کربلا کے جہان جبر پر نقش دوام ثبت کرنے کا اشارہ دیتا ہے اور آخری شعر مخالف حالات کے باوجود سانحہ کربلا کی یاد ہر دور میں زندہ رہنے کی سچائی کا مظہر ہے۔ شاعر نے ایک مضمون کو کئی رنگ سے باندھا ہے۔ موضوع ایک ہے لیکن اس سے وابستہ کیفیتیں ہر شعر میں جدا جدا اثرات رکھتی ہیں چنانچہ اپنے اس خاص وصف کی بنا پر سلام غزل سے الگ رہنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ نقادوں نے اگرچہ غزل میں بھی اشعار کو ایک اندرونی سلک سے منسلک کیا ہے۔ لیکن یہ ارتباط موضوعی سطح پر نہیں بلکہ شاعر کے داخلی جذبہ و احساس کی بنا پر عمل میں آتا ہے اور یہ مخصوص مزاج داخلیت سے عبارت ہے چنانچہ غزل کو اس کے باوجود کہ موضوع میں قید نہیں کیا جاسکتا اور حسن و عشق دنیا کی بے ثباتی، سماجی مسائل، غرض کہ ہر قسم کے خیالات مختلف اشعار میں بیان کئے جاسکتے ہیں لیکن ان سب کو ایک دوسرے سے مربوط و منسلک رکھنے کے لئے ایک خاص داخلی رنگ کی اور ایک مخصوص جذبہ و احساس کی ضرورت ناگزیر خیال کی جاتی ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب غزل گو شاعر زندگی کے تمام خارجی مظاہر کو اپنی ذات اور فکر کا جزو بنالے۔ انہیں واقعے کی طرح خود کو ان سے علیحدہ کر کے بیان نہ کرے بلکہ انہیں اپنی ہی ذات کی ایک واردات بنا کر پیش کرے۔

سلام نگاری کا ایک اہم اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہ فن اپنی تخلیق کے لئے عصری شعور کا رہین احسان ہے۔ سلام نگاری کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس کے ایک باقاعدہ صنف کے طور پر رواج پانے کا زمانہ وہی ہے جب ہندوستان ایک زبردست تاریخی آشوب کی لپیٹ میں تھا۔ فکری انتشار اور تذبذب انہدام نے ان روایات و اقدار پر گہری ضرب لگائی جو برصغیر کے گذشتہ ساڑھے سات سو سالہ دور میں مسلمانوں کا طرہ امتیاز رہی تھیں۔ ظلم و استبداد اور جبر و استحصال نے نت نئی شکلیں اختیار کر کے انسان اور انسانیت کو نابود کرنے کے لئے اپنے حربے آزمانے شروع کئے۔ دو مختلف تہذیبوں کے تصادم نے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور شائستہ انسانی رویوں کو دلیس نکالا دے دیا۔ بقول گوپی چند نارنگ:

”وہ طبقہ جو اقتدار پر قابض تھا طاقت و ہوس کے نشے میں ریاکاری و منافقت کا شکار تھا۔ اس کے مقابلے میں عوامی طبقہ تھا جو باطنی اقدار یعنی پاکیزگی نفس اور عشق و خیر و خدمتِ خلق کو اصل مذہب گردانتا تھا۔ ظاہر پرستی اور باطنیت کی آویزش پورے عہدِ وسطیٰ میں ملتی ہے۔ انیسویں صدی میں برصغیر کے نشاۃ الثانیہ اور عہدِ جدید میں داخل ہونے کے بعد بالخصوص سیاسی المیہ ۱۸۵۷ء کے بعد عہدِ وسطیٰ کا ظاہر داری اور باطنیت کی آویزش کا روحانی ساختہ ایک نئے سماجی ساختہ کو راہ دیتا ہے۔ اب اس میں حق و باطل یا خیر و شر کے معنی بدل جاتے ہیں چنانچہ غیر ملکی استحصالی قوتیں یا برطانوی سامراج اب باطل یا شر ہے اور اس کے خلاف ستیزہ کاری یا جدوجہد کرنا عین حق اور خیر ہے۔“ (۱۱)

اس صورتحال میں اُردو شاعری جبر اور استحصال کے خلاف ایک نئے طرز احساس کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں احتجاج کا علم بلند کرتا نظر آتا ہے۔ اس دور میں سلام نگاری واحد صنفِ سخن ہے جو حق اور باطل کے واضح فرق کو حسین اور یزید کے حوالے سے ایک غیر مبہل حقیقت کے طور پر نمایاں کرتی ہے اور ظالم اور مظلوم کے اعمال کے تذکرے سے آشوبِ زمانہ کی نوحہ گری کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ یزید کا استعارہ اپنے عہد کے یزیدوں کے جبر و تعدی کا ذکر کر کے منفی رویوں کی تصویر کشی کرتا ہے اور حسینؑ کا تذکرہ حق و انصاف اور صبر و رضا کے مراحل کا مشاہدہ کر کے شہادتِ گہرِ اُلفت میں عزمِ راسخ، شجاعت، عبودیت اور تشکر کے ساتھ قدم رکھنے کا درس دیتا ہے چنانچہ ان سلاموں میں معاشرے کی بڑی عہدگی کے ساتھ تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ انہی تصاویر میں ہم اپنے ماضی اور حال کی کیفیتوں کا اندازہ بھی کر لیتے ہیں اور اپنے مستقبل کے تحفظ کا لائحہ عمل بھی تیار کر لیتے ہیں۔ سلام نگاروں نے چودہ سو سال پہلے ریگزارِ کربلا میں نمودار ہونے والی عظیم الشان قوت سے توانائی حاصل کر کے اپنے دل کی بھی راکھ سے شعلہ پیدا کرنے کی کوشش کی اور جبر کی راہ میں مزاحم ہو کر شاعری کے ایسے نادر و نایاب نمونے پیش کئے جس نے ہمارے شعری ادب کو حیاتِ نو سے آشنا کر دیا۔

جو کربلا میں شاہِ شہیداں سے پھر گئے
کعبے سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے
دیں دار تھے جو لوگ وہ شہ پر ہوئے فدا
بے دین تھے جو وہ دینِ مسلمان سے پھر گئے (امیر مینائی)

ان کو مجرا تھے جو زیرِ آسماں بیٹھے ہوئے
بھوکے پیاسے بے وطن بے خانماں بیٹھے ہوئے
حج زیارت کر چکے اب کربلا کو بھی چلو
داغِ مدت ہو گئی تم کو یہاں بیٹھے ہوئے (داغ)

فنا کہتے ہیں کس کو موت سے پہلے ہی مر جانا
بقا ہے نام کس کا اپنی ہستی سے گزر جانا
یہاں کا زندہ رہنا موت سے بدتر سمجھتا ہوں
حیاتِ جاوداں ہے کربلا میں جا کے مر جانا (شاد عظیم آبادی)

کیا صفِ ماتم پہ بیٹھے ہو عزادارو اٹھو
درد سے دنیا کو بھر دو درد کے مارو اٹھو (نجم آفندی)

مسلمانوں نے دلہندہ نبیؐ کو یوں کیا گھائل
دلِ اسلام سے اب تک نہ برچھی کی الٹی نکلی (سید آلِ رضا)

اہل بیتؑ پاکؑ کی ہر سانس کو اے مدعی
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ (ظفر علی خان)

چنانچہ سلام گو شعراء نے جبرِ استحصال اور ظلم کے خلاف انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو آواز بلند کی وہ بعد کے ادوار میں اور زیادہ قوت اور تہ و تاب کے ساتھ بلند ہوئی اور ہر عہد کی آواز بن گئی۔ بعد کے سلام نگاروں نے کربلا کے استعارے کو ایک عالمگیر صداقت بنا کر اسے ہر نوع کے ظلم، جبر اور اہل ہوس کی چیرہ دستیوں کے خلاف استعمال کیا۔ ان شعراء کے سلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کربلا کی جنگ صرف سرزمینِ کربلا ہی سے مخصوص نہیں بلکہ یہ جنگ ہر عہد کے ظلم کے خلاف ہر مقام پر لڑی گئی اور یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ اس خطہٴ زمین پر جہاں جہاں ظلم اور جبر کی کوئی نہ کوئی شکل موجود ہے وہاں کربلا بھی ہے، یزید بھی ہے اور حسینؑ بھی موجود ہیں۔ یہ جنگ نہ صرف دست و بازو سے لڑی جا رہی ہے بلکہ انسانوں کے دلوں اور ذہنوں میں بھی یہ معرکہ پیا ہے:

کس کی آنکھیں ہیں کہ بجھ کر بھی ہیں مشعل مشعل
کس کا چہرہ ہے کہ کٹ کر بھی ہے رخشاں رخشاں
یہ شہادت ہے اس انسان کی کہ اب حشر تک
آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں (احمد ندیم قاسمی)

ترے لہو کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ ہے
ہوئی ہے عام شہادت کی آرزو تجھ سے
اُسی طرح ہے وہ تیرے پیام کا جادو
چلی ہے قرون کی مہکار کو بہ کو تجھ سے

کبھی نہ جبر کی قوت سے دَب سکا فارغ
ملی ہے ورشہ میں یہ سرکشی کی ٹُو تجھ سے (فارغ بخاری)

نئی نے شامِ غریباں کو نور بخشا ہے
چمکتی جاتی ہیں تاریکیاں زمانے کی
اُگی ہیں سولیاں باغِ حیات میں افضل
یہی تو رُت ہے اُنا پر بہار آنے کی (شیر افضل جعفری)

سلام ان پہ تر تَغ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو تو چاہے (مجید امجد)

خیمے کے دَر سے دُور بھی مقتل نہ تھا مگر
کتنے کٹھن سفر تھے وہاں تک نگاہ کے (جعفر شیرازی)

ہر عہد تیرا عہد ہے اے شاہِ کربلا
تو قدرِ مشترک ہے قدیم و جدید کی
ماتمِ سرائے دہر میں ایسے بھی لوگ ہیں
نامِ حسینؑ لب پہ ہے خو ہے یزید کی (اقبال ساجد)

وہ کہ دوشِ نبیؐ کی زینت تھے
اپنی اُمت ہی کے حصار میں تھے
شعر بن کر اُبل پڑے شہرت
اشک جو قلبِ بے قرار میں تھے (شہرت بخاری)

زمانہ آج بھی اس کو خراج دیتا ہے
کہ جس نے جبر کے آگے نہ سر جھکایا تھا (اسرار زیدی)

غم حسین کا مقصد بدل نہیں سکتا
خیام جل گئے پیغام جل نہیں سکتا (سید وحید الحسن ہاشمی)

ممکن ہے روزِ حشر خدا خود کرے سوال
آنسو کہاں کہاں پہ گرے ہیں بتوں کے (سید وحید الحسن ہاشمی)

سنے پہ اس لہو کی گرانی لئے ہوئے
ہے لفظ لفظ تازہ معانی لئے ہوئے
ہر ایک نسل تیرے لہو کی امین ہے
زندہ رہے گی تیری کہانی لئے ہوئے (غلام حسین ساجد)

کچھ اس لئے بھی ترے نام کے ہوئے دشمن
تو وہ سوال تھا جس کا کوئی جواب نہ تھا (سیط علی صبا)

تیر تو تیر ہے پیوست گلو ہونا تھا
کیا ضروری ہے کہ سب کچھ لب جو ہونا تھا (خالد احمد)

مجھے امام نے سمجھائے ایسے نکاتِ حیات
سوا کفر میں جینا حرام جاننا ہوں (حفیظ تائب)

نہ عہد شکنی نئی ساکنانِ کوفہ کی
نہ داستانِ شہیدانِ حق نما ہے نئی
دکھائی دیتی ہے راوی کے پانیوں میں فرات
یزیدِ وقت کوئی چال چل گیا ہے نئی (ستار سید)

درج بالا مثالوں کی روشنی میں گزشتہ ساٹھ ستر سال کے دوران میں کہے گئے سلاموں کی صورت حال سامنے آتی ہے۔ ان مثالوں سے سلام نگاری کے عروج اور ترقی کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے جو اس نے دیگر اصناف مثلاً غزل اور نظم کے پہلو بہ پہلو حاصل کی۔ ان میں جہاں میکائیت کا احساس نہیں ہوتا وہاں شعر ارسائی انداز بیان سے بھی کنارہ کش نظر آتے ہیں۔ جذبے کی تازگی، بے ساختگی اور اظہار میں خلوص کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ سلام کے انتہائے کمال کو پہنچ جانے کے باوجود اس میں نہ کوئی جمود نظر آتا ہے اور نہ زوال کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ موضوع کی تکرار اور یکسانیت سے شاعری اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے لیکن کر بلا اور کر بلا والوں کی داستانِ غم ایسی ہے جسے ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود خشکئی کی ہوائیں لگی اور یہ ہر دور میں تازہ اور ابر غم سے غم رہی ہے۔ بقول پروفیسر رضی عابدی:

”سلام کمال کو پہنچ جانے کے باوجود کمالات سے محروم نہیں۔ اس لئے کہ وہ جذبہ جو اسے زندہ

رکھتا ہے محض عقیدہ نہیں بلکہ عقیدت ہے۔ عقیدہ میکائیکی ہو سکتا ہے مگر عقیدت نہیں۔“ (۱۲)

سلام کے حوالے سے عقیدہ اور عقیدت کی بات آئی ہے تو اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی کی رائے بھی دیکھ لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”عقیدہ اور سلام آپس میں لازم و ملزوم ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ سلام کی بلند

و بالا عمارت کی پہلی اینٹ ہی عقیدت اور غیر متعصبانہ رویے پر رکھی گئی ہے۔ جب کوئی سلام

نگار اپنی عقیدت کی سیڑھی سے شریعت کے کشادہ بام پر آتا ہے تو اس کے قلب میں فیضان اور

دماغ میں آگہی کے چودہ چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ عشق خدا، عشق رسول اور عشق اہل بیت

سلام کی کائنات کے سورج، چاند اور ستارے ہیں اور جب مودت کے جذبات الفاظ کا جامہ

پہن کر سلام کی شکل میں آتے ہیں تو تاثیر کی کرنیں اپنی روشنی سے ہمارے عالم محسوسات و

وجدان کو منور کر دیتی ہیں۔ یہی روشنی شعر کی صورت اختیار کر کے قسط اس ادب پر جلوہ گر ہوتی

ہے۔ سلام کے ہر شاعر نے نہ صرف کر بلا والوں کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا ہے بلکہ اس نے

ہر اس انسان، ہر اس مقام، ہر اس دور اور ہر اس زمانے پر سلام بھیجا ہے جس نے حق کا ساتھ دیا۔

جس مقام پر حق کا معرکہ پیش آیا اور جس دور اور جس زمانے میں اہل حق کی اہل باطل کے

ساتھ آویزش ہوئی۔“ (۱۳)

سلام نگاری کے فنی اور جمالیاتی پہلو

سلام نگاری کی روایت کے تناظر میں اس کے جواز اور اسباب پر بحث اور موضوعی جہات کے تجزیے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ان خدو خال کی نشاندہی کی جائے جو بحیثیت ایک صنفِ سخن کے

اے حسن عطا کرتے اور اس کی اثر انگیزی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ سلام نگاری کے لئے زبان و بیان میں حسن آفرینی، تخیل کی بوقلمونی اور اسلوب بیان کی شگفتگی اور تازگی ایک قوت محرکہ کا حکم رکھتی ہے۔ الفاظ کی ندرت، تراکیب کی موزونیت اور لہجے کے بے ساختہ پن سے سلام کی دلآویزی اور اثر پذیری میں اضافہ ہوتا ہے چنانچہ جوفی عوامل سلام کی سحر انگیزی اور حسن کاری کو اجاگر کرتے ہیں اور اس کی لطافت، وسعت اور جامعیت کا ذریعہ بنتے ہیں ان میں ندرت، اظہار، محاکات، فصاحت، بلاغت، سوز و گداز، جدت، مناسبت الفاظ، محاورات، روزمرہ، ایجاز و اختصار، جذبہ و خلوص وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تخیل، داخلیت، فطری انداز اور مثالیت وغیرہ احساس کو ترفع اور عظمت بخشتے ہیں۔

ندرت الفاظ اور ندرت اظہار وہ بنیادی اوصاف ہیں جو کسی شاعر کی پہچان کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ ندرت ہی کا کمال ہے کہ شعر میں نیا پن اور انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ ندرت الفاظ میں ہو یا اظہار میں، دونوں صورتوں میں شعر میں دلکشی اور دلآویزی کا باعث بنتی اور جذبہ و احساس کو گدازتگی، ذوق لطیف کو آسودگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے اور سلام میں وارفتگی کا تاثر نمایاں ہوتا ہے۔ شعر میں ندرت پیدا کرنا ہر سلام نگار کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے پختہ کاری اور کڑی ریاضت درکار ہے۔ ہمارے یہاں ایسے سلام نگاروں کی کمی نہیں جنہوں نے الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارات، خیال اور جذبے ہر سطح پر ندرت پیدا کر کے اعلیٰ تخلیقی کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

ہم نے جنہیں سر بلندیاں دیں
سر کاٹتے کیسے لگ رہے ہیں (احمد ندیم قاسمی)

پیاس کے ابر کی تخلیق ہیں گوہر کیا کیا
خشک ہونٹوں نے اُچھالے ہیں سمندر کیا کیا (قیصر بارہوی)

ہے کربلا ضرورتِ شیر و مصطفیٰ
عباس کربلا کی ضرورت کا نام ہے (شاہد نقوی)

دل میں جب کاروانِ غم آیا
پہلے عباس کا علم آیا (ذابر فتحپوری)

دیکھ کر تشنہ دہانی اصغر بے شیر کی
دل میں پانی کے لگی ایسی کہ دریا جل گیا (مہدی نظمی)

فرازِ پشتِ رسالتِ نبیؐ ہے بامِ حسینؑ
بڑا بلند ہے بچپن ہی سے مقامِ حسینؑ (مسعود رضا خاکی)

سلام نگاری میں محاکاتی انداز بیان موضوعاتی تاثر قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس انداز کی بدولت سلام کے پس منظر سے متعلق واقعات و حالات کی حقیقی تصویر قاری کی آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ جب حسن کے وسیلے سے جذبہ متحرک ہوتا ہے تو اندازِ نظر اور مقصدیت ہم آہنگ ہو کر لفظوں میں تاثر پیدا کر دیتے ہیں اور پھر یہی لفظوں میں تاثر پیدا کرنے والی کیفیت ہمارے سامنے ایک جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر کی صورت میں عیاں ہو جاتی ہے۔ محاکات کی وجہ سے جذبات کو آسودگی اور احساسات کو تسکین ملتی ہے۔

اکثر سلام گو شعراء نے محاکات کی بدولت زور تخیل کی مدد سے نفسیاتِ انسانی اور احساسِ فکر سے مطابقت رکھنے والے حوالوں کو موضوع کی وضاحت کے لئے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ محاکاتی انداز بیان سلام کو رفعت اور عظمت کا احساس بخشتا ہے اور طرزِ بیان اپنی نزاکت، ندرت اور تخیل کی گہرائی کے سبب پر لطف اور دلکش ہو جاتا ہے۔ محاکات کی درج ذیل مثالیں ملاحظہ کیجئے:

گر پڑے خاک پہ سجاؤ حزیں شمر نے آہ!
اس طرح طوق پکڑ کر سوئے زنداں کھینچا (میر انیس)

غارت کے وقت چادرِ قہر کے سوا
خیے میں اہل بیتؑ کو چھپنے کی جا نہ تھی (میاں دلگیر)

شع رکھ کر روئے اکبر دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبحِ محشر تک ٹھہرنا تھا شبِ عاشور کو (نجم آفندی)

یہ آنکھ میں آنسو ٹوٹی کمر یہ ہاتھ میں ریشہ درد جگر
رہنے بھی دیں مولا اکبرؑ کی میت کا اٹھانا مشکل ہے (سید وحید الحسن ہاشمی)

سلام نگاری کے لئے فصاحت بیان خصوصیت کی حامل ہے، موقع اور محل کی مناسبت سے شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال جو قلب و ذہن پر وجدانی اثرات مرتب کر دیں، فصاحت کہلاتا ہے۔ فصاحت کے حوالے سے شعر کا تناظر حرفی، غرابت حرفی اور مخالفت قیاس لغوی سے مبرا ہونا ضروری ہے۔ نامانوس اور غیر متعارف الفاظ کے علاوہ قیاس کے خلاف لغوی و لفظی روایت سلام کے حسن بیان کو متاثر کر دیتی ہے۔ تناظر کلمات اور تنقید لفظی و معنوی سے پاک سلام فصاحت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے شعری روایت و اسلوب بیان کے مختلف پہلوؤں کو ایک بلند مقام سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ فصاحت کی بدولت کلام میں ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ فصاحت دراصل الفاظ کی موزونیت اور معنی کی تاثیر کا نام ہے لہذا فصاحت کا حامل سلام حسن ترتیب اور حسن تاثیر کی بہترین مثال قرار پاتا ہے۔ سلام گو شعرا کے یہاں فصاحت کی مثالیں دیکھئے:

صد حیف ملے پیادہ روی اس کے پر کو
کونین کی اقلیم کا جو تخت نشیں ہو (میر حسن دہلوی)

رکھ قبر میں سجاؤ نے اکبر کو کہا، آہ
یہ خاک میں صورت تو ملائی نہیں جاتی (میر خلیق)

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی یکینوں کو (میر انیس)

کر بلا سے بڑھ کے اے رضواں تری جنت نہیں
قابل گلگشت ہے لیکن ہمیں فرصت نہیں (مرزا طاہر رفیع)

اب لڑیں گے جنگ اطمینان سے رن میں حسینؑ
دفن کردی میت بے شیر فرصت ہو گئی (قمر جالوی)

بلاغت کے حوالے سے سلام میں بیان شدہ واقعات و حالات متفقہانہ حال کے مطابق ہوتے ہیں۔ بلاغت فصاحت سے دو قدم آگے غیر مرئی اور پوشیدہ قوت ہے جو اگر سمجھ میں آجائے تو شعر کا لطف دگنا ہو جاتا ہے۔ سلام کی معنوی اور لفظی روایت بلاغت کے بنیادی تقاضوں کے مطابق توازن اور تاثر برقرار رکھنے میں جس طرح کامیاب رہی ہے۔ اس کی مثال

مختلف سلام نگاروں کے کلام میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

سوال بیعت شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسینؑ کا ہے (افتخار عارف)

محکم اسی لیے تو ہے رتبہ حسینؑ کا
سب سے عظیم دہر میں شجرہ حسینؑ کا (افضال شاہد)

تو کہ لایا تھا جو اک قافلہ سچائی کا
آج تک کرب و بلا کو وہی مہکاتا ہے (انعام الحق جاوید)

جیسے ابھی ہوا ہو یہ ایسا سانحہ ہے
ہم بھی نئے نئے ہیں غم بھی نیا نیا ہے (عباس تابش)

ہے اس کا ذکر شہر کی مجلس میں رہنا
اجڑے مگر میں حسرت تعمیر ہے حسینؑ (منیر نیازی)

تو مر کے جینا سکھانے والوں کا رہنا ہے
لہو کی مشعل جلانے والے سلام تجھ پر (احمد ندیم قاسمی)

بیسویں صدی خصوصاً صدی کے ربع آخر کے سلام نگاروں نے خیال اور اسلوب کی سطح پر ایسی ایسی جدتیں پیدا کی ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ بعض شعراء کے نزدیک شعر میں کوئی چونکا دینے والی بات کہہ دی جائے تو جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض شعراء تو نامانوس اور مبہم الفاظ اور دور از کار تشبیہات اور استعارات کے ذریعے بزم خود جدت کے دعویدار ہیں۔ تاہم سلام نگاری کے ذیل میں یہ بات اہم ہے کہ شعراء نے کہنہ خیال اور مستعمل موضوع کو اس سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس میں از سر نو تازگی پیدا ہو گئی ہے اور معنوی حوالے سے ایک بصیرت افروز منظر نامہ نگاہوں میں ابھرتا ہے۔

ہر برس ماہِ محرم میں ہوئی تعمیرِ دل
 اک نئی دیوارِ گریہ رُوح کے اندر بنی
 قطرہ ہر اشکِ راہوں کا نشاں بنتا گیا
 آہِ سوزاں سینہٴ احساس کا نشتر بنی (خاطرِ غزنوی)

نیزے کی آنی تو دلِ احمد میں گڑی ہے
 تم لوگ فقط سر پہ سرِ نوک سناں ہو
 اے ماتمی پورِ مہِ شامِ غریباں
 اب چارہ بے چارگی دل زدگاں ہو (خالد احمد)

وہ اک اشارہٴ پنہاں کہ سب مراحلِ شوق
 مسافرانِ محبت پہ ہو گئی آساں (سید رضی ترمذی)

نیزہ قلم تھا اور زمیں صورتِ ورق
 تحریرِ اسمِ عشق ہوا تیرے خون سے (روحی کنجاشی)

خن انہیں کے ہیں تپتی ہوا کے لہجے میں
 انہیں کا خون ہے اب بھی دلوں سے محوِ کلام (ستار سید)

علی کے سردِ رواں کی بہار تو دیکھو
 بھری فرات میں بے آب لہلہانے کی (شیر افضل جعفری)

بجھتے ہوئے تارے تھے بلکتے ہوئے بچے
 روتے تھے کہ سینے سے لگا لے کوئی آ کر (شہزاد احمد)

خیموں کو ضرورت تھی مگر بادِ فنا نے
رکھا ہے چراغوں کو بجھا کر لبِ دریا (عباس تابش)

جس میں ہر اک یزید کا چہرہ بگڑ گیا
وہ آئینہ تھی صورتِ حالات آپ کی (غلام حسین ساجد)

سلام نگاری کے فکری پہلو

سلام نگاری کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کے باوصف اس کے فکری اور نظری پہلو زیادہ ہمہ گیر اور وسیع ہیں۔ سلام کہنے والے شعراء نے دراصل اُس فکرِ حسینی کی ترویج و اشاعت کو اپنا سطحِ نظر بنایا جس کی روشنی سے کائناتِ انسانی کا ہر گوشہ مستنیر نظر آتا ہے۔ اس فکر نے جہاں خالص انسانی سطح پر ذہنوں کو تسخیر کیا ہے وہاں سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی سطح پر انسانوں کی سوچ کے دھارے کو ایک عظیم الشان انقلاب کی راہ پر ڈال دیا۔

سلام نگاری کے وسیع تناظر میں یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ سلام گو شعراء نے اپنے تاریخی اور تہذیبی سفر کا رخ سر زمینِ کربلا کی طرف موڑ کر نہ صرف ایک عدیم المثال اسلامی تہذیب کی بازیافت کا فریضہ انجام دیا بلکہ اس تاریخی اور تہذیبی سفر کی معنویت کا ادراک حاصل کر کے ذہنِ انسانی کو ایسا فکری سرمایہ فراہم کیا جس کی بنیاد پر رموزِ حیات آشکار ہوتے اور زندگی کے مقاصد سے آشنائی ملتی ہے۔ سلام نگاروں نے اپنے افکار و اسالیب سے صنفِ سلام کو جو نئے ڈانکے اور ہمہ نورنگ بخشے ہیں وہ زندگی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے عصری مسائل سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ یہ سلام ہر عہد کے انسان کو سوچ بچار اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں اور مخصوص اسلامی تہذیب کی عکاسی بھی کرتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سر زمینِ حجاز و کربلا کی روشنی سے چشمِ بینا کو بصیرت بھی عطا کرتے ہیں۔ سلام نگاری کے فکری رجحان کا نمایاں ترین پہلو یہ ہے کہ کربلا کے ریگزار میں وقوع پذیر ہونے والا سانحہ دراصل دو نظریات کے تصادم سے جو تاریخ مرتب کرتا ہے اس نے ہر طرح پر اقتدار و روایات کو تہدیل کر کے رکھ دیا۔ اس نے نہ صرف اخلاقی اقدار کو منقلب کیا بلکہ انسان کی اجتماعی مادی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا کر دیا اور نئے سرے سے انسانی زندگی کے نصب العین کا تعین کیا اور ایک ایسا ضابطہ حیات ترتیب دیا جس میں اولوالعزمی، استقلال اور مقصد کی سر بلندی اہم قرار پاتے ہیں۔ اس واقعہ نے انقلاب کے تصور کو ایک ایسا زاویہ بخشا کہ اس خطہ ارض کے کسی مقام پر کوئی انقلاب واقع ہو وہ کسی نہ کسی طور واقعہ کربلا سے استفادہ کرتا نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر آغا سمیل:

”واقعے کی واقعیت میں اگر قوتِ نامیہ موجود ہے تو اپنے زمان و مکان کے محیط سے نکل کر وہ

واقعہ آفاق گیر بنتا ہے اور انس و آفاق پر اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ نظریے کی بنیاد پر ہر پہلو سے واقعہ کربلا میں یہی قوت نامیہ کارفرما ہے جس نے اردو شعر و ادب کو ہر پنج پر مالا مال کر دیا۔“ (۱۳)

غور کیا جائے تو سلام نگاری کی اصل روح وہ تاریخی صداقت اور عالمگیر سچائی ہے جو سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کے لبو سے کربلا کی ریت پر رقم ہوئی۔ یہ قربانی تاریخ کا وہ عظیم واقعہ ہے جس نے باطل قوتوں سے بے سرو سامانی اور بھوک و پیاس کے عالم میں بھی نکڑا جانے کا درس دیا۔

یہ اب تک کربلا کی خاک سے آواز آتی ہے
بھلا بے آب مر جانا برا ہے آبرو رہنا (جوش)

بقول اسرار زیدی:

”یہی وہ صدا ہے جو آج سے قریب قریب چودہ سو سال قبل کربلا کے لقمہ و دق اور بے آب و گیاہ صحرا میں گونجی تھی۔ بے شک یہ ایک تین روز کے بھوکے پیاسے انسانی کی صدا تھی جو اپنے آہنگ اور گھمبیر تار کے اعتبار سے اتنی توانا تھی کہ آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی بازگشت نہ صرف یہ کہ چار دانگ عالم میں سنائی دیتی ہے بلکہ اس پر محیط بھی ہے۔“ (۱۵)

چنانچہ ”سلام“ اس صدائے عالمگیر کا عکس پیش کرتے ہیں جو آج بھی کہیں زیادہ توانائی کے ساتھ گونج رہی ہے اور شاعر کے حیطہ خیال میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے:

وہ ہیں لفظ کتنے گراں بہا جو نبھاسکیں ترا تذکرہ
مرے آنسوؤں کو قبول کر یہ مرے حروف سپاس ہیں (احمد ندیم قاسمی)

کربلا یوں ہی تو عالم میں نہیں موج فشاں
اس مظلوم میں نئی فکر کے دھارے بھی تو ہیں (سید وحید الحسن ہاشمی)

ترے لبو کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ ہے
ہوئی ہے عام شہادت کی آرزو تجھ سے (فارغ بخاری)

اک داستاں شفق کے لبوں پر ہے آج بھی
ابھی تھی جانے کیسی صدا تیرے خون سے (روحی کنجاہی)

شعراء سلام کے یہاں اصل فکری اساس حضرت امام حسینؑ کی ذات والاصفات میں فراہم ہوتی ہے جن کا بے مثل کردار اور شخصیت ان میں تخلیقی امنگ پیدا کرتی اور سخن سرائی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ حضرت سید الشہد اکا نام سامنے آتے ہی ان کی نگاہیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں اور فوری عقیدت در احساس پر دستک دینے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام عالی مقام کی عظیم الشان شخصیت ان کے سلاموں میں ایک بلند آہنگ استعارے کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے۔

سلام اس پر کہ سب انسانیت جس سے شناسا ہے
پہر ہے جو علیؑ کا اور محمدؐ کا نواسہ ہے (قتیل شفقانی)

ایک مظلوم کا انداز فراست دیکھو
بھر دیئے صبر کی شمشیر میں جوہر کیا کیا (قیصر بارہوی)

حسینؑ مہر صداقت کی روشنی کا طلوع
یزید ظلمتِ شب کے کمال کی صورت (سجاد باقر رضوی)

شبِ حیات میں تاثیرِ روشنی کیا ہے
چلو حسینؑ سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہے (سید وحید الحسن ہاشمی)

شہید کربلا کو عشق کی تحریر کہتے ہیں
انہیں حسن رسول اللہ کی تصویر کہتے ہیں (فدا حسین فدا)

اسی کا ذکر جمیل کرنا اسی کی سیرت کا باب پڑھنا
درود پڑھنا شہِ زمن پر سلام بہر ثواب پڑھنا (حسن عسکری کاظمی)

صبح سے مجھ کو غرض کوئی نہ وقتِ شام سے
میں ہوں وابستہ حسینؑ ابن علیؑ کے نام سے (اختر ہاشمی)

جب تک نامِ شہنشاہِ زمنِ زندہ ہے
حق و باطل میں لڑائی کا چلن زندہ ہے
(خرمِ خلّیق)

ساری صداقتوں کی ایسی ذات آپ کی
قرآن کی دلیل تھی ہر بات آپ کی
(غلامِ حسینِ ساجد)

سُح طلوعِ حق پہ صدائے دوام ہے
تو ایک دورِ ایک زمانے کا نام ہے
قصے میں تیرے صرف بہتر سُرور کا بوجھ
حصے میں تیرے سارے جگت کا سلام ہے
مقل تری اقامتیں امواتِ قاتمیں
بے بس نمازیوں کا تو پہلا امام ہے
(ناصر شہزاد)

حسینؑ "نوعِ بشر کی ہے آبرو تجھ سے
حدیثِ حرمتِ انساں ہے سرخرو تجھ سے
(فارغِ بخاری)

جنے گی ماں کوئی بیٹا حسینؑ جیسا کہاں
کسی کا ہو گا نواسہ حسینؑ جیسا کہاں
(روحی کنجاہی)

صبر و رضا کا خلق کا پیکر حسینؑ ہے
یعنی خدا کے نور کا مظہر حسینؑ ہے
(رشید تبسم)

حق کی صداقتوں کی نشانی حسینؑ ہے
دنیا میں انقلاب کا بانی حسینؑ ہے
(حسنِ رضوی)

چلا تھا کفر جب اسلام کے مٹانے کو
بجز حسینؑ بڑھا کون گھر لٹانے کو (کوثر عابدی)

حضرت امام حسینؑ کی جرأت، شجاعت، حوصلہ مندی، صدق و صفا اور صبر ہر عہد کے انسان کو ثبات قدم اور دکھوں اور غموں کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے چنانچہ سلام گزاروں نے حضرت امام حسینؑ کی سیرت و کردار کے ان روشن اور درخشاں پہلوؤں کو بھی اپنے اپنے انداز اور اسلوب بیان میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے اور اس حوالے سے اس فکری جہت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو ذہنوں کو تابندگی عطا کرتی ہے اور دلوں میں ایک اُمنگ پیدا کرتی ہے۔

یہاں لہو سے رقم ہے وقار صدق و صفا
یہ کربلا کی زمیں ہے یہاں ادب سے چلو (مسعود منور)

سلام تجھ پہ کہ تیری جساتوں سے ملی
جہان کرب و بلا کو لہو کی سچائی (نوٹی گیلائی)

وہ سب اصول تو نے سکھائے ہمیں حسینؑ
جو روشنی کی راہ پہ لائے ہمیں حسینؑ (قتیل شفاکی)

سلام ان پہ تر تنگ بھی جنہوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو تو چاہے (مجید امجد)

سبط رسولؐ ہونا بھی عزت کی بات ہے
پر اس سے بڑھ کے تیرے عمل کا مقام ہے (یحییٰ امجد)

سلام اس پر جو بیت احمدؑ کا لاؤلا تھا
رو وفا میں سر اپنا جس نے کٹا دیا تھا (فریدہ سید)

ہم اس کے نام لیوا ہے ضبط جس کا شیوہ
لیکن وہ جب بھی بولے نیزے پہ بولتا ہے (عباس تابش)

جرات و کردار کی باد بہاری کو سلام
اے غرور فقر تیری شہر یاری کو سلام
اے جسارت آدمیت اور شرافت کے امام
تیرے ہر موقع ادائے جاں ثاری کو سلام
اصل اثاثہ دھن نہیں، تابانی کردار ہے
اے اثاثہ دار تیری مالداری کو سلام (عبدالحمد عدم)

دکھایا ضبط نفس وہ دم مصائب و غم
فلک پہ آتش خاموش کا دھواں نکلا (تاج عرفانی)

لہو کے ساز پہ آوازِ حق کا نغمہ جاں
ہے زندگی کے ہنر میں کمال کی صورت (سجاد باقر رضوی)

سلام کے ان اشعار میں حضرت امام حسینؑ پیکر صبر و رضا بن کر وفا شعار اور جرات کردار کی ایک عظیم داستان رقم کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعر کا خیال انہیں شب تیرہ و تار میں امید کے چراغ کے مانند روشن دیکھتا ہے۔ ان کا مقدس وجود ٹھکے ہارے دلوں کو حوصلہ نا آسودہ دلوں کو تازگی، بھی ہوئی آنکھوں کو روشنی اور بے شناخت چہروں کو پہچان بخشتا ہے۔ سلام نگاروں نے حضرت امام حسینؑ کی شخصیت اور کردار سے جو روشنی کشید کی ہے اس کے سہرے تار انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ کربلا کا دکھ اور کرب اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ شہ کربلا کی ذات میں سمٹ آتا ہے تو وہ پوری کائنات اور کائنات کے تمام انسانوں کا کرب اور دکھ بن جاتا ہے۔ اس دکھ کے مختلف مظاہر ہیں۔ کئی لہو آ شام منظر ہیں جو کبھی فرات کی کم ظرفی کی صورت میں، کبھی لشکر یزید کی سنگدلی کی صورت میں، کبھی بچوں کی تشنگی کی صورت میں کبھی ماؤں کی بلند حوصلگی اور ہمت کی صورت میں روح کی گہرائیوں میں ڈھلتے اور حرف و صوت کا لبادہ پہن کر شعروں میں جگمگاتے ہیں۔

شہادتِ امام حسینؑ اس اعتبار سے تاریخِ عالم کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ اس واقعے میں مظلومیت کو فعال طاقت میں

بد لئے کا بھید پوشیدہ ہے۔ آپ کو اس واقعہ میں انسان کی انتہائی جبر میں سے مکمل اختیار کا راستہ پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیت نظر آئے گی۔ موت کی حقیقت کو فلسفہ شہادت میں بدلنے اور موت کی طبعی اور غیر طبعی دونوں صورتوں کو رد کر کے فکری اعتبار سے موت کے مروجہ معانی کو زندگی اور عمل کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے اور ایک لازوال زندگی ابد تک کے زمانوں کے لئے جاری کر دیتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا یہ پہلو فکری سطح پر ایک روشن علامت بن کر ابھرتا ہے چنانچہ اس تناظر میں کربلا کی علامت مزاحمت، عہد مندی، احتجاج، قربانی کی مختلف جہتوں کی مدد سے انسان اور اس کے حالات کے ساتھ محض ہمدردانہ انداز اختیار نہیں کرتی بلکہ ہمارے دلوں میں ایسا پاکیزہ ہیجان پیدا کرتی ہے جو ہمیں نوع انسانی کے ساتھ مہر و محبت کے رشتوں کو اور بھی مضبوطی کے ساتھ استوار کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد کر دیتی ہے اور انسانی مزاج میں زندگی کے حظ اور حسن کے احساس کو بڑھا کر طبیعتوں میں ایسا گداز اور ایسا کیف پیدا کر دیتی ہے جو انہیں صدق و صفا کی جستجو کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم کی سعی اور جدوجہد کے لئے تیار کرتے ہیں۔ ہمارے سلام نگار اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ نظر آتے ہیں۔ وہ اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ شاعری حقیقت کو بدلتی ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ جذبات و احساسات سے نئی نئی تصویریں بنا کر انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے چنانچہ شہادتِ حسینؑ حیاتِ جاوداں کا استعارہ بن کر جہاں گلشنِ دین کی پاسبانی کا فریضہ ادا کرتی ہے وہاں بہارِ جاوداں کے راز سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔

آج بھی ہے بسا ہوا اس سے جہاں آرزو
خونِ حسینؑ کی مہک منظرِ رنگ و بو میں ہے
آج بھی ہے فراتِ جاں موج بہ موجِ خوں فشاں
تشنہ لبی کی لہر بھی زیست کی آجوبو میں ہے
موت بھی ہے سر بلندِ زیست بھی سر بلند ہے
سرخِ داستاں جاں سب مرے سرخرو میں ہے
ریگِ زمینِ کربلا، گلشنِ دیں کی پاسبان
رازِ بہارِ جاوداں خونِ رگِ گلوں میں ہے (سجاد باقر رضوی)

درج بالا اشعار میں حیاتِ جاودانی کے اس تصور کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے جو شہادتِ امام حسینؑ سے وابستہ ہے۔ خاص طور پر یہ مصرعہ ”رازِ بہارِ جاوداں خونِ رگِ گلوں میں ہے“ اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے۔ ہمارے جدید سلام نگاروں کے یہاں جس نوع کی فکر پروان چڑھ رہی ہے وہ اس اعتبار سے فکرِ جدید کا درجہ رکھتی ہے کہ اس میں کربلا کے ساتھ ایک

نیا معنوی رشتہ جوڑنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے محض واقعات کے بیان کو کافی سمجھا ہے اور قدیم مرثیے کے زیر اثر تخیل کی رنگ آمیزی سے بکاسیہ انداز اختیار کر کے سلام کو جذبات کے تموج کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان سلاموں میں فکری سطح ذب کر رہ گئی ہے لیکن وہ سلام نگار جو علامت اور استعارے کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں ان کے یہاں کربلا ایک واقعہ نہیں، تہذیب و فکر کا ایک بلیغ استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس تناظر میں واقعہ کربلا ان کے سلاموں میں ایک نئے مزاج کی لہر بن کر ابھرتا اور فکر انسانی کے تمام گوشوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ سلام سے الگ نظم میں اگرچہ بعض شعراء نے اس سلسلے میں علامتی معنائی نظام کی سطح پر چند منفرد تجربات بھی کئے ہیں اور کربلا کی مخصوص علامتوں سے گریز کر کے بعض نئی علامتیں وضع کی ہیں لیکن اپنی پابند بیت کے سبب سلام نے ایسے دور اذکار تجربات میں سرکھپانے کے بجائے اپنے داخلی معنائی نظام کو وسعت دینے اور نئی تراکیب ایجاد کرنے پر اپنی توجہ صرف کی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سلام کسی سطح پر بھی فکری ثرولیدگی کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایک منظم اور مرتب انداز میں ترسیل فکر کے فرض سے سبکدوش ہوا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ سلام میں فکری اجتہاد کی بنیاد اگرچہ میر انیس کے دور میں رکھ دی گئی تھی لیکن بیسیویں صدی کے آخر میں اس اجتہاد کے ثمرات ایک زبردست تخلیقی اُچّ اور فکر رسا کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ثروت حسین کے سلام کے یہ اشعار دیکھئے:

کس کی خوں رنگِ قبا آتی ہے
روشنی اُب کے سوا آتی ہے
ساعتِ علم و خبر سے پہلے
منزلِ کرب و بلا آتی ہے
روزِ پیکار و جدل ختم ہوا
شبِ تسلیم و رضا آتی ہے
گریہ و گرد کا ہنگام نہیں
دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے
پھر سرِ خاکِ شہیداں ثروت
پھول رکھنے کو ہوا آتی ہے

ان اشعار میں شاعر کا تخلیقی وجدان فکر کے نئے زاویے تشکیل دیتا نظر آتا ہے۔ فنی اعتبار سے ترکیب سازی کے عمل نے سلام کی جو فضا تعمیر کی ہے اس کی انفرادیت مسلم ہے لیکن ہر شعر کا تلازماتی سلسلہ ایک گہرے اور بصیرت افروز عمل سے ترتیب پا کر فکر و احساس دونوں سطحوں پر اثر انگیزی پیدا کرتا ہے۔ اسی تناظر میں چند اور سلام ملاحظہ ہوں:

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانہ ہے
 مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
 صبح سویرے رن پڑتا ہے اور گھمسان کا رن
 راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
 ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک اُمید اٹاٹھ
 اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے
 دریا پر قبضہ تھا جس کا اس کی پیاس عذاب
 جس کی ڈھالیں چمک رہی تھیں وہی نشانہ ہے (افتخار عارف)

واقعہ کربلا اور اس کے متعلقات کا نئے سماجی انسانی مفہیم میں اس سے بہتر استعمال شاید ہی کہیں اور ملے۔ شاعر کا تخلیقی عمل عصرِ جدید کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورت حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتا ہے۔ اس سلام میں بنیادی تاریخی حوالے سے پیاس، دشت، گھرانہ، مشکیزہ، تیر، گھمسان کا رن، چراغ، کتاب، اُمید، دریا کے الفاظ جو پیکر بناتے ہیں، انہیں شاعر کا وجدان اپنے عہد کے کی عذابوں میں گھری ہوئی زندگی میں دیکھتا ہے۔ یوں اس کے اشعار صدیوں کے درد کا منظر نامہ بن جاتے ہیں۔

اس نوع کی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں تخلیقی اظہار نے کربلا کی مناسبت سے فکر و احساس کے ایسے گلاب اُگائے ہیں جن کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کئے دیتی ہے۔ ان سلاموں میں دردِ غم کی دھیمی دھیمی آنچ اور گداز کی کیفیت بھی ہے اور دہلی دہلی ٹیس اور بجھے ہوئے درد کی فضا بھی۔ مجید امجد کے یہاں بھی اسی رجحان کے تحت ایک درد انگیز تخلیقی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔

وہ شام صبح دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام
 رکا تھا آ کے ترا قافلہ ترے خیام
 متاعِ کون و مکاں تجھ شہید کا سجدہ
 زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام
 یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو
 کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیلِ اکِ گام
 سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ پورِ بتوں
 چراغِ محفلِ ایمان ترا مقدس نام

مجید امجد کا شعری وجد ان ایک بسیط الم ناک کیفیت کو کرب انگیز پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار دیکھئے جن میں حضرت زینب کی کیفیت غم کو پیش کیا گیا ہے۔

وہ قتل گاہ وہ لاشے وہ بے کسوں کے خیاں
وہ شب وہ سینہ کونین میں غموں کے خیاں
وہ رات جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے
مرے ہوئے کی صفوں میں ڈرے ہوؤں کے خیاں
یہ کون جان سکے تیرے دل پہ کیا گزری
لئے جب آگ کی آندھی میں غمزوں کے خیاں
ستم کی رات کی کالی قات کے نیچے
بڑے ہی خیمہ دل میں تھے عشقوں کے خیاں
تری ہی برق صدا کی کڑک سے کانپ گئے
بہ زیرِ پتر مٹلا شہنشاہوں کے خیاں
جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ آنکھوں کے خیاں

مجید امجد کے یہاں صورت حال کو کسی اور آن میں دیکھنے کا انداز ملتا ہے تاہم یہ بات زیادہ تر ان کی نظموں میں نظر آتی ہے جن میں ہیئت کا تنوع بھی ایک منفرد تجربے کی راہ دکھاتا ہے۔ البتہ ان کی غزلوں اور غزل نما نظموں میں موضوع کی باریک ترین جزئیات بھی آئینے کی طرح روشن نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بے کسوں، غموں، ڈرے ہوؤں، غمزوں اور آنکھوں کے خیاں اور ان کے مقابل پر ”یہ زیرِ پتر مٹلا شہنشاہوں کے خیاں“ جو منظر نامہ نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں وہ درد و غم اور کرہنا کی ایک عجیب کیفیت لئے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں ایک مظلوم اور بے کس عورت کے کیا جذبات ہو سکتے ہیں۔ مجید امجد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان جذبات کو بیان کرنے یا الفاظ کا جامہ پہنانے کے بجائے صرف اتنا کہنا کافی سمجھا ہے کہ:

یہ کون جان سکے تیرے دل پہ کیا گزری
لئے جب آگ کی آندھی میں غمزوں کے خیاں

یہ شعر جو تاثر پیدا کر رہا ہے اور دردِ غم کی کیفیت کو بیدار کر رہا ہے وہ شاید اس سے بہتر ممکن ہی نہیں تھا۔ یوں یہ پورا سلام شاعرانہ رفعتوں کو چھو تا نظر آتا ہے۔ اس سلام پر مجید امجد نے ”حضرت زینب“ کا عنوان دیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود ہیئت کے حوالے سے یہ سلام ہی رہتا ہے، نظم نہیں بنتا۔

زیر نظر باب میں سلام کے تاریخی اور فکری حوالوں سے ہم نے جو صورتحال پیش کی ہے اس کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو سلام نگاری ایک باقاعدہ صنف کی صورت میں جہاں دیگر معروف اصنافِ سخن کے ہم پلہ دکھائی دیتی ہے وہاں اپنے معیاتی اور فکری نظام کے حوالے سے بھی قابلِ لحاظ انداز میں اپنا اعتبار قائم کرتی ہے۔ اگرچہ سلام نگار شاعروں کا ایک وسیع حلقہ ایسا ہے جس نے اسے عقیدت کا محور و مرکز بنا کر محض مجالس اور محافل تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے اور واقعات کر بلا کو رنگ آمیزی سے بیان کر کے اسے تسکین جذبات کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر سلام انہی شعراء کے دستِ کرم کا محتاج رہتا تو شاید آج اسے وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو اس نے حاصل کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی صنفِ قبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہے جو شاعری کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شاعری کے مرکزی دھارے (Main Stream) سے الگ رہ کر نہ تو کوئی صنف پنپ سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ محض شاعری کے مرکزی دھارے میں شامل رہنا ہی کسی صنف کے ترقی کرنے کا سبب ہے۔ اگرچہ ایسا ہوتا تو قصیدہ اور مثنوی آج بھی فعال انداز میں زندہ ہوتے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی صنفِ سخن کی زندگی، موضوعی اور اسلوبیاتی سرچشموں سے وابستہ ہے جہاں سے اُسے قوت حاصل ہوتی ہے۔ غزل اسی لئے زندہ ہے کہ اس کے لئے کسی عہد میں موضوعات کی کمی نہیں رہی۔ اسے ہر دور میں ہر رنگ، اسلوب، مزاج اور ہر انداز کے شعراء میسر رہے ہیں۔ سلام بھی اسی لئے زندہ رہے گا کہ اُس نے جس موضوع کے ساتھ اپنا ربط قائم کیا ہے وہ کوئی وقتی یا مقامی موضوع نہیں ہے بلکہ ہر دور میں زندہ رہنے والا ایک آفاقی موضوع ہے۔ جب تک غم کا وجود ہے، کر بلا موجود ہے اور جب تک کر بلا موجود ہے سلام باقی رہے گا۔ لیکن سلام کی اصل زندگی اس کے داخلی نظام کی صلابت اور استحکام سے ہے۔ جب تک اس میں فکر کے نئے زاویوں کی تلاش کا عمل باقی رہے گا اور اسلوب کی مختلف جہتوں کی بازیافت کے حوالے سے تاب و توانائی باقی رہے گی اس کی زندگی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ ورنہ ایک وقت غزل پر بھی بہت بھاری آپکا ہے جہاں اس کی صدیوں کی مضبوط روایت ڈانواں ڈول ہونے لگی تھی۔ لیکن اس کی اندرونی طاقت نے اسے سہارا دے کر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ سلام کو بھی اگر اس کے اندرونی فکری نظام نے سنبھالا دیئے رکھا تو اس کی ترقی کے ان گنت امکانات موجود ہیں لیکن اگر اسے محض مجلسوں میں پڑھنے کی چیز سمجھ لیا گیا تو پھر اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔

حواشی

(اردو سلام نگاری کا تاریخی اور فکری مطالعہ)

(۱) گوپی چند نارنگ، سانچہ کر بلا، بطور شعری استعارہ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴

(۲) ضمیر اختر نقوی، سید، اردو غزل اور کر بلا، کراچی، مرکز علوم اسلامیہ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹

- (۳) گوپی چند نارنگ 'سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ' ص ۱۰۲، ۱۰۳
- (۴) وحید الحسن ہاشمی 'سید "تشنہ لب ہے حسین"' لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰
- (۵) امداد امام اثر "کاشف الحقائق" لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۶ء، ص ۱۹۱
- (۶) علی جواد زیدی "انیس کے سلام" نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲
- (۷) گوپی چند نارنگ "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" ص ۲۰
- (۸) وحید الحسن ہاشمی 'سید "تشنہ لب ہے حسین"' ص ۲۹، ۳۰
- (۹) ایضاً، ص ۳۱
- (۱۰) شمیم احمد "اصناف سخن اور شعری ہیئتیں" لاہور، تخلیق مرکز، ص ۶۱
- (۱۱) گوپی چند نارنگ "سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ" ص ۲۸، ۲۷
- (۱۲) رضی عابدی، پروفیسر، دیباچہ: سر مقتل از کوثر عابدی پانی پتی، لاہور، افتخار بک ڈپو، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱-۲۲
- (۱۳) وحید الحسن ہاشمی 'سید "تشنہ لب ہے حسین"' ص ۳۵
- (۱۴) آغا سہیل ڈاکٹر "واقعہ کربلا اور اردو کا شعری ادب" مضمون مشمولہ: ماہنامہ "شام و بحر" لاہور، جون ۱۹۹۵ء، ص ۲۵، ۲۶
- (۱۵) اسرار زیدی "کربلا کربلا، حسین حسین" لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴



باب پنجم

اُردو سلام نگاری کا مجموعی جائزہ

اُردو سلام نگاری کا مجموعی جائزہ

گزشتہ ابواب کے پیش کردہ نکات کا خاکہ

گزشتہ ابواب میں سلام نگاری کے فن، ہیئت اور خصوصیات کے حوالے سے جامع اور مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلام نگاری کے آغاز اور عہد بہ عہد ارتقاء کے ذیل میں دکن، شمالی ہند، لکھنؤ اور اس کے بعد پاکستان میں سلام نگاری کی ترقی پر بحث کی گئی ہے اور تاریخی تناظر میں ان اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے نتیجے میں سلام نگاری نے ایک مقبول صنفِ سخن کا درجہ حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں واقعہ کربلا کی تاریخی اور فکری اہمیت کے تناظر میں سلام نگاری پر اس کے گہرے اثرات بھی موضوع تحقیق میں شامل رہے ہیں۔ جہاں تک سلام نگاری کے فن کا تعلق ہے تو اس بارے میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے براہ راست اثرات مرثیے کے ذریعے اردو شاعری میں پہنچے۔ مرثیہ ایک قدیم ترین صنفِ سخن ہے جو محض اردو شاعری ہی سے مخصوص نہیں بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ایک باقاعدہ صنفِ سخن کے طور پر اس نے واقعات کربلا کو اپنا موضوع بنایا۔ تاہم اردو شاعری میں آ کر اس کی حدیں وسیع ہوئیں اور اس کی ترقی کے امکانات روشن ہوئے۔ سلام نگاری کو ہم اردو مرثیے کی توسیع کہہ سکتے ہیں تاہم ہیئت کے اعتبار سے اردو مرثیہ سے الگ ہونے کے باعث اس صنفِ سخن نے اپنی راہوں کا تعین خود کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلام نگاری ہیئت اور فنی خصوصیات کے حوالے سے اردو غزل سے مماثل ہے اور موضوع کے اعتبار سے اردو مرثیہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کے حوالے سے اردو مرثیہ نے واقعاتی اور فکری سطح پر ان تمام امکانات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے جو اس خاص موضوع کے تناظر میں نمایاں ہو سکتے تھے تو پھر سلام نگاری کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس اہم اور بنیادی سوال کا تفصیلی جواب باب اول میں موجود ہے تاہم یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ ہر مہذب قوم اور معاشرے کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ مذہبی سطح پر تشکیل پانے والے معاشرے کے اپنے آداب اور روایات ہیں اور ان کا تعلق اخلاق، عقیدت و احترام اور ایک مہذب معاشرت سے بنتا ہے چنانچہ اسلامی تہذیب پر استوار ہونے والے معاشرے میں حسن سلوک،

خیر خواہی اور باہمی ملاقات کے وقت شائستہ اطواری کے جذبات آداب و سلام اور کلمات خیر ادا کرنے کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ مخاطب سے ملتے ہوئے سلام کی ادائیگی دراصل مخاطب کی عظمت کو تسلیم کرنے اور احترام آدمیت کی علامت ہے۔ اس پس منظر میں سلام نگاری ان عظیم ہستیوں کی جدوجہد خدومات اور جان سپاری کا اعتراف ہے جو انہوں نے کارزار حیات میں اپنی رضا سے ایک بہترین راستے کا انتخاب کرتے ہوئے انجام دیں۔ مرثیہ ان عظیم ہستیوں کے حالات و واقعات، سوانح اور سیرت و کردار کے حوالے ایک مکمل تاریخی منظر نامہ نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ ان حالات و واقعات کی غیر معمولی تفصیل اور طوالت اور جزئیات تک رسائی ایک وسیع و عریض لینڈ سکیپ پر پھیلی ہوئی ہے۔ جبکہ سلام اپنے لفظی اور معنوی مفہوم کے سبب اختصار اور جامعیت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ان ادوار میں جب طویل مثنویاں، مرثیے اور غزلیں لکھنے کا رواج تھا، سلام نگاری کا اختصار اے مقبولیت کا درجہ نہ دے سکا۔ لیکن گزشتہ ایک صدی کے دوران میں جہاں اردو شاعری کی مختلف اصناف کے مزاج اور فنی حیثیت میں بعض ودرس تبدیلیاں رونما ہوئیں تو شعراء نے غیر معمولی طوالت سے گریز شروع کی اور اختصار اور جامعیت کی طرف توجہ دینے لگے تو سلام نگاری کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

ابتداء میں مجالس ذکر شہدائے کربلا کے تقدس و احترام کے پیش نظر سامعین کی توجہ مبذول کرانے اور سکوت و خاموشی کا روح پرور ماحول پیدا کرنے کے لئے مرثیہ خوانی سے قبل بارگاہ شیدائے کربلا میں سلام کا نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ ان مواقع پر سلام پڑھنے کا مقصد دراصل مرثیہ خوانی کے لئے فضا کو تیار کرنا اور سامعین کی جذبات پرور عقیدتوں کو ایک خاص نقطے پر مرکوز کرنا تھا۔ یہ سلام نگاری کا اولین اعتراف تھا لیکن اس اعتراف کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ان سلاموں میں زیادہ تر واقعات کربلا اور معصوم و مظلوم سرفروشوں کی بے کسی غریب الوطنی اور مظلومیت کا خطیبانہ بیان ہوتا تھا جس سے اہل مجلس کے دلوں میں گداز اور درد مندی کے جذبات پیدا کئے جاتے تھے۔ شہدائے کربلا کی جرات، بہادری اور ان کی عظمتوں کے تذکرے سے مشک بار یہ سلام سامعین کے جذبات میں ارتعاش پیدا کر کے انہیں مرثیہ خوانی کے طویل مراحل کے لئے ایک اساس فراہم کر دیتے تھے اور اس کے بعد مرثیہ خوانی کے جوہر کھلتے تھے تو مرثیہ نگار آسمان سے زمینیں کھینچ لاتے تھے۔ اس صورتحال میں سلام نگاری، مرثیے کے مقابلے میں ایک دوسرے درجے کی صنف رہی۔ مرثیے کے شکوہ اور عظمت نے اسے سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسری طرف چونکہ سلام غزل کی ہیئت میں لکھے جا رہے تھے اور غزل گو شعراء بجائے خود اپنے اشعار میں فیضان حاصل کر رہے تھے اور تقریباً ہر غزل گو کے ہاں ایک دو یا اس سے زیادہ اشعار میں کربلا کی تلخی اور شہادت حسین کی دل سوزی اپنی جگہ بنانے لگی تھی اس لئے سلام نگاری کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے بیشتر نقادوں کی تمام تر توجہ غزل اور مرثیے پر رہی۔ نقادوں کو غزل اور مرثیے کی تاریخی حیثیت اور ان کی تہذیبی پس منظر زیادہ متاثر کرتا تھا چنانچہ وہ اپنی تحریروں میں سلام نگاری سے تقریباً اور تعلق رہے۔ بعض نقادوں اور محققین نے اسے اردو کی قدیم ترین صنف نو تسلیم کی لیکن ایک علیحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے ادب میں اس کے مقام و مرتبہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ ان حالات میں سلام نگاری کے لئے خاصا

مشکل وقت تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب غزل اور مرثیے کے مشہور شعراء نے سلام کہنے شروع کئے تو اہل نظر کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ سلام نگاری ایک قابل لحاظ صنف کے طور پر وسیع امکانات کی حامل صنف ہے اور اس میں کربلا کے حوالے سے بلند تر اخلاقی اور فکری مضامین پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

جہاں تک سلام کی ہیئت کا سوال ہے تو اس کے لئے غزل کی ہیئت مخصوص ہو چکی ہے اور معروف اور مستند شعراء نے اسی ہیئت کو استناد بخشا ہے۔ بعض ناقدین کا یہ خیال قرین صحت نہیں ہے کہ میر انیس نے اپنے عہد میں سلام کی ہیئت کو غزل کے مطابق ڈھالا ہے حالانکہ انیس سے بہت پہلے بکریک اور مصحفی کے سلام غزل کی ہیئت میں سامنے آ چکے تھے۔ ابتدا میں سلام کے لئے کوئی خاص ہیئت کی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ گزشتہ ابواب میں مختلف ہیئتوں میں کہے گئے سلاموں کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ موضوعی اعتبار سے تو سلام مرثیے کی صنف سے ہم آہنگ تھے لیکن اسلوب اور پیش کش کے اعتبار اس نے اپنی انفرادیت کو بہر حال قائم رکھا اور مرثیے سے الگ اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں غزل کی ہیئت اختیار کرنے کے باوجود بعض شعراء نے دیگر ہیئتوں مثلاً مثنوی اور آزاد نظم کی ہیئت میں سلام لکھے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شعراء کو اپنے بیان کے لئے جو وسعت اور ہمہ گیریت درکار تھی اس کے لئے انہوں نے دیگر ہیئتوں سے بھی رجوع کیا۔ ان میں مرثیہ، مخمس، مسدس، معری، آزاد اور نثری نظم کی ہیئتیں شامل ہیں جن میں جدید سلام نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ ہیئت کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں جو مباحث پیش کئے گئے ہیں ان کے اہم نکات یہ ہیں کہ ہیئت کے اعتبار سے سلام مقصدی غزل کے زمرے میں شامل ہے جس کا ہر شعر جدا جدا معانی اور مطالب رکھتا ہے۔ غزل کی طرح سلام بھی رمز یہ انداز کا حامل ہوتا ہے اور ایجاز و اختصار اس کی اہم خصوصیت شمار ہوتی ہے۔ غزل کے تتبع میں سلام کے اشعار کی تعداد بھی سات، نو اور گیارہ ہوتی ہے۔ غزل کی طرح سلام میں بھی مخصوص استعارے اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ غزل کی طرح سلام سے بھی اصلاحی اور انقلابی کام لیا گیا۔ جدید غزل اور جدید سلام دونوں پر ترقی پسندی کی چھاپ ہے۔ غزل کی ہیئت اختیار کرنے کے باوجود سلام کے لئے دیگر اصناف کی ہیئتوں نے بھی اپنی باہیں کشادہ کی ہیں اس لئے سلام کو محض ہیئت کی بنیاد پر جانچنا درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ارباب فکر و نظر نے بھی سلام نگاری پر بھتی پابندیوں کو منظر استحسان نہیں دیکھا۔ ان کا موقف ہے کہ بھتی پابندی شاعر کے افکار کے ابلاغ میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ یہ پابندی غیر ضروری ہے تاہم اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ سلام نے چونکہ غزل کے مزاج و مذاق کو اپنا لیا ہے اس لئے سلام کے لئے غزل کی ہیئت ہی مناسب اور موزوں ہے۔ سلام نگاری اگرچہ موضوعی اعتبار سے مرثیے سے خاص نسبت رکھتی ہے تاہم اس کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں رقت اور گریہ کا اہتمام بھی کیا جائے۔ اسے ہلکے پھلکے اور لطیف انداز میں بھی لکھا جاسکتا ہے۔ مجموعی اعتبار سے سلام کی فضا پاکیزہ خیالات، تزکیہ نفس کے جذبات، سیرت و کردار کی تعمیر کرنے والے بیان، ناپائیدار کی حیات کے اظہار اور اتباع سیرت معصومین سے معمور ہوتی ہے۔

ایسے مضامین اور موضوعات جن سے سلام کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے، اعتقادی اور اخلاقی دونوں انواع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اعتقادی مضامین میں حمد، نعت اور منقبت کے مضامین شامل ہیں۔ ان میں توحید، ذکر الہی اور عشق الہی کے مضامین عشق رسولؐ اور حب رسولؐ اور واقعہ معراج سے متعلق مضامین، حضرت علیؑ کی شجاعت، سخاوت اور علم کا ذکر۔ نجف اور خاک نجف سے قلبی وابستگی کا اظہار۔ حضرت امام حسینؑ کی قوت عمل، طاقت، صبر اور اعلیٰ قیادت کی خصوصیات پر مشتمل مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ جبکہ اخلاقی مضامین میں صبر و قناعت، فقر و استغناء، توکل، خاکساری و انکساری، راست بازی، ثبات قدم، سخاوت، شجاعت، صفائے قلب، کار خیر، عمل خیر سے رغبت، عہد کی پاسداری، خود داری، خود اعتمادی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مضامین کی روشنی میں سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل بیت اور آئمہ کرام کی سیرت، ان کے زندہ جاوید اور روشن کارناموں کی تشریح و توضیح، اہل بیت کی قربانیوں کا تذکرہ اور تہذیب و اخلاق کی ان اعلیٰ اقدار کو بیان کیا جاتا ہے جن سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے اور عملی خیر کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ ادا کیا جائے۔

جہاں تک سلام نگاری کے لئے زبان و بیان کا تعلق ہے تو حسن آفرینی اور اثر پذیری سلام کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر سلام قادر الکلامی اور تخیل کی بوقلمونی کی مدد سے اسلوب بیان کی تازگی اور شگفتگی کا مرقع بن جاتا ہے۔ الفاظ و تراکیب کے موزوں استعمال سے معنی آفرینی اور خیال کی بے ساختہ ادائیگی سے مضمون کے حسن و خوبی کی دلی آویز تصویر کشی ممکن ہو جاتی ہے۔ موزوں الفاظ سلام میں خوش سلیقگی اور شائستگی کو فروغ دیتے ہیں۔ حقیقت نگاری، فصاحت و بلاغت، تاریخی واقعات کا بیان، خیال پروری، بے ساختگی اور فطری انداز، داخلیت و خارجیت کا اظہار، محاکاتی انداز، بیان، ایجاز و اختصار، خلوص و آفاقیت، عینیت و ندرت، سوز و گداز اور جذبہ و خلوص کا اظہار اور عقیدت و احترام کے پاکیزہ اور مقدس رجحان کو سلام نگاری میں معنوی حسن اجاگر کرنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب بیان کی دلکشی، انتخاب الفاظ، روزمرہ و محاورات، ضرب الامثال، تشبیہات و استعارات، صنائع لفظی و معنوی کے معنی خیز تاثر سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بے حد اہمیت کی حامل ہیں تاہم سلام نگاری میں استعارے کی روایت غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ استعارہ شاعرانہ جدت طبع اور قوت فکر کی علامت ہے۔ لطیف اور نازک خیالات کے علاوہ پیچیدہ اور دقیق افکار جو عام زبان میں بیان نہ کئے جاسکتے ہوں، استعارے کے حوالے سے موثر انداز میں بیان ہو سکتے ہیں۔ استعارہ کلام میں حسن اور ادائیگی میں جاذبیت و دلکشی پیدا کرتا ہے۔ سلام نگاری میں تخیل، محاکات اور موصوع کے عزائی تاثر کو دلکش انداز میں استعارہ کی بدولت ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ استعارہ غور و فکر اور نکتہ سنجی کے مختلف رویوں کو فروغ دیتا ہے۔ معانی میں بلاغت کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ سلام نگاری میں رموز ایمائیت کا جو ہر بھی استعارے ہی کی بدولت نکھرتا ہے۔ ایجاز و اختصار کا حسن استعارے کی وجہ سے ہی ممکن ہے جو سلام نگاری کے مجموعی تاثر کو نکھارنے کا باعث بنتا ہے اس مجموعی تاثر سے سلام نگاری میں وسعت اور بلاغت کا جو ہر نمایاں ہوتا ہے۔

جہاں تک سلام نگاری کی روایت کا تعلق ہے تو اردو میں سلام نگاری کا ارتقاء کئی صدیوں کو محیط ہے اگر یہ کہا جائے کہ

اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ سلام نگاری کا آغاز ہو گیا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے یہاں سلام نگاری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کے کلیات میں شامل پانچ سلام اردو سلام نگاری کی قدیم روایات کا پتہ دیتے ہیں۔ قدیم دکنی عہد میں سلام کے ساتھ ساتھ مرثیے کی بھی کوئی ہیئت متعین نہیں تھی اس لئے ان اصناف کے تعین میں مشکلات کا سامنا رہا۔ چونکہ زیادہ تر تحقیقی کام مرثیے پر ہی ہوا اس لئے محققین اور ناقدین نے سلاموں کو بھی مرثیے ہی کی صنف میں شامل کر دیا۔ ہیئت کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے سلام اور مرثیے میں فرق واضح نہ ہو سکا۔ البتہ نجم الغنی کے ان الفاظ کی روشنی میں سلاموں کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی کہ جو مرثیہ غزل یا قصیدے کے طور پر لکھا جائے اسے سلام کہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس دور میں لکھے گئے تمام مرثیے سلام کے ذیل میں آتے ہیں۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دکنی عہد کے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے معروف مرثیہ نگار شعراء سلام نگار بھی تھے۔ ان سلاموں میں ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور زبان و بیان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مدوح کے لئے عقیدت اور والہانہ محبت کا اظہار ہی ان سلاموں کا اصل محرک ہے۔ مجموعی اعتبار سے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کو سلام نگاری کی تشکیلی دور کہا جاسکتا ہے۔ اس عہد کے عزائی ادب میں رونے رلانے کا عنصر غالب رہا اور بیشتر کلام معتقدات کا مقدس لباس پہنے ہوئے ہے۔ یہ سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا تاہم اس میں جوش و خروش نظر نہیں آتا جو دکن کے ابتدائی دور میں دکھائی دیتا ہے۔ شمالی ہند میں سلام نگاری کا اصل دور محمد شاہ رنگیلے کا عہد ہے جس میں سلام نگاری کی روایت پھیلی پھولی اور عید میلاد النبیؐ اور محرم کی عزاداریوں میں سلام پڑھنے جانے لگے۔ دلی میں ولی دکنی کے سلاموں کی دھوم تھی۔ مرثیہ گو شاعروں کے علاوہ غزل گو شعراء بھی حصول ثواب کی خاطر سلام کہتے تھے۔ یہ سلام نگار سلام تخلیق کرتے وقت ابلاغ کے تقاضوں کو مقدم رکھتے تھے اور اظہار کا براہ راست انداز اپناتے تھے۔ یہ صرف عقیدے کا اعجاز تھا کہ ادبی چاشنی نہ ہونے کے باوجود بھی یہ صنف زندہ رہی بلکہ اپنے ارتقائی مراحل بھی طے کرتی رہی۔

میر و سودا کے دور تک آتے آتے ”سلام“ ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اہل نقد کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ چنانچہ تنقید کے خوف اور اعتماد کی فضا نے اردو سلام کی پرداخت میں اہم کردار ادا کیا اور بیان کی نامواری رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگی اور زبان میں نکھار آتا گیا۔ اس دور کے نمایاں سلام نگار میر ضاحک جنہیں سودا کی زبردست تنقید کا نشانہ بننا پڑا سلام نگاری کی نئی روایت کا نقطہ آغاز کہے جاسکتے ہیں۔ سودا اور ضاحک تک آتے آتے سلام باقاعدہ ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ سودا کے کلیات میں موجود سلام اس بدلتی ہوئی صورت حال کی غمازی کرتے ہیں۔ اس عہد میں سلام اور مرثیے کے درمیان ایک واضح حد فاصل قائم ہوئی اور مرثیے کے مسدس ترکیب بند اور سلام کے لئے غزل یا قصیدے کی ہیئت مخصوص ہوئی۔

اس کے بعد سلام نگاری کی روایت لکھنؤ میں اپنے قدم جماتی ہے اور میر انیس تک پہنچتی ہے۔ اور یہی وہ دور ہے جس میں اسے پہلے سے کہیں بڑھ کر تاب و توانائی اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ پورا عہد مرثیے کا عہد ہے لیکن میر انیس سمیت

تقریباً ہر مرثیہ گو کے یہاں سلام کی بھی قابل لحاظ مقدار ملتی ہے۔ اس عہد میں سلام نگاری میں جدت کے پہلو نکالے گئے۔ نئے مضامین تلاش کئے گئے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر آسمان سے تارے توڑ کر اشعار میں ٹانک دیئے گئے۔ انیس و دیر کے دائرہ سخن میں آ کر سلام میں زبان کی خوبی بندش کی جستی، معنی میں تنوع، متغزلانہ شان، سادگی و پرکاری، سوز و گداز، حکیمانہ بصیرت اور شعور کے عرفان و آگہی میں اضافہ ہو گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک جن سلام نگاروں نے نام پیدا کیا ان میں انیس و دیر کے خاندان کے شعراء سمیت متعدد نام ہیں جنہوں نے سلام کو ہر اعتبار سے ترقی دے کر اسے چھتنا اور درخت بنا دیا۔ ان کے سلاموں میں تجزیہ، تبصرہ، تاریخ، تنقید، محاکمہ، طنز، تعلیٰ غرض شعر کی تمام ممکن صفات پائی جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد سارا ہندوستان انتشار اور اضطراب کا شکار ہو گیا۔ تہذیبی بحران نے پورے معاشرے کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ دارگیر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے ٹکراؤ نے روایت و اقتدار میں دراڑیں ڈال دیں۔ عوام میں منافرت اور انتقام کا جذبہ پھیل گیا۔ اظہار و بیان پر پابندیاں لگیں تو مزاحمتی ادب کی جھنکار صورت اسرافیل کی شکل اختیار کی گئی۔ دلوں میں بجھتی چنگاری شعلہ جوالہ کی صورت میں بھڑکی۔ ان حالات میں کہیں سے انقلاب اور کہیں سے اخلاقی قدروں کی بحالی اور اصلاح معاشرہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور یہی زاویہ ہائے نظر سلاموں میں نظر آنے لگے۔ سلام نگاری کا یہ دور ایک زبردست نتیجہ کا دور ہے جس میں شعراء کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ ان شعراء نے سلام کو زندہ رکھنے اور اس کا معیار بلند کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کر دیں۔ چنانچہ اس دور میں سلام نگاری میں جو نئے گوشے ابھرے، انہوں نے اسے جدید اور ترقی یافتہ شکل میں ایک اعلیٰ صنف سخن کا درجہ دے دیا۔ اس دور میں صحت زبان کے اصول وضع ہوئے۔ جدید فکری لوازمات سے سلاموں کو روشناس کیا گیا۔ مزاحمتی اشعار سلام کی زینت بنے۔ انقلابی انداز اختیار کیا گیا۔ نفسیات کی کارفرمائی سے سلام کو جدت سے آشنا کیا گیا۔ ماضی کے تہذیبی اثرات کو محفوظ کیا گیا۔ قدیم اور جدید سلام نگاری میں حسن فن سے تطبیق پیدا کی گئی۔ واقعات کو بلا کے گننام گوشوں کو اجاگر کیا گیا۔ کربلا کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا۔ سلام سے قومی بیداری کا کام لیا گیا۔ کربلا کے گننام مجاہدین کے تذکرے سلاموں کی زینت بنے۔ پیغمبروں، ائمہ کرام، اولیاء اللہ اور دیگر نادیر ہستیوں کے ذکر سے سلام کی معمولی فضا کو معطر کیا گیا۔ زمانے کی ناقدی، معاشرے کی شعراء سے بے توجہی، ذاتی مسائل، شاعرانہ چشمک اور اخلاقی مسائل کے تذکرے کئے گئے۔ روایات احسن کی طرف اشاروں سے کام لینے کا فن بہت ترقی کر گیا۔ استعاروں کے ذریعے حضرت امام حسین کو صابر شاہ اور یزید کو ظالم اور کبر و نخوت کا نمائندہ سمجھا گیا۔ ظلم اور جبر کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کے لئے ہمدردی کا احساس اجاگر ہوا۔ کربلا کے واقعات کے زیادہ جنگ کے اسباب اور نتائج کے تجزیے سلاموں میں پیش کئے گئے۔ ملکی مسائل اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ساتھ دیگر اقوام کی طرف بھی رجوع کیا گیا۔ مرثیے کے زیر اثر سلاموں میں حزن و غم اور بکا، انداز بھی اختیار کیا گیا۔ الغرض اس عہد میں سلام نے ممکن حد تک سماجی و معاشرتی اور تہذیبی سطح پر تمام آفاق کو چھونے کی کوشش کی۔

قیام پاکستان کے بعد سلام نگاری نے ایک اور کروٹ لی اور اس میں ایک تازہ ایسے نے آنکھ کھولی۔ تقسیم ہند نے مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کیا۔ بچے نظروں کے سامنے ذبح کئے گئے۔ گھر لوٹ لئے گئے۔ لوگوں کو تمام جمع پونجی سے محروم کر دیا گیا۔ سفر کی تکالیف، گرمی کی شدت، بھوک اور پیاس کا الم۔ وطن کی جدائی۔ اعزہ سے مفارقت صحراؤں میں قیام نے کربلا والوں کی یاد تازہ کر دی۔ چنانچہ اس دور میں سلام نگاروں نے آپ بیتی کو جگ بیتی کی سطح پر بیان کر کے سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں سمیٹ لیا۔ سلام ایک گہرے درد کی کک سے آشنا ہوئے اور جرات و بہادری کی داستانیں اور جذلوں کا وفور ایک نئے انداز میں رقم ہونے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد شعراء کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف شہروں کراچی، لاہور، راولپنڈی اور دیگر شہروں میں آباد ہو گئی۔ ان شعراء کی نقل مکانی کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی مستقل تہذیب اور شاعری کی منور روایات بھی پاکستان منتقل ہو گئیں چنانچہ قیام پاکستان کے بعد کی سلام نگاری کی زبان میں وہی طنز اور انداز ملتا ہے جو لکھنؤ یا دہلی کی زبان سے مختص ہے اور تہذیبی اقدار میں وہی نظر آتی ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے مسلمان گھرانوں سے تھا۔ شعراء نے اپنے مسلمانوں میں اس جذبہ حریت کو مرکز بنایا جو تحریک پاکستان کے حوالے سے مسلمانان ہند میں پیدا ہوا تھا چنانچہ اس دور کے مسلمانوں میں وحدت، مساوات، عدل، ایثار اور قربانی کی عملی راہ کی عکس نمائی ملتی ہے۔ کربلا کے واقعات، سید الشہداء حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی داستان ایثار و قربانی اور عزم و ارادے کی لازوال بصیرتیں لئے ہوئے ہے چنانچہ سلام نگاروں نے اس سے اکتساب کر کے قوم میں ملی بیداری، قومی شعور، اولوالعزمی اور یقین پیدا کرنے کی سعی کی۔

فسادات اور خوئیں واقعات نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ مذہب کی بنیاد پر انسانی خون کی ہولی کھیلی گئی۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور ایسے ولدوز مناظر سامنے آئے کہ دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان واقعات نے جہاں سماج اور معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کئے وہاں شاعری کو بھی زبردست متاثر کیا۔ چنانچہ شعراء نے پیش آنے والے واقعات سے اثر قبول کر کے اپنی قلبی واردات اور داخلی کیفیات کو کربلا کے استعارے سے بیان کیا۔

قیام پاکستان کے بعد کا زمانہ سلام نگاری کے احیاء کا زمانہ ہے۔ اس دور میں سلام نگاری نئے تجربات سے روشناس ہوئی۔ فن اور موضوع کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔ سیاسی اور ذہنی انقلاب نے ایک نئی ذہنیت اور معاشرت کو راہ دکھائی۔ اس مرحلے پر جس جذبے نے شدت کے ساتھ سراٹھایا وہ اسلامی تمدن اور جدید کلچر کا نکھار تھا چنانچہ اس دور کے مسلمانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستانی ثقافت کے نمایاں اثرات دھیرے دھیرے اردو شاعری پر اپنا گرفت مضبوط کر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کے نقوش گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس تہذیبی اور ثقافتی طرز احساس کے پہلو بہ پہلو سلام نگاری کا یہ عہد فکری اعتبار سے بھی رفعتوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کربلا کا استعارہ ایک نئے معنوی تناظر میں اپنے مفاہیم کے در کھولتا ہوا اہل نظر کو نئی حقیقت افروز دنیاؤں کی خبر دیتا ہے۔ شہادت حسینؑ کا تاریخی حوالہ نئے معنویاتی تقاضوں کے تحت رٹائی ادب سے ہٹ کر دیگر

اصناف میں بھی نمودار ہوتا نظر آتا ہے اور نئے اظہاری اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تدریجاً استعاراتی اور علامتی توسیع اسے ایک عالم گیر آفاقی معنویت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس کا اطلاق انسانوں کی عمومی صورتحال اور جبر و قعدیٰ استبداد و استحصال کے خلاف نبرد آزما ہونے اور حق و صداقت کا علم بلند کرنے کی صورت حال پر بھی ہوا۔

پاکستان کے سلام نگاروں نے المیہ کر بلا اور اس کے محترم کرداروں کے حوالے سے حق کو شکی اور جاں فروشی کی تاریخی روایت کو غزل کی ایمائیت اور رمزیت کے ذریعے اپنے سلاموں میں پیش کیا اور ان کی معنویت کو اپنے عہد کے طرز احساس پر منطبق کیا۔ واقعہ کر بلا کی لہورنگ معنویت نے ایمائی اور استعاراتی نوعیت کی تراکیب کے ذریعے سلام کی پوری فضا کو لالہ رنگ کر دیا۔ آنسو سر چشم وفا، دشتِ گریہ، جذبہٴ عشق، آبلہ پا، دل کی محراب میں چراغ کی لؤ، صبح دم ماتم، ارباب وفا، خونِ دل، خونِ تمنا، خونِ جگر، اہکِ خون، آلودہ خون، مقتل، قتل گاہ، دیدہ خون، ابی ترکیب اور الفاظ ہیں جو سلام نگاروں کے ایک خاص نو کے فکری نظام کو استوار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

واقعہ کر بلا اور اس کے متعلقات کا نئے سماجی انسانی مفہیم میں استعمال، شعراء کے تخلیقی وجدان سے ہم آہنگ ہو کر اپنے عہد کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی و انسانی صورتحال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں سامنے لاتا ہے۔ ان سلاموں میں ایک ایسے انسان کا تصور ملتا ہے جو مسلسل ہجرت میں ہے، عذابوں میں گھرا ہوا ہے، در بدر خاک، بے مار مارا پھر رہا ہے اور اس کے لئے کوئی دارالاماں اور جائے پناہ نہیں ہے۔ ایک بد حال اور مصیبت زدہ انسان کی یہ کیفیات پیاس، دشت، بیاباں، قافلہ بے سروساماں جیسی علامات کے ذریعے واضح ہوتی ہیں۔ کر بلا کا استعارہ اپنی واضح معنویت کے ساتھ اس طور سلام میں ورود کرتا ہے کہ صدیوں کے درد کو اپنی مٹھی میں سمیٹ کر احساس کے طاق پر رکھ دیتا ہے۔ استعاراتی اظہار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اسے تخلیقی رچاؤ اور گہرے احساس سے برتا جائے تو اس کے امکانات لامحدود ہو جاتے ہیں اور گونا گوں مفہیم وجدان اور احساس کے در و بست میں سما جاتے ہیں۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ اس کا ظرف کس حد تک اور کس سطح پر اس سے کسب فیض کرتا ہے۔ قطعی تاریخی معلومات اور تخلیقی سطح پر کارفرما ہونے والے تاریخی احساس میں نازک سا فرق ہے۔ قطعی تاریخی معلومات شعور کا حصہ ہیں لیکن جب یہ شعری احساس میں ڈھلتی ہیں تو ذہن و شعور کی تمام سطحیں، یعنی تحت الشعور اور لاشعور بھی کارفرما ہوتے ہیں اور یہ پورے تخلیقی وجود اور اس کی سائیکس کا حصہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ کھرے شعری احساس میں ان کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ تمام کیفیتوں کا تعین ممکن نہیں رہتا۔

اس تناظر میں جدید سلاموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا استعاراتی انداز تاریخی معلومات کی قطعیت کو بین السطور میں رکھ کر خالص تخلیقی سطح پر ان کے جوہر کو ابھارتا ہے جسے وسیع احساساتی دائرے میں احساس کی نازک ترین سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسے آپ جدید شاعری کی تخلیقی اُچھ اور فنی ریاضت کا نام دے سکتے ہیں لیکن غور کیجئے سلام نگاری کو ایک طویل تاریخی اور تہذیبی عمل سے گزرنے کے بعد اور عہد بہ عہد اپنے احساس کی پرچھائیں ڈالنے کے بعد موجودہ عہد میں اپنے ابلاغ کی کیسی

نازک اور باریک سطح نصیب ہوئی ہے جہاں ہلکی سی لرزش حرف کس طرح دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرتی اور تخلیق کار کے خون جگر کو قطرہ قطرہ جذب کر کے کربلا کے گلشن کو شاداب نظر بنا دیتی ہے۔

دوسری طرف جدید سلاموں میں عصری جبر، انسان کی بے حسی اور بے ضمیری پر ماحمی انداز میں تعریض کر بلا کے تاریخی اور مکانی فاصلوں کو بھی سمیٹ لیتی ہے چنانچہ ان میں عہد حاضر کے انسان کی جاہ پرستی، مصلحت اندیشی اور تن آسانی پر گہری طنز ملتی ہے۔ ظلم و تعدی، بے حرمتی و تباہی اور بربادی، منافقت، مصلحت اندیشی اور الم و اندوہ کی سچائی و اصلیت کا سارا منظر نامہ اپنی گونا گوں استعاراتی و علامتی کیفیات کے ساتھ ظہور کرتا ہے جس میں احساس و اظہار کے سب رنگ نمایاں ہیں۔

واقعہ کربلا کا ایک رُخ وہ شامِ غریباں ہے جس میں زمانے بھر کے دُکھ، غم، الم اور کربناکیاں مٹی ہوئی ہیں۔ یہ سب درد انگیز احساسات آج کے پر آشوب ماحول میں ہمیں بے حد مانوس نظر آتے ہیں۔ سلام نگاروں نے ان کربناک احساسات کو تخلیقی سطح پر اظہار کی قوت عطا کر کے ایسے شعری پیکروں میں ڈھالا ہے کہ انسانی دُکھوں کی ازلی گرہیں کھل جاتی ہیں اور المیہ کربلا کی دردناک آواز انسان کو اپنے اندر سے سنائی دیتی ہے اور کربلا کا تاریخی درد لحدِ موجود سے ملکر درد انگیز بن جاتا ہے۔

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے سلاموں میں کردارِ حسین، واقعہ کربلا اور اس کے تعلقات ایک مسلسل اور مستقل موضوع کی حیثیت سے شعری رویوں کا حصہ بن کر آج بھی جاری و ساری ہیں۔ اس موضوع کی اتنی کیفیتیں اور صورتیں ہیں کہ ایک رنگ میں ہزار رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ شعرا کا حاسہ خیال صرف منطقی رشتوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ علامت اور استعارے کی کرامت سے تہ در تہ اور کثیر الابعاد جہتوں کی عقدہ کشائی کر کے کربلا کے منظر نامے کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ وہ وسعت اختیار کر کے مکاں سے لامکاں اور اس جہاں سے اُس جہاں کو محیط ہو جاتا ہے۔

جدید عہد کی سلام نگاری اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے جہاں اردو شاعری خصوصاً غزل کے حوالے سے تمام تخلیقی رمزیں اس پر آشکار ہو چکی ہیں۔ اس وقت ہر چھوٹا بڑا شاعر خواہ وہ غزل کہہ رہا ہے یا نظم لکھ رہا ہے، سلام نگاری سے بھی رجوع کر رہا ہے۔ اس کی جدت کاری اور فنی و معنوی اجتہاد و واقعات کربلا کے دروں میں چھپے ہوئے رموز اور فکری جہات پر نظر رکھتا ہے۔ استعارہ اس کے لئے ایک مقدس قطب نما کا درجہ اختیار کر گیا ہے اور وہ اس کے ذریعے ایسی ایسی سمتوں کی نشاندہی کرتا ہے جو اس سے پہلے نظروں سے اوجھل رہی ہیں۔ اس نئی صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ سلام نگاری کو ایک صنفِ سخن کے طور پر زندہ رہنے میں اب کوئی امر مانع نہیں ہے۔





غزل کی ہیئت میں لکھے گئے نامور شعراء کے سلام

(اذخواب)

(غزل کی ہیئت میں لکھے گئے نامور شعرا کے سلام) ^(۱)

سلام — میر انیس

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو
کمالِ فقر بھی شایاں ہے پاک بینوں کو
یہ خاکِ تخت ہے ہم بوریا نشینوں کو
لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکیں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامہٴ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمین کے خوشہ چینوں کو

یہ غل تھا، مہر نبوت پہ جب چڑھے حسین
جڑا ہے ایک انگٹھی پہ دو گئینوں کو

بجا ہے اس لیے اکبر سے تھا حسین کو عشق
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو

حسین جاتے ہیں بھر نبرد میداں میں
چڑھائے مثل ید اللہ آستینوں کو

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
ق

عَلَم لیے ہوئے عباس نکلے خیمے سے
چڑھا لیا علی اکبر نے آستینوں کو

مرہ یہ طرفہ ہے مضمون دستیاب نہیں
مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

غلط یہ لفظ وہ بندش بریٰ یہ مضمون ست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

فلک پہ جب ہوئی آواز اِربوا دم صبح
تو غازیوں نے رکھا مرکبوں پہ زینوں کو

لگا دغا میں مچنے لہو جو قبضے سے
چڑھا لیا شہر والا نے آستینوں کو

دہان کیسہ زر بند رکھ پر اے منعم!
خدا کے واسطے واکر جبیں کی چینوں کو

انہیں کو آج نہیں بیٹھنے کی جا ملتی
معاف کرتے تھے جو لوگ کل زمینوں کو

یہ زاروں کو ملیں سرفرازیاں ورنہ
کہاں نصیب کہ چو میں ملک جبینوں کو

سجایا ہم نے مضامیں کے تازہ پھولوں سے
بسا دیا ہے ان اُجڑی ہوئی زمینوں کو

تنوں پہ کھاتے تھے بڑھ بڑھ کے زخم تیغ و سناں
بہادروں نے سپر کر دیا تھا سینوں کو

بڑھے جو غیر خدا اور سمت دستِ طلب
تو باندھ دوں میں گریاں سے آستینوں کو

کہاں تھا خر کدھر آیا یہ بخت یاور تھا
نثار شہ پہ ہوا مار کر لعینوں کو

لہد بھی دیکھے اُن میں نصیب ہو کہ نہ ہو
کہ خاک چھان کے پایا ہے جن زمینوں کو

زوالِ طاقت و موئے سفید و ضعفِ بصر
انہیں سے پائے بشر موت کے قرینوں کو

نہیں خبر انہیں مٹی میں اپنے ملنے کی
زمین میں گاڑ کے بیٹھے ہیں جو دُفینوں کو

غضب ہے اہلِ ستم اس میں جائیں درانہ
جس آستان پہ ملائک رکھیں جبینوں کو

نکلتے چاہ سے برسوں نہ حضرت یوسف
جو دیکھتے کبھی زہرا کے مہ جبینوں کو

کبھی نہ تھا یہ حلاطم محیط دنیا میں
خدا ہی پار لگائے گا ان سفینوں کو

خبر نہیں انہیں کیا بندوبست پختہ کی
جو غصب کرنے لگے غیر کی زمینوں کو

جہاں سے اٹھ گئے جو لوگ پھر نہیں ملتے
کہاں سے ڈھونڈ کے اب لائیں ہم نشینوں کو

نظر میں پھرتی ہے وہ تیرگی وہ تنہائی
لحد کی خاک ہے سرمہ مآل بینوں کو

وہ دین حق ہے ہمارے نبی کا دین میں
کہ جس نے کر دیا منسوخ سارے دینوں کو

دکھائی تیغ ید اللہ کی ساعدوں نے چمک
علیؑ کے شیر نے اُلٹا جو آستینوں کو

بشر کو چاہیے دنیا میں اس کے حُسن سے عشق
کہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آگینوں کو



سلام — مرزا دبیر

ہے عکس گیسوئے زرخ اکثر کہاں کہاں
 سہل کہاں کہاں ہے گل تر کہاں کہاں
 کوفے میں کربلا میں بقیعی میں طوس میں
 مدفون ہوئے بتوں کے دلبر کہاں کہاں
 گلزار میں جناں میں ختن میں تار میں
 پھیلی ہے نکبت گل حیدر کہاں کہاں
 گل میں شفق میں لعل میں خورشید صبح میں
 ہے رنگ خون کشہ خنجر کہاں کہاں
 صفین میں جہل میں احد میں تبوک میں
 تنہا لڑے ہیں فاتح خیمہ کہاں کہاں
 خورشید میں فجر میں ستاروں میں برق میں
 ہے نور آفتاب پیہر کہاں کہاں
 تنور میں شجر میں خزانے میں طشت میں
 تھا ایک مصحف سر سرود کہاں کہاں
 فرق عدو میں سینے میں جوشن میں زین میں
 در آئی ذوالفقار دوپیکر کہاں کہاں
 بغداد میں عراق میں خیبر میں شام میں
 تھے جمع قتل شہ کو ستم گر کہاں کہاں

یثرب میں، نینوا میں، یمن میں، مدینہ میں
 تھا قتلِ شہ کا شیون و محشر کہاں کہاں
 دنیا میں، آخرت میں، ستر میں، بہشت میں
 ہے اختیارِ حیدرِ صفر کہاں کہاں
 دربار میں، خرابے میں، جنگل میں، شہر میں
 درد! گئی حسین کی خواہر کہاں کہاں
 بستی میں، جنگلوں میں، ترائی میں، کوہ میں
 شہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں
 دریا میں، قتل گاہ میں، نیساں میں، چاہ میں
 حضرت نے ڈھونڈا لاشہ اکبر کہاں کہاں
 مقتل میں، خیمہ گاہ میں، زنداں میں، راہ میں
 روئے پدر کو عابدِ مضطر کہاں کہاں
 کوچوں میں اور دھوپ میں، شہروں میں، دشت میں
 مسلم کا کھینچا لاشہ بے سر کہاں کہاں
 غربت میں، گھر میں، قبر میں، محشر میں اے دیر!
 آئے مدد کو ساقی کوثر کہاں کہاں



سلام — نجم آفندی

ملت کی جو نبضوں میں تھوڑی سی حرارت ہے
 اے اسوۂ شبیری * یہ تیری بدولت ہے

یہ کون تیرے فخرِ مصروفِ عبادت ہے
 سر بھی ہے جسے دینا سجدہ کی بھی خدمت ہے
 جس طرزِ حکومت کو شہر نے ٹھکرایا
 ہر قوم کی ٹھوکر میں وہ طرزِ حکومت ہے
 شہر نے فکروں کے انداز بدل ڈالے
 کیا ذہن کی قدرت ہے کیا فکر میں قوت ہے
 دولت نے بہایا تھا، خوں آلِ پیہر کا
 اب دامنِ دنیا میں سہی ہوئی دولت ہے
 غم اور بھی ہیں لیکن سب ”میکڈرڈ“ والے
 غم سبِ پیہر کا اک ٹھوس حقیقت ہے
 دم بھر کو نہ تھی حاجت شہر کو دنیا کی
 شہر کی دنیا کو ہر وقت ضرورت ہے
 جہم اس میں تصور بھی بے جا ہے برائی کا
 غم سبِ پیہر کا جس دل کی امانت ہے



سلام — آلِ رضا

دل کی زینت دردِ حسینی سر کی زینت پائے حسین
 آنکھ کی زینت خالص آنسو لب کی زینت ہائے حسین
 مذہب و ملت کے جھگڑے کیا، مرکبِ حق جب ایک رہا
 جیسے ہر انسان کے دل میں ’قدرِ شہادت‘ جائے حسین

آج بھی گویا بات ہے کل کی صدیوں سے عالم ہے یہی
وقت کو دیکھو جھوم کے آیا چوم کے گزرا پائے حسین

درسِ حسینی اللہ اللہ کیوں نہ سمجھ میں آ جائے
اپنے خدا کی جس عظمت کو سر دیکر سمجھائے حسین

دل سے عزاداروں کے پوچھو غم کی لذت غم پر ناز
سب کو دعوت ہر دم چہ چاہا گھر میں ہمارے آئے حسین

ضبطِ تشنہ لب کی قسم ہے بہتے دریا سچ کہنا
اکثر تجھ کو دیکھا ہو گا اشک کبھی بھر لائے حسین

اپنے اپنے صنف و سن کے کیسے نمائندے نکلے
کرب و بلا کے تپتے بن میں چھانٹ کے جن کو لائے حسین

جتنا کہنا چاہا شہ نے کہہ پاتے تو کیا ہوتا
صحنِ عالم میں نہ سلایا جتنا کہنے پائے حسین

خون سے دو معصوموں کے تھی حدِ شہادت کی تکمیل
سب کے آخر اپنے سے پہلے اصغر تم کو لائے حسین

حکم فرشتے پاتے ہوں گے دیکھو شانِ عبادت کی
تاجِ شہادت پہنا دینا سجدے میں جب جائے حسین

شام و کوفہ منزل منزل سر تھا نیزے پر ہمراہ
زینب کا کیا ساتھ دیا تھا زینب کے ماں جائے حسین

خود ہے امانت کا یہ تقاضا شہ کے امانت داروں سے
جو کچھ شانِ حسینیٹ بھی جس دم لب پر آئے حسین

حق کی حمایت دل کی طاقت صبر و شجاعت استغنا
سب کچھ اس کو مل جاتا ہے جس کو رضا مل جائے حسین

سلام — حسرت موہانی

امام برحق اہل رضا سلام علیک
 شہیدِ معرکہ کربلا سلام علیک
 گلِ مراد ولایتِ حسینِ ابنِ علی
 تئمہ شرفِ مصطفیٰ سلام علیک
 ثبوت یہ ہے کہ نورِ شہادتِ کبریٰ
 تری جہیں سے نمایاں ہوا سلام علیک
 عبث ہے اور کہیں راہِ صبر و حق کی تلاش
 تری مثال ہے جب رہنما سلام علیک
 ترے طفیل میں حسرت بھی ہو شہیدِ وفا
 یہی دُعا ہے یہی دعا سلام علیک



سلام — مولانا ظفر علی خان

مسلمانوں کے دل میں جذبہٴ اسلام باقی ہے
 قدحِ خواروں کے حق میں بادۂ گلفام باقی ہے
 یزیدی اور زیادِ یاد بھی آتے نہیں ہم کو
 مگر اب تک حسین ابن علی کا نام باقی ہے
 سبق اس نے دیا ہم کو حیاتِ جاودانی کا
 جنابِ فاطمہ کی آہ کا انجام باقی ہے

وہ من یقتل کی سرفی ہے حدیث نامہ جاں پر
 خدا کی طرح اس کا آخری پیغام باقی ہے
 حسین ابن علی کے قتل کا مقصد نہ ہم سمجھے
 یہ ہم پر آج تک اسلام کا الزام باقی ہے

❖

سلام — جوش ملیح آبادی

کیا نماز شاہ تھی ارکان ایمانی کے ساتھ
 دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ
 حشر تک زندہ ہے تیرا نام اے ابن رسولؐ
 کر چکا ہے تو وہ احساں نوع انسانی کے ساتھ
 ان کے آگے صولت دنیا کا ذکر او ابن سعد
 کھیلتی ہے جن کی ٹھوکر تاج سلطانی کے ساتھ
 باندھتی ہو کیا ہوا اے اہرمین کی آندھیا!
 کھیلنا آساں نہیں ہے شمع یزدانی کے ساتھ
 ہمت معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر
 یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ
 آنکھ میں آنسو ہوں سینے میں شرار زندگی
 موجہ آتش بھی ہو بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
 اہل بیتؑ پاک کی ہر سانس کو اے مدعی
 ہاں ملا کر دیکھ لے آیات قرآنی کے ساتھ

جو جس ہم ادنیٰ غلامانِ علی مرتضیٰ
حمکت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ



سلام — ناصر کاظمی

زباں پہ نام امامِ اناام لایا ہوں
جواب جس کا نہیں وہ سلام لایا ہوں

نہ مئے نہ خم نہ صراحی نہ جام لایا ہوں
فقط پیامِ شہ تشنہ کام لایا ہوں

بدل دیا ہے شہیدوں کے خوں نے رنگِ فلک
نئی زمین نئے صبح و شام لایا ہوں

فراستِ خونِ جگر میں ڈبو کے نوکِ قلم
پیامِ دردِ پئے خاص و عام لایا ہوں

زمینِ دل پہ مری در فشاں ہے کرب و بلا
میں تیغِ نور سرِ اوجِ شام لایا ہوں

ہلالِ ماہِ محرم کو اشکِ خوں دے کر
فروغِ جلوۂ ماہِ تمام لایا ہوں

بہت عزیز ہے رنگِ غزل مجھے ناصر
غزل کا سوزِ برنگِ سلام لایا ہوں



سلام — رئیس امر و ہوی

نازاں ہیں رنگ و بو پہ بہت نودمیدہ پھول
اے قلب داغ داغ! دکھا چیدہ چیدہ پھول

کب ہیں بقدر شوق یہ دیدہ شنیدہ پھول
یارب مجھے نصیب ہوں ناآفریدہ پھول

یہ موسم بہار ہے یا موسمِ عزا
غنجے ہیں سینہ چاک گریباں دریدہ پھول

خود چن لئے مشیت پروردگار نے
اے کربلا کی خاک ترے برگزیدہ پھول

ہیں آج بھی بہار گلستان عاشقی!
گلزارِ فاطمہ کے جراحت رسیدہ پھول

تو اصغر شہید کا اک استعارہ ہے
پھولا ہے رنگ و بو پہ گل نو رسیدہ پھول

یہ کس ”قتلِ گریہ“ پہ شبنم ہے اشک ریز
کس تشنہ لب کی یاد میں ہیں آبدیدہ پھول

گلچیں جو نوچتا ہے گلوں کو تو کیا گلہ؟
بہتر ہے فصل گل میں رہیں برگزیدہ پھول

گلزارِ حق کا دعویٰ غارت گری یزید؟
اتنا نہ اپنے ظلم پہ او شوخ دیدہ پھول

جب سے ہوا ریاضِ حسینیٰ خزاں پسند
گلشن میں پڑھ رہے ہیں خزاں کا قصیدہ پھول

گلدستہ مزار شہیداں کے عشق میں
 شاخوں سے کیا عجب ہے اگر ہوں کشیدہ پھول
 کس باغ بے خزاں کا لیا نام اے صبا
 شاخیں ہیں سرنگوں تو ادب سے خمیدہ پھول
 پھولوں یہ اعتبار غلط ہے کہ آخرش
 بوئے رمیدہ پھول ہیں سنگ پریدہ پھول
 شبنم کی آنکھ سے کوئی دیکھے تو صبح دم
 کیا ہیں؟ سوائے قطرۂ اشک چکیدہ پھول
 اللہ رے میرے ذہن تکلف کی تازگی
 کھلتے ہیں اے رئیس! یہ رنگ جدیدہ پھول



سلام — ظہیر کاشمیری

ذروں میں عکس ریز رخ ماہتاب ہے
 صحرا میں خیمہ زن پسر بوتراپ ہے
 جلوے بکھر رہے ہیں جمالِ رسولؐ کے
 خیمہ گہ بتوں ہمہ آفتاب ہے
 ہیں خوف سے نفیم کے چہرے اڑے ہوئے
 جنگاہ میں حسینؑ جلالت مآب ہے
 ہر تیغ اپنی کاٹ میں ہے منج ذوالفقار
 ہر تیغ زن کے ساتھ علیؑ ہمرکاب ہے

جس جس جگہ امامِ زمن کے ہیں نقشِ پا
 ہر ذرہ اس سواد کا گردوں جناب ہے
 دن کا بدن ہے ظلم کے دجوں سے داغ داغ
 زخموں سے چور چور زرخِ آفتاب ہے
 دریا بھی سیلِ گریہ بنا ہے بوقتِ شام
 ریگِ رواں بھی آئینہٗ اضطراب ہے
 جاں دے کے زندگی کو ابد آشنا کیا
 تاریخِ رزم میں یہ نیا انقلاب ہے
 ہر زخمِ لا الہ کی تفسیر ہے ظہیر
 جسمِ حسینِ آئیے اُم الکتاب ہے



سلام — قتیلِ شہنائی

غم کوئی بھی نہ ملا ہم کو ترے غم کی طرح
 زندگی ہم نے گزاری ہے محرم کی طرح
 اپنی خوشیوں میں بھی شامل ہے تری یادِ حسین
 اپنے ہونٹوں پہ تبسم بھی ہے ماتم کی طرح
 میں جو رویا تو کچھ ایسا مجھے محسوس ہوا
 روئی ہر چیز مرے دیدہٗ پرہم کی طرح
 جب کبھی گردشِ دوراں نے چلایا کوئی تیر
 بھر دیئے زخمِ تری یاد نے مرہم کی طرح

شام عاشور غم شاہ سے رنجور ہوں میں
 اپنے سینے سے لگا لے کسی ہدم کی طرح
 زندگی اپنی کئی اشک فشانی میں قتل
 ہم تو ہیں پھول پہ روتی ہوئی شبنم کی طرح
 ❖

سلام — عبدالحمید عدم

جرات و کردار کی یاد بھاری کو سلام
 اے غرور فقر تیری شہریاری کو سلام
 اے جسارتِ آدمیت اور شرافت کے امام
 تیرے ہر موقع ادائے جاں نثاری کو سلام
 اصل اثاثہ دھن نہیں، تابانی کردار ہے
 اے اثاثہ دار تیری مال داری کو سلام
 عزتِ جمہور کا پوتا شمرود ہو گیا
 تیرے ہاتھوں کی مبارک آبیاری کو سلام
 موت سے پہلے نماز اور وہ بھی صحنِ حرب میں
 اس شعورِ فرض، اس سجدہ گزاری کو سلام
 ریت پر آیاتِ خون سے آیتیں کرنا رقم
 اس انوکھی شان کی قرآن نگاری کو سلام
 عقل دیتی ہے عدم وقتی سیاست کو فروغ
 عشق کرتا ہے چلن کی استواری کو سلام

سلام — قیصر بارہوی

عطرِ کردار سے جب اہل نظر مہکے ہیں
 بستی بستی میں بہار آئی ہے گھر مہکے ہیں
 در و دیوار گلستاں کی صباحت کیا ہے
 شام زنداں میں نقیبانِ سحر مہکے ہیں
 نذرِ باطل نہ کرو فکر و نظر کی حرمت
 اسی خوشبو سے تو اربابِ ہنر مہکے ہیں
 اہل آیات سے آیات کی خوشبو نہ گئی
 خاکِ مقتل پہ بدن نیزوں پہ سر مہکے ہیں
 مشعلِ راہ بنے ان کی طبیعت کے گلاب
 شوقِ منزل میں جو دورانِ سفر مہکے ہیں
 زخمِ دل، سوزِ جگر، شامِ غریباں کی زمیں
 کس قیامت میں گلِ دیدہ تر مہکے ہیں
 روحِ کونین میں عاشور کے سرسبز شہید
 جنتِ اصل سے یہ برگ و ثمر مہکے ہیں
 چند پھولوں نے کچھ اس طرح ضیا بندی کی
 آئینے بول اٹھے آئینہ گر مہکے ہیں
 یہ گلستانِ شہادت کا شرف ہے قیصر
 کوئی پتہ نہ رہا پھر بھی شجر مہکے ہیں

سلام — سیف زلفی

حق گو گو جب طریقہ اظہار آ گیا
اتنا ہوا بلند سر دار آ گیا

وہ شخص کائنات کی وسعت پہ ہے محیط
جس کی سمجھ میں نقطہ پرکار آ گیا

قربانی حسین کا معیار دیکھ کر
انسان کی سرشت میں آثار آ گیا

تھرا اُٹھی ہے شب کہ محمدؐ کا نور عین
لیکر حسین صبح کے آثار آ گیا

ہوتی ہے گفتگو جو حیات حسین پر
وہ سامنے رسولؐ کا کردار آ گیا

پڑھ کر رجز حسین علیہ السلام کے
میرے قلم میں شعلہ اظہار آ گیا

پھر یوں ہوا کہ زیت کے اُبلے جہاز پر
ہم اڑ رہے تھے موت کا کہسار آ گیا

اوروں کو مل گیا ہے لباسِ سخنِ وری
میرے بدن پہ خلعتِ فنِ کار آ گیا

وہ آ گئی نجف سے ہوا زندگی لیے
وہ کربلا سے ابر گھر بار آ گیا

مجھ سے گناہ گار سر ذکر کربلا
اک بار رو دیا تو انہیں پیار آ گیا

بیانہ یزید کو ٹھوکر سے مار کر
 مے خانہ حسین کا مے خوار آ گیا
 سنتے ہیں آفتاب شہادت کے تذکرے
 آنکھوں میں ایک اشک ضیا بار آ گیا
 پھیلا تو کوہ و دشت کی وسعت بھی پہنچ تھی
 سنا تو زیر سایہ دیوار آ گیا
 اصغر کو رن میں دیکھ کے ہاتھ نے دی صدا
 شیر کے جہاد کا شہکار آ گیا
 اب مجھ میں کوندتی ہیں شجاعت کی بجلیاں
 بن کر وہ میرے خون کی لکار آ گیا
 لپکا حسین سیف صداقت لیے ہوئے
 جب تخت پر یزید ریاکار آ گیا



سلام — حفیظ تائب

رموزِ عشق و محبت تمام جانتا ہوں
 حسین ابنِ علی کو امام جانتا ہوں
 انہی کے در کو سمجھتا ہوں محورِ مقصود
 انہی کے گھر کو میں دارالسلام جانتا ہوں
 میں ان کی راہ کا ہوں ایک ذرہ ناچیز
 کہوں یہ کیسے کہ ان کا مقام جانتا ہوں

مجھے امام نے سمجھائے ہیں نکاتِ حیات
 سوائے کفر میں جینا حرام جانتا ہوں
 نگاہ کیوں ہے مری ظاہری وسائل پر
 جو خود کو آلِ نبیؐ کا غلام جانتا ہوں
 میں جان و مال کو پھر کیوں عزیز رکھتا ہوں
 جو خود کو پیروِ خیرالانام جانتا ہوں
 شکارِ مصلحت ویاس کیوں ہوں پھر تائب
 جو اس کئے ہوئے سر کا پیام جانتا ہوں

❖

سلام — شہرت بخاری

لاکھ امکان روزگار میں تھے
 روز و شب کس کے اختیار میں تھے
 وہم ثابت ہوئے گل و لالہ
 خار ہی دامنِ بہار میں تھے
 رک گئی گردشِ فلک گویا
 ایسے لمحے بھی اعتبار میں تھے
 مشکِ بارِ آج بھی ہے جس سے شام
 ایسے آہو بھی مرغزار میں تھے
 جس کے اٹھنے سے اٹھ گیا کیا کیا
 لوگ ایسے بھی اس دیار میں تھے

اے فلک خاک میں ملایا جنہیں
 یہ گھر کون روزگار میں تھے؟
 وہ کہ دوشِ نبیؐ کی زینت تھے
 اپنی اُمت ہی کے حصار میں تھے
 ان کے دربانِ جبریلِ امیں
 ماہ و خورشید کس شمار میں تھے
 ان کی تنہا روی کے کیا کہنے
 سینکڑوں قافلے غبار میں تھے
 نعلِ اکبرؐ اٹھائی جب شہ نے
 لختِ دل چشمِ اشک بار میں تھے
 خونِ احمدؐ کی اتنی اُرزانی
 آسمان کس کے انتظار میں تھے
 شعر بن کر اہل پڑے شہرت
 اشک جو قلب بے قرار میں تھے



سلام — محسن نقوی

لے زندگی کا خمس علیؑ کے غلام سے
 اے موت آ ضرور مگر احترام سے
 کچھ خلد بچ رہی تھی سو جاں دے کے لے گیا
 آیا تھا خُر بھی ورنہ کسی اور کام سے

خاکِ شفا جہیں پہ لبوں پر علی کا ذکر
 محشر میں جاؤں گا میں عجب اہتمام سے
 شہر کو نماز نہ پیاری ہو کس لئے؟
 ہے ابتدا اذان کی اکبر کے نام سے
 دنیا کا مال و زر غم شہر پر نثار
 ماتم ہمیں عزیز ہے عیشِ دوام سے
 دریا ہے دُورِ پیاس نے ٹھکرا دیا اسے
 کوثر قریں ہے تشنہ لبوں کے خیام سے
 محسنِ لحد میں کیوں نہ فرشتے پڑھیں دُرود
 بہلا رہا ہوں ان کو میں تازہ سلام سے



سلام — ڈاکٹر حسن رضوی

حق کی صداقتوں کی نشانی حسین ہے
 دنیا میں انقلاب کا بانی حسین ہے
 صحرا میں اس کے صبر کی تحریر میں پڑھوں
 دریا کی موجِ پیاس ہے پانی حسین ہے
 سیرت ہے فاطمہ کی تو صورت علی کی ہے
 دنیا میں مصطفیٰ کی نشانی حسین ہے
 چھینے لبو کے لفظ کی صورت ہیں خاک پر
 ہے کربلا کتابِ کہانی حسین ہے

دشمن کو جس نے اپنے لہو سے شکست دی
وہ مرد حق، وہ حیدرِ ثانی حسین ہے
رضوی ہر ایک لفظ ہے اس کا دیا ہوا
دریا کی موج موجِ روانی حسین ہے



سلام — احمد ندیم قاسمی

کبھی عکس تیری شبیہ کے، مرے دل میں ہیں، مرے پاس ہیں
ترا صدق تیرا وجود ہے، ترے زخم تیرا لباس ہیں
وہ ہیں لفظ کتنے گراں بہار، جو نبھا سکیں ترا تذکرہ
مرے آنسوؤں کو قبول کر، یہ مرے حروفِ سپاس ہیں
یہ خیال ہے نہ قیاس ہے، ترا غم ہی میری اساس ہے
جنہیں لو لگی ہو حسین کی، وہی میرے درد شناس ہیں
جسے حرفِ حق ہی قبول ہو، یہی جس کا اصلِ اصول ہو
جو نہ بک سکے، جو نہ ٹھک سکے، اسے کربلائیں ہی راس ہیں
وہ جو نورِ چشمِ بتول تھا، جو گلِ ریاضِ رسول تھا
اسی ایک شخص کے قتل سے، مری کتنی صدیاں اداس ہیں



سلام — منیر نیازی

خوابِ جمالِ عشق کی تعبیر ہے حسین
شامِ ملالِ عشق کی تصویر ہے حسین

حیراں و بے یقینی اہل جہاں سے ہے
 دنیا کی بے وفائی سے دلگیر ہے حسین
 یہ زیت ایک دشت ہے لا حد و بے کنار
 اس دشتِ غم پہ ابر کی تاثیر ہے حسین
 روشن ہے اس کے دم سے الم خانہ جہاں
 نور خدائے عصر کی تنویر ہے حسین
 ہے اس کا ذکر شہر کی مجلس میں رہنا
 اُجڑے نگر میں حسرتِ تعمیر ہے حسین

❖

سلام — ڈاکٹر وزیر آغا

بیاض صحرا کھلی پڑی تھی
 کوئی عبادت نہیں لکھی تھی
 حسین آئے تو لفظ اُترے
 عجیب جل تھل سی روشنی تھی
 فرات کے پاس کچھ نہیں تھا
 ندی تو آنکھوں سے بہہ رہی تھی
 پلک پلک تھا جو شورِ شبنم
 فضا گئینوں سے بھر گئی تھی
 وہ کون تھا جس نے کشتِ ویراں
 تمام تر لالہ زار کی تھی

وہ جس نے بو کر لہو کی بوندیں
زمیں گلابوں سے ڈھانپ لی تھی



سلام — وحید الحسن ہاشمی

شب حیات میں تاثیر روشنی کیا ہے؟
چلو حسین سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہے
غم حسین ہے پہچان آدمیت کی
حسین ہی پہ نہ رویا تو آدمی کیا ہے
جو دشت یاس کا پیاسا ہے کیا خبر اس کو
قریب نہر مسافر کی تشنگی کیا ہے
حبیب ابن مظاہر تمہارے صدقے میں
کھلا یہ کرب و بلا میں کہ دوستی کیا ہے
تلاشِ سجدۂ حق میں ادھر ادھر نہ پھرو
جبین شاہ کہے گی کہ بندگی کیا ہے
بقائے نسل بشر کا خیال تھا ورنہ
حسین عرش ہلا دیں شہنشی کیا ہے
علی کے علم کا کرنے چلا ہے وہ دعویٰ
جسے خبر ہی نہیں ہے کہ بوذرجمی کیا ہے
بتا رہا ہے ریاست کو حُر کا ٹھکرانا
کرے ضمیر ملامت تو نوکری کیا ہے

بس ایک متقل شہر کی زمیں ہے جہاں
بجھے چراغ بتاتے ہیں روشنی کیا ہے



سلام — افتخار عارف

شرف کے شہر میں ہر بام و در حسین کا ہے
زمانے بھر کے گھرانوں میں گھر حسین کا ہے
فراٹ وقت رواں! دیکھ سوئے مقل دیکھ
جو سر بلند ہے اب بھی وہ سر حسین کا ہے
زمین کھا گئی کیا کیا بلند و بالا درخت
ہرا بھرا ہے جو اب بھی شجر حسین کا ہے
سوال بیعت شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسین کا ہے
کہاں کی جنگ کہاں جا کے سر ہوئی ہے کہ اب
تمام عالم خیر و خبر حسین کا ہے
محبوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسین کا ہے



سلام — سید مشکور حسین یاد

غم حسین سمندر ہے مہرباں جو ہوا
ہر ایک دل میں اُترتا ہے بیکراں جو ہوا

غمِ حسین سے ہر صدقِ رزق پاتا ہے
 غمِ حسین سخاوت کا آساں جو ہوا
 غمِ حسین سے ملتی ہے نعمت ہر فخر
 غمِ حسین شرافت کی داستاں جو ہوا
 غمِ حسین بچاتا ہے دل کو غفلت سے
 طلوعِ جاں جو ہوا صبحِ ضوفشاں جو ہوا
 غمِ حسین سے بڑھتے ہیں حوصلے دل کے
 غمِ حسین عزائم کی کھکشاں جو ہوا



سلام — ڈاکٹر عاصی کرنالی

رشتک سے دیکھے ہمیں دنیا کہ کیا رکھتے ہیں ہم
 اک مدینہ، اک نجف، اک کربلا رکھتے ہیں ہم
 تاج کیا شے ہے کہ تیری ضو ہمارے سر پہ ہے
 تخت کیا شے ہے کہ تیرا نقش پا رکھتے ہیں ہم
 وقت کے ہاتھوں میں رکھتے ہیں علمِ عباس کا
 زندگی کے سر پہ زینب کی ردا رکھتے ہیں ہم
 اپنی اک تہذیبِ غم ہے اپنی اک تاریخِ درد
 ایک آئینِ وفا اس کے سوا رکھتے ہیں ہم
 ان کی یاد آتی ہے اور نمناک ہو جاتی ہے آنکھ
 چشم و دل کے درمیاں اک ماجرا رکھتے ہیں ہم

قائم و دائم ہے ایک غم سے اپنی زندگی
آنکھ میں اک چشمہ آب بٹا رکھتے ہیں ہم



سلام — محسن احسان

اتریں گے روشنی میں سحر روشنی کا ہے
جو شام میں لٹا ہے وہ گھر روشنی کا ہے
ان کے جلو میں لہر منور کی تابشیں
جو تیرہ بخت ہیں انہیں ڈر روشنی کا ہے

بویا تھا بیج ظلمت شر کا یزید نے
لیکن نہال غم پہ ثمر روشنی کا ہے
ہر ہاتھ میں ہے پرچم ایمان و آگہی
آفاق پر کھلا ہوا در روشنی کا ہے
فریاد کر رہی ہیں بہشتی نجابتیں
دست اجل میں لخت جگر روشنی کا ہے
محسن سپاہیوں کا تجھے خوف کس لئے
تیرے کلام پر تو اثر روشنی کا ہے



سلام — فارغ بخاری

حسین نوع بشر کی ہے آبرو تجھ سے
حدیث حرمت انساں ہے سرخرو تجھ سے

ملایا خاک میں تو نے سنگروں کا غرور
 یزیدیت کے ارادے ہوئے لہو تجھ سے
 بہت بلند ہے تیری جراحوں کی مہک
 صداقتوں کے چمن میں ہے رنگ و بو تجھ سے
 ترے لہو کا یہ ادنیٰ سا اک کرشمہ ہے
 ہوئی ہے عام شہادت کی آرزو تجھ سے
 اسی طرح ہے وہ تیرے پیام کا جادو
 چلی ہے قرون کی رفتار کو بکو تجھ سے
 وہ باغیانہ خیالات اب بھی زندہ ہیں
 ترے گھرانے میں ملتے ہیں ہو بہو تجھ سے
 کبھی نہ جبر کی قوت سے دب سکا فارغ
 ملی ہے ورثہ میں یہ سرکشی کی ٹو تجھ سے



سلام — خاطر غزنوی

پھر نئی رُت دورِ باطل کے لئے خنجرِ بنی
 سرخیِ خونِ حسینِ ابنِ علی رہبرِ بنی
 گلستانِ فاطمہ کی زخمِ خوردہ ہوئے گل
 عزت و ناموسِ ملت کے لئے چادرِ بنی
 ہر برس ماہِ محرم میں ہوئی تعمیرِ دل
 اک نئی دیوارِ گریہ روح کے اندرِ بنی

قطرہ ہر اشک راہوں کا نشاں بنتا گیا
 آہ سوزاں سینہ احساس کا نشتر بنی
 گردشوں میں مثلِ ماہ و روز و شب ہے آج تک
 بے کسوں کی تشنگی تھی درد کا ساغر بنی
 اے شکستہ بال و پر والو انہیں بھی دیکھنا
 جرأتِ پرواز جن کے واسطے شہپر بنی
 کربلا کے معرکے نے کر دیا خاطرِ عیاں
 عظمتِ انساں لہو کی راہ سے ہو کر بنی



سلام — خورشیدِ رضوی

اشک میں کھل گیا لہو سرخ ہوا فضا کا رنگ
 عرصہ جاں پہ چھا گیا پھر وہی کربلا کا رنگ
 کس سے بھلا وہ ٹل سکے عزم ہو جب حسین کا
 کون اسے بدل سکے رنگ ہو جب خدا کا رنگ
 اس نے بجھا دیا چراغ تا رہے سہل و سازگار
 ظلمتِ پردہ دار میں بدلی ہوئی ہوا کا رنگ
 جب بھی خیال آ گیا اس سرِ فراز کا
 صفحہ دل سے اڑ گیا مصلحت و ریا کا رنگ
 دھل نہ سکے گا تا ابد اب کفِ دستِ شام سے
 خونِ دلِ شہید کا رنگ نہیں حتا کا رنگ

صرف کیے سخن ہزار پھر بھی رہا مآل کار
مہر بلب حروف پر حسرت دعا کا رنگ



سلام — خالد احمد

تم تو سپر سپر شبانِ جناب ہو
ہم قامتِ تکبیر ہو ہم شکلِ ازاں ہو

تم رایتِ اظہار کی رخشندہ علامت
تم غایتِ آزادی تحریر و بیاں ہو

نیزے کی اُنی تو دلِ احمد میں گڑی ہے
تم لوگ فقط سر بہ سر نوکِ سناں ہو

خیمہ تو کہا، خیمے کا پردہ نہ ہلا تھا
آواز سی آئی تھی ”مرے لال کہاں ہو؟“

باؤ سے کہا تھا یہ حسین ابنِ علی نے
تم سے کوئی شکوہ نہیں مقتول کی ماں ہو

اے ماتمی پور میرِ شامِ غریباں
اب چارہ بے چارگی دل زدگاں ہو

خالد کی نہ سُن حکم ”خداوند سخن“ سُن
اے دجلہ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو



سلام — جعفر شیرازی

نہ اس طرح کے مسافر نہ قافلہ ایسا
 سفر ہوا نہ کوئی اور کربلا ایسا
 گواہی دیتے رہے ہیں لبِ رسولؐ کے نقش
 زمیں پہ سجدے میں کثرتا رہا گلا ایسا
 فلک کا خون شہیداں پہ شق ہوا سینہ
 زمین پر مگر آیا نہ زلزلہ ایسا
 ہر اک مقام سے گزری ہے سرخرو ہو کر
 حسینؑ پہ جب آیا ہے مرحلہ ایسا
 شہنشی کی اسیری کا نام ہے زینبؑ
 جلال ایسا، غضب ایسا، حوصلہ ایسا
 دکھا دے حق و باطل جدا جدا کر کے
 حسینؑ جیسے تھے ہوگا کوئی بھلا ایسا
 حسینؑ سے ہی اسلام زندہ ہے جعفر
 کہ ہم تو آج بھی کہتے ہیں برملا ایسا



سلام — حسین سحر

خلافِ جبر اٹھی ہے حسینؑ کی آواز
 نشانِ عزمِ بنی ہے حسینؑ کی آواز

نہ سر جھکاؤ کبھی ظلم و جور کے آگے
 جہاں میں گونج رہی ہے حسین کی آواز
 کوئی بھی دور ہو کیا ہی عہد ہو لیکن
 ہمیشہ تازہ رہی ہے حسین کی آواز
 ہوائے شام جو گزری ہے سسکیاں لے کر
 ضرور اُس نے سنی ہے حسین کی آواز
 نہ کیسے سن کے اُسے عرش کانپ کانپ اٹھے
 لہو میں ڈوبی ہوئی ہے حسین کی آواز
 مہکتی تھی جو کبھی مسجد نبیؐ میں سحر
 سناں پہ آج کھلی ہے حسین کی آواز



سلام — جعفر بلوچ

انساں کی عظمت کا علم ہے تیری یاد حسینؑ..... زندہ باد حسینؑ
 تا بہ ابد ہر انساں دے گا تجھ کو داد حسینؑ..... زندہ باد حسینؑ
 ایسی صورت ایسی سیرت کسی نے پائی ہے؟..... کیا یکتائی ہے
 پاک سرشت و پاک ضمیر و پاک نہاد حسینؑ..... زندہ باد حسینؑ
 دیں میں ملوکیت جب آئی تو نے اسے ٹوکا..... تو نے اسے روکا
 اور اس راہ میں تو نے جھیلی ہر بیداد حسینؑ..... زندہ باد حسینؑ
 تیرے خوں سے اسلامی آئین فروزاں ہے..... دین فروزاں ہے
 کتنا البیلا ہے تیرا رنگ جہاد حسینؑ..... زندہ باد حسینؑ

تو نے خالق کو شان تسلیم دکھانی تھی ورنہ کس کی تھی؟
یہ دنیائے آتش و آب و خاک و باد حسین زندہ باد حسین
خود اس راہ پہ چلنے والے سشدر و حیراں ہیں تجھ پر نازاں ہیں
طرز شہادت تو نے کی ایسی ایجاد حسین زندہ باد حسین
راہ خدا میں جانیں دینے والے زندہ ہیں خواہ نہ ہم سمجھیں
سن لیجئے فطرت کا ترانہ زندہ باد حسین زندہ باد حسین!



سلام — افرعباس

حقیقت کا جسے تھوڑا سا بھی ادراک ہوتا ہے
غمِ شہید میں اس کا گریباں چاک ہوتا ہے
حسین ابن علی سے واقعی جس کا تعلق ہو
وہ سچی بات کہنے میں بہت بیباک ہوتا ہے
نگاہِ اہل عرفاں میں وہی تو پاکدامن ہے
محبت میں علیؑ کی جس کا دامن چاک ہوتا ہے
شہیدِ کربلا کے غم میں جو سب کچھ بھلا بیٹھے
محبت میں علیؑ کی جس کا دامن چاک ہوتا ہے
محمدؐ مصطفیٰ کے اہل بیت پاک سے افر
جو جتنا دور ہو اتنا ہی وہ ناپاک ہوتا ہے



سلام — ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

ظلم و ستم سے ریت پہ تحریر کی طرح
 ہے خوں مگر زمانے میں تقدیر کی طرح
 جنت نظیر وادی ہے میدانِ کربلا
 ہر گھر میں ایک شخص ہے شبیر کی طرح
 اپنے لہو میں پھول کھلانے کا وقت ہے
 یہ دل ہے آج وادی کشمیر کی طرح
 زندہ ہیں خوف بن کے شہادت کے واسطے
 ہر سانس اپنا نعرہ تکبیر کی طرح
 کٹ جائیں گے یہ دن بھی ترپتے ہوئے یہاں
 جھنکار کوئی ہے کہیں زنجیر کی طرح



سلام — نجیب احمد

جب تیرا لہو ریت کے دریا پہ گرا تھا
 افلاک پہ کربل کا دُھواں پھیل گیا تھا
 چکا ہے ترے نور سے جمہور کا چہرہ
 تو رات کے ارژنگ میں تصویرِ ضیا تھا
 حیرت ہے کہ اس وقت فلک کیوں نہیں ٹوٹا
 جب تیرے جسم میں پیوست ہوا تھا

آنکھوں میں ہے ٹھہرا ہوا وہ آخری لمحہ
 جب تیز ہواؤں نے بھی دم سادھ لیا تھا
 اس وقت کہ تھا نیند میں گم عصرِ دیانت
 شہیڑ کے ہمراہ خدا جاگ رہا تھا
 ❖

سلام — ستار سید

ڈھلی جو شام تو پنچھی بھی اپنے گھر آئے
 سفر پہ نکلے تو سید نہ لوٹ کر آئے
 بسائے پھرتی ہے آنکھوں میں رت جگے صغرا
 کوئی تو دشت مسافت سے لوٹ کر آئے
 اسے ملی ہے مقتل گھروں کی تنہائی
 کوئی رہائی کی صورت نہ اب نظر آئے
 نہ سر پہ چادرِ زہرا نہ ساتھ بھائی کا
 ترے نصیب میں زینب عجب سفر آئے
 چلے وہ ساتھ نہ ہو جس کو واپسی کا خیال
 جسے عزیز نہ ہو جان و دل ادھر آئے
 یہ ہے مقامِ موڈت کہ گھر لٹا کر بھی
 نہ کوئی حرفِ شکایت زبان پر آئے
 شہیدِ جور و جفا وہ گدازِ دل والے
 چلے جو ذکرِ کبھی ان کا آنکھ بھر آئے

حسینیت سے کرو اخذ رسم حق گوئی
 سوادِ جبر میں مشکل گھڑی اگر آئے
 لہو سے لوحِ جہاں پر لکھو فسانہ حق
 یزیدِ وقت اگر ظلم پر اتر آئے
 غارِ تیرے محبوبوں کے جب بھی وقت پڑا
 کفنِ بدوش چلے اور لہو میں تر آئے
 انہیں سے ربط کا فیضان ہے کہ ہم سید
 سوادِ کرب سے ثابت قدم گزر آئے



سلام — افضال شاہد

محکم اسی لئے تو ہے رتبہ حسین کا
 سب سے عظیم دہر میں شجرہ حسین کا
 یہ ایک دن کی نذریں، نیازیں نہیں ہیں دوست
 کھاتے ہیں ہم تو روز ہی صدقہ حسین کا
 صحنِ حرم میں خون کو پہنے نہیں دیا
 احسان یاد رکھے گا کعبہ حسین کا
 ہیں شرمسار آج بھی نسلیں یزید کی
 ہے قرض وار آج بھی کوفہ حسین کا
 تاریخ کب رُکی ہے کسی ایک موڑ پر
 ہر دور لے کے چلتا ہے ورثہ حسین کا

شاید اگر قبول نہیں ہے یزیدیت
چنا پڑے گا آپ کو رستہ حسین کا



سلام — عطا الحق قاسمی

جب بھی شام کو سورج ڈوبنے لگتا ہے
ایسے میں یہ دل بھی ڈولنے لگتا ہے
آنکھوں میں پھر جاتی ہے وہ سوہنی صورت
اور پھر دل پر خنجر چلنے لگتا ہے
چاروں جانب گھیرا جھوٹ کے لشکر کا
سچ کا سایا اس پر پھیلنے لگتا ہے
حرص و ہوس کے بندے لیکن کیا جانیں
مرنے والا کیسے جینے لگتا ہے
لیکن تم مایوس نہ ہوتا دل والو!
دل جو سوچتا ہے وہ ہونے لگتا ہے



سلام — سلیم کوثر

یہ فقط عظمتِ کردار کے ڈھب ہوتے ہیں
فیصلے جنگ کے تلوار سے کب ہوتے ہیں
صرف جرأت پہ ہی موقوف نہیں سچائی
حق کے اظہار کو کچھ نام و نسب ہوتے ہیں

زیت کرنا تو کوئی فتح کا اعزاز نہیں
 مرطے عشق کے تو جان طلب ہوتے ہیں
 بارشِ خوں میں مہک اٹھتے ہیں زخموں کے گلاب
 دن کے آثار گھنے گیسوئے شب ہوتے ہیں
 یہ جو جدے میں سرِ مقل جاں دیکھتے ہو
 لوگو یہ سبطِ شہنشاہِ عرب ہوتے ہیں
 دیں کی عظمت کے لئے رفعتِ اثار کے ساتھ
 بچ صحرا میں اجڑنے کے سبب ہوتے ہیں
 جھوٹ تعداد میں کتنا ہی زیادہ ہو سلیم
 اہل حق ہوں تو بہتر بھی غضب ہوتے ہیں



سلام — ڈاکٹر طاہر تونسوی

منظر وہ شامِ غم کا لہو منظروں میں تھا
 کرب و بلا کا عکس سبھی آئینوں میں تھا
 تشنہ لبی وہ تھی کہ کنارِ فرات سے
 اشکوں کا ایک سیل رواں گھاٹیوں میں تھا
 چھایا ہوا تھا خوفِ یزیدانِ وقت پر
 لیکن بلا کا حوصلہ ان کمنوں میں تھا
 ارض و سما کے پاس کہاں ایسی جراتیں
 وہ صبر بے مثال کہ خیمہ زنوں میں تھا

سجاد سوگوار کے ہاتھوں میں تھی مہار
 کچھ بیڑیوں کا شور انہیں دائروں میں تھا
 اس سانحہ پہ رو پڑے طاہر یہ آسمان
 عالم تو ضبطِ گریہ کا ان بیبیوں میں تھا

❖

سلام — غلام حسین ساجد

کیسے ترے اوصافِ حمیدہ نہ لکھوں گا
 ہر چند کسی کا بھی قصیدہ نہ لکھوں گا
 اے وقت مجھے بازوئے حیدر کی قسم ہے
 عباؑں کو میں دستِ بریدہ نہ لکھوں گا
 کیسے نہ پکاروں گا تجھے عشق کی منزل
 کیوں تجھ کو محبت کا جریدہ نہ لکھوں گا
 تو ظلم کی باہوں میں رسالت کی امیں ہے
 اے شمع تری لو کو خمیدہ نہ لکھوں گا
 اے عرش ترے سر پہ اسی چھاؤں کی خاطر
 میں چادرِ نہٹ کو دریدہ نہ لکھوں گا
 وہ لوگ جو تپتے ہوئے صحرا پہ چلے ہیں
 کیوں کر میں انہیں ظلم رسیدہ نہ لکھوں گا

❖

سلام — قائم نقوی

وہ شہسوار احمد مختار دیکھنا
 ممکن نہیں اسے جہر تلوار دیکھنا
 طوق گلو ہے طوق پڑیں پاؤں بیڑیاں
 قیدی ہے کس کا عابد بیمار دیکھنا
 کس شان سے طلوع ہوا کربلا کا دن
 اے صبح آج شام کے رخسار دیکھنا
 مٹنے کو ہیں ہر ایک ستم کے تمام رنگ
 گرنے کو ہیں زمیں پہ علمداڑ دیکھنا!
 بے چین ہیں ہوائیں ابابیل کی طرح
 بے کل ہے روح حیدر کرار دیکھنا



سلام — شوذب کاظمی

بارگاہ عشق میں جلوہ را حسین ہے
 کائنات صبر کا پیشوا حسین ہے
 کربلا نے لکھ دیا وقت کے نصاب میں
 تیرگی یزیدیت چاندنا حسین ہے
 کربلا کی خاک کو جس نے اپنے خون سے
 ضامن شفا کیا وہ دُعا حسین ہے

مر نہیں سکے گا وہ حشر تک جنے گا وہ
 جس کے دل میں نورِ حق لب پہ یا حسین ہے
 رہبرِ حیات بھی عکسِ عینِ ذات ہے
 روحِ کائنات بھی برملا حسین ہے
 ہنس کے ہر ستم سہا، ظالموں کو دی دعا
 اسوۂ رسول کا آئینہ حسین ہے



سلام — کرامت بخاری

آتے نہ کربلا میں جو سردارِ کربلا
 کھتا کہاں یہ عقدہ دشوارِ کربلا
 تفسیرِ مصحفِ رُخِ شبیر کے لئے
 آئینہ خود ہے حاشیہ بردارِ کربلا
 کیسے مٹائیں ان کو زمانے کی ظلمتیں
 آیاتِ کردگار ہیں آثارِ کربلا
 جن سے بندھی ہوئی تھیں اُمیدیں رسول کی
 وہ مرکزِ یقین ہیں سرکارِ کربلا
 پیشِ نظر ہے منظرِ کرب و بلا ہنوز
 آنکھیں ہیں گویا روزِ دیوارِ کربلا
 لاکھوں سلام اے میرے مولائے تشنہ کام
 لاکھوں درود قافلہ سالارِ کربلا

سلام — عباس تابش

پانی نہ ہوا جس کو میسر لب دریا
 لہریں اسے رو جاتی ہیں آ کر لب دریا
 آنکھوں میں کسی طور پہنچ ہی گیا پانی
 دیتا رہا پہرہ کوئی لشکر لب دریا
 خیموں کو ضرورت تھی مگر بادِ فنا نے
 رکھا ہے چراغوں کو بجھا کر لب دریا
 پانی بھی یقیناً صفِ اعداء میں تھا شامل
 ہر لہر تھی اٹھتا ہوا خنجر لب دریا
 پانی کی کشش موت سے کم تو نہیں ہوتی
 لے جاتے ہیں رستے ہمیں اکثر لب دریا
 خیموں میں بڑی دیر سے تشویش ہے تابش
 آتا ہی نہیں ہے کوئی جا کر لب دریا



سلام — سعد اللہ شاہ

شامِ رنجِ ملال ہے مجھ میں
 کربلا کا جمال ہے مجھ میں
 آرزو ہے مجھے شہادت کی
 زندگی کا کمال ہے مجھ میں

سرخ ہوتی ہوئی زمیں نے کہا
 اک حسینی جلال ہے مجھ میں
 جو فقط کربلا کا ورثہ ہے
 جراتوں کی مثال ہے مجھ میں
 دشتِ غربت میں آ گئے آنسو
 دل کا دل سے وصال ہے مجھ میں
 مرکبِ دو جہان ٹھہرے حسین
 نقطۂ اتصال ہے مجھ میں
 ❖

سلام — جوازِ جعفری

تشنہ لب قتل جو دریا کے کنارے ہوئے لوگ
 وہ تھے اس خاک پہ امبر سے اتارے ہوئے لوگ
 گردنیں مارو ہماری یا ہمیں قید کرو
 ہم ہیں اس جیتی ہوئی جنگ میں ہارے ہوئے لوگ
 خود لگائے گی ٹھکانے ہمیں ریت اور ہوا
 ہم ہیں اس معرکہ شوق میں مارے ہوئے لوگ
 تو ہمیں دیکھ، مکاتیب کی کثرت کو نہ دیکھ
 ہم ہیں کونے میں بھی اک عمر گزارے ہوئے لوگ
 اپنی مٹی کی طلبِ دل میں لیے آئے ہیں
 باڑ کے پار کھڑے جنگ کے مارے ہوئے لوگ

رات دن مانگ رہا ہوں میں جواز امن کی خیر
گرگ کا روپ بھریں شہر میں دھارے ہوئے لوگ



سلام — طاہرناصر علی

چھوڑ کر باطل کا در تجھ پہ کھلے دو سینکڑوں
خُری قسمت پہ قرباں ہیں مقدر سینکڑوں

سنگ زادوں کو دکھایا آئینہ شہر نے
اس زمیں میں دفن ہیں یوں تو سکندر سینکڑوں

آب اُن کی مرگئی منہ مند ہو کر رہ گئے
تشنہ لب کے حلق نے توڑے ہیں خنجر سینکڑوں

رہتے ہیں محفوظ ہر غم سے غم شہ کے طفیل
ماتم شہر سے آباد ہیں گھر سینکڑوں

مسکر کر حنجر شای کو اُلٹ کر رکھ دیا
جو کیا اصغر نے کر سکتے نہ لشکر سینکڑوں

صرف طاہر ہی نہیں ہے اُن کے غم میں نوحہ خواں
کر دیئے پیدا غم شہ نے سنخوڑ سینکڑوں



سلام — علی رضا کاظمی

زندگی کا ارتقاء ملنے لگا
مر کے جینے کا مزہ ملنے لگا

کہہ گئی یہ خاشی معصوم کی
ابتداء سے انتہا ملنے لگا

جب چلے شہر سوئے کربلا
قافلے سے قافلہ ملنے لگا

پوچھ لو یہ شاہ کے انصار سے
موت کا بھی ذائقہ ملنے لگا

جب رہ کرب و بلا پر چل پڑے
خلد کا بھی راستہ ملنے لگا

یہ اثر شہر کے غم کا ہوا
غم زدوں کو حوصلہ ملنے لگا

مل گئے شہر سب کچھ مل گیا
اور مت پوچھو کہ کیا ملنے لگا



سلام — شبنم شکیل

یہ کون لوگ ہیں حق کا علم اٹھائے ہوئے
جو راہ غم میں ہیں چپ چاپ سر جھکائے ہوئے

گواہی دینے کو جھکتا ہے آساں جن کی
جو تاج سر پہ محبت کا ہیں سجائے ہوئے

زمین شوق سے سو بار چومتی ہے جنہیں
سفید پوش ہیں جو خون میں نہائے ہوئے

کوئی مقام بلند ان کا منتظر ہے کہیں
 یہ جا رہے ہیں کہیں دور گھر لٹائے ہوئے
 ہے ان کے پاس تو ان کے لئے بھی کلمہ خیر
 کہ جن کی تیغ ستم کے ہیں یہ ستائے ہوئے
 گنو تو کم ہیں جو سمجھو تو ان گنت ہیں یہ
 کہ دو جہان کی ہیں وسعتوں پہ چھائے ہوئے
 یہی تو لوگ ہیں مقبول بارگاہ رسول
 یہی ہیں رب دو عالم کے آزمائے ہوئے

❖

سلام — پروین حیدر

حفظ دیں بکھری ہوئی دنیا کے بیچ
 قصر کی تعمیر ہے صحرا کے بیچ
 کیا سمجھ پائیں گے کیا ہے کربلا
 وہ کہ جو الجھے ہیں کیوں اور کیا کے بیچ
 اس دیئے سے اب بھی لرزاں ہے ہوا
 بجھ کے جو روشن ہوا صحرا کے بیچ
 غیرتِ عباس مانع ہو گئی
 بعد کیا تھا پیاس اور دریا کے بیچ
 مستقل اک خوں کا دریا ہے رواں
 قلبِ زینب اور دلِ زہرا کے بیچ

حکم مرگ حضرت عباسؓ تھا
 عہد کیا تھا بندہ و آقا کے بیچ
 یا شہہ دیں رہنمائی کیجئے!
 میں کھڑی ہوں دین اور دنیا کے بیچ
 ❖

سلام — فریدہ سید

سلام اس پر جو بنت احمدؓ کا لاڈلا تھا
 رو وفا میں سر اپنا جس نے کٹا دیا تھا
 ہزار جدے ہوں ایک جدے پہ اس کے قرباں
 جو زیرِ نجر تھا اور پھر مسکرا رہا تھا
 سرشت میں اس کی پاسبانی تھی دین حق کی
 وہ دین حق کے لئے تہ تیغ ہو رہا تھا
 وہ پرچم حق تھا سرنگوں اس کو کون کرتا
 لہو سے عباسؓ نامور کے دھلا ہوا تھا
 سینہ خیمے میں کس لئے بین کر رہی تھی
 چچا تو پانی کی مشک لینے چلا گیا تھا
 قتال میں جس کے دست و بازو لہو لہو تھے
 زمانہ اس کی وفا پر آنسو بہا رہا تھا
 فرات بہتی تھی پر فریدہ عجب تھا منظر
 وہ تشنہ لب تھا اگرچہ مہمان کربلا تھا

سلام — رخشندہ نوید

ثنائے ذکر محمدؐ کا باب زندہ رہا
 کتاب دین میں کا نصاب زندہ رہا
 ثبات حق کیلئے حسن لے گئے تھے حسین
 مرے خدا کا حسین انتخاب زندہ رہا
 ہوا میں گرد کی مانند اڑ گیا باطل
 مگر وہ سچ کا عظیم آفتاب زندہ رہا
 ہزار شامِ غربیاں کی بے کسی ہو گی
 مگر دلوں میں رُخِ ماہتاب زندہ رہا
 لبو میں ڈوب گئی پور پور زخم ہوئی
 عقیدتوں میں یہ دل کا گلاب زندہ رہا
 سلام لکھتے ہوئے کربلا کے پیاسوں پر
 ہماری پلکوں پہ غمِ آبِ آب تو زندہ رہا



حواشی

(۱) اس انتخاب کی تسوید کے لیے درج ذیل کتب اور رسائل سے استفادہ کیا گیا۔

- (i) علی جوادی دہلوی، انیس کے سلام، دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء
- (ii) تقی عابدی، ڈاکٹر سلک سلام دبیر، لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۳ء
- (iii) سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر باقیات آل رضا، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (iv) آغا سید قمر حسین، لبو لبو کہکشاں (تین جلدیں)، کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۹۲ء
- (v) عبدالرؤف عروج، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال، کراچی: شارق پبلی کیشنز، س۔ن

- (vi) علی حسنین جاوید، روشنی کا مستقر، ملیسی: زر تاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
- (vii) علی رضوی، سید (مرتب) حسین پر سلام، کراچی: میر انیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء
- (viii) اسرار زیدی، (مرتب) کربلا کر بلا حسین حسین، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
- (ix) طاہر ناصر علی، تشنہ لبی، لاہور: علی پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (x) شبیہ الحسن، ڈاکٹر (مدیر) ماہنامہ ”شام و سحر“، لاہور: محرم نمبر ۱۹۸۸ء تا ۲۰۰۳ء
- (xi) محمد رضا عابدی (مدیر) ہفت روزہ رضا کار، لاہور: محرم نمبر ۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۳ء
- (xii) سید وحید الحسن، پاشی (مدیر) ماہنامہ ”پیامِ عمل“، لاہور: محرم نمبر ۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۳ء
- (xiii) حمید کوثری (مدیر) پندرہ روزہ ”ذوالفقار“، پشاور: محرم نمبر ۱۹۹۰ء تا ۲۰۰۳ء





کتابیات

- (۱) آل احمد سرور پروفیسر ادب اور نظریہ لکھنؤ ادارہ فروغ ادب ۱۹۵۳ء
- (۲) ابوالیث صدیقی ڈاکٹر ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ کراچی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۷ء
- (۳) احتشام حسین سید ”ذوق ادب اور شعور“ لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو ۱۹۵۵ء
- (۴) احراز نقوی ڈاکٹر ”جدید فن مرثیہ نگاری“ (مرتبہ: وحید الحسن ہاشمی) لاہور: مکتبہ تعمیر ادب ۱۹۶۷ء
- (۵) احسان دانش ”جہان دانش“ لاہور دانش آباد ۱۹۷۳ء
- (۶) اسد اریب ڈاکٹر اردو مرثیے کی سرگذشت لاہور: کاروان ادب ۱۹۸۹ء
- (۷) اسد اریب ”نقد انیس“ لاہور: جدید بکڈ پو ۱۹۶۷ء
- (۸) اسرار زیدی (مرتب) کر بلا کر بلا حسین حسین لاہور: الحمد پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء
- (۹) اسیر فیض آبادی سجاد خاں کراچی فیڈرل بی ایریا ۱۹۹۹ء
- (۱۰) اشرف رفیع ڈاکٹر ”نظم طباطبائی۔ حیات اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ“ حیدر آباد (دکن) الیاس ٹریڈرس ۱۹۸۶ء
- (۱۱) اعجاز حسین ڈاکٹر ”مذہب و شاعری“ کراچی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۵ء
- (۱۲) افسوس میر شیر علی ”کلیات افسوس“ مرتبہ ظہیر احسن پٹنہ لیبیل لیتھو پریس ۱۹۶۱ء
- (۱۳) امداد امام اثر ”کاشف الحقائق“ (جلد دوم) لاہور: مکتبہ معین الادب ۱۹۵۶ء
- (۱۴) امیر احمد علوی ”یادگار انیس“ لکھنؤ: انوار المطالع سن۔ن
- (۱۵) انور سدید ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر تاریخ“ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۱ء
- (۱۶) ایم۔ سلطانہ بخش ڈاکٹر ”اردو میں اصول تحقیق“ (جلد اول) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء
- (۱۷) باقر رضوی امانت خانی، قصوراء جر رسالت حیدر آباد (بھارت) نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ۱۳۷۵ھ
- (۱۸) پیام شاہجہانپوری ”جنوبی ہند میں اردو“ لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۵ء
- (۱۹) تقی عابدی سید ڈاکٹر (مرتب) سلک سلام دبیر لاہور: اظہار سنز ۲۰۰۳ء
- (۲۰) جرأت قلند بخش ”کلیات جرأت“ مرتبہ: افتداحسن لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء

- (۲۱) جمیل جالبی ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ء
- (۲۲) جوش ملیح آبادی ”آیات و نعمات“ لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۴۳ء
- (۲۳) جوش ملیح آبادی ”یادوں کی بارات“ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۲ء
- (۲۴) حالی: الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن
- (۲۵) حامد حسن قادری، پروفیسر ”مختصر تاریخ مرثیہ گوئی“، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء
- (۲۶) حسن رضوی ڈاکٹر ”عقیدتیں“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
- (۲۷) حسن رضوی ڈاکٹر ”وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر“ ناصر کاظمی (فن اور شخصیت) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء
- (۲۸) حسینی مجاہد حسین ڈاکٹر ”آرزو لکھنوی حیات اور کارنامے“ نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۸ء
- (۲۹) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز ”کشاف تنقیدی اصطلاحات“ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، س۔ن
- (۳۰) خاکی، مسعود رضا ڈاکٹر ”کیف غم“ لاہور: حلقہ شعرائے اہلیہ، ۱۹۷۴ء
- (۳۱) خواجہ محمد زکریا ڈاکٹر ”قدیم نظمیں“ لاہور: بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء
- (۳۲) ذابرخ پوری ”سلام و کلام“ لاہور: کارواں پریس، ۱۹۷۶ء
- (۳۳) ذاکر حسین فاروقی ”دبستان دبیر“ لکھنؤ، نسیم بکڈ پو، ۱۹۶۶ء
- (۳۴) رام بابو سکسینہ ڈاکٹر ”تاریخ ادب اردو“ (مترجم۔ مرزا محمد عسکری) لاہور: علمی کتاب خانہ، ۱۹۸۵ء
- (۳۵) رشید موسوی ڈاکٹر ”دکن میں مرثیہ اور عزاداری“ نئی دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء
- (۳۶) روشن علی ”عاشورنامہ“ (مرتبہ: مسعود حسین خاں) علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء
- (۳۷) ساحر فیض آبادی ”حراسے حرم تک“ کراچی، ۲۰۰۱ء
- (۳۸) ساحر فیض آبادی ”کعبے سے کربلا تک“ کراچی، فضلی سنز، ۱۹۹۲ء
- (۳۹) ساحر لکھنوی ”مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک“ کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۷ء
- (۴۰) سالک، قربان علی بیگ ”کلیات سالک“ مرتبہ: کلب علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء
- (۴۱) سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۴ء
- (۴۲) سجاد باقر رضوی ”تہذیب و تخلیق“ لاہور: مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۶ء
- (۴۳) سجاد باقر رضوی ”تیشہ لفظ“ لاہور: کتابیات، ۱۹۶۸ء
- (۴۴) سجاد باقر رضوی ”ڈاکٹر، معروضات“ لاہور: پولیمیر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
- (۴۵) سکندر آغا، سید ڈاکٹر ”مرزا محمد اوج لکھنوی۔ حیات اور کارنامے“ لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۸۵ء

- (۴۶) سلیم اختر، ڈاکٹر ”ادب اور کلچر“ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء
- (۴۷) سلیم اختر، ڈاکٹر ”اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ“ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء
- (۴۸) سودا، مرزا محمد رفیع ”کلیات سودا“ لاہور، مکتبہ شعر و سخن، ۱۹۸۶ء
- (۴۹) سہیل احمد، ڈاکٹر ”طرفیں“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
- (۵۰) شاداں دہلوی ”مناقب قربی“ کراچی، سید اینڈ سید، ۱۹۹۳ء
- (۵۱) شاد عظیم آبادی ”پیمبران سخن“ (مرتبہ: ڈاکٹر صفدر حسین) لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء
- (۵۲) شارب رودلوی، ڈاکٹر ”تنقیدی مطالعے“ لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۱۹۸۳ء
- (۵۳) شاہد نقوی، سید ”عزاداری“ لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۱ء
- (۵۴) شاہی علی عادل شاہ ثانی ”کلیات شاہی“ (مرتبہ: سید مبارز الدین رفعت) علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء، ص ۹
- (۵۵) شبلی نعمانی، علامہ ”موازنہ انیس و دبیر“ آگرہ، مفید عام پریس، ۱۹۰۷ء
- (۵۶) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر ”آل رضا کی غزل گوئی“ لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
- (۵۷) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر ”اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- (۵۸) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر ”باقیات آل رضا“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (۵۹) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر ”بکھی وہ شمع“ لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۷ء
- (۶۰) شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (۶۱) شجاعت علی، سندیلوی، تعارف: مرثیہ، الہ آباد، ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء
- (۶۲) شیخ چاند، سودا، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۳ء
- (۶۳) صفدر حسین، سید، ڈاکٹر ”رزم نگاران کربلا“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء
- (۶۴) صفدر حسین، ڈاکٹر، سید ”لب فرات“ لاہور، بارگاہ ادب، ۱۹۷۶ء
- (۶۵) ضمیر اختر نقوی ”بیاد سید آل رضا“ کراچی: ابن حسن آفسٹ پریس، ۱۹۷۸ء
- (۶۶) ضمیر اختر نقوی (مرتب) جوش کے مرثیے، کراچی: ادارہ فیض ادب، ۱۹۸۰ء
- (۶۷) ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر ”نوادرات مرثیہ نگاری“ (جلد دوم)، کراچی: مرکز علوم اسلامیہ، ۲۰۰۴ء
- (۶۸) طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر ”اردو مرثیہ انیس کے بعد“ دہلی، جامعہ نگر، ۱۹۷۷ء
- (۶۹) طاہر ناصر علی (مرتب) تشنہ لبی، لاہور: علی پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (۷۰) عارف ثاقب، ڈاکٹر، سجاد باقر رضوی کی ادبی خدمات، لاہور، غالب نما، ۱۹۹۹ء

- (۷۱) عارف علی محمد جواہر بے بہا، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۳۵ء
- (۷۲) عارف، مہر علی محمد عارف ”معارف سخن“ (مرتبہ: سید یوسف حسین شائق) لاہور، بارگاہ ادب، ۱۹۷۷ء
- (۷۳) عاصی کرناٹی، ڈاکٹر ”جاوداں، ملتان، مکتبہ اہل قلم، ۱۹۸۸ء
- (۷۴) عاصی کرناٹی، ڈاکٹر ”خاصاں خدا کر بلائیں“ کراچی، آل شفق پرنٹرز، ۲۰۰۰ء
- (۷۵) عباس رضا، پروفیسر، وحید عصر، لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
- (۷۶) عبدالرؤف عروج ”اردو مرثیے کے پانچ سو سال“ کراچی، شاروق پبلی کیشنز، سن۔ ن
- (۷۷) عرفان عباسی ”آپ“ لکھنؤ، الوعظ صفدر پریس، ۱۹۷۸ء
- (۷۸) علی جواد زیدی ”انیس کے سلام“ دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۱ء
- (۷۹) علی حسین جاوید (مرتب) روشنی کا مستقر، میلسی: زرناپ پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- (۸۰) علی رضوی سید (مرتب) حسین پر سلام، کراچی: میرانئیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء
- (۸۱) علی محمد خاں، ڈاکٹر ”لاہور کا دبستان شاعری“ لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء
- (۸۲) غالب، اسد اللہ خاں ”کلیات غالب، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۳ء
- (۸۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ”میرانئیس حیات اور شاعری“ کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۶ء
- (۸۴) فضل لکھنوی ”معیار غزل“ لکھنؤ، نامی پریس، ۱۹۸۴ء
- (۸۵) فوق، سید نظیر الحسن ”المیزان“ علی گڑھ، مطبع فیض عام، ن۔ س
- (۸۶) قائم چاند پوری، کلیات قائم (مرتبہ: اقتدا حسن) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء
- (۸۷) قمر جلالولی، نعم جاوداں، کراچی: شیخ شوکت علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء
- (۸۸) قمر حسین آغا، لہوہو کہکشاں، کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۸۹ء
- (۸۹) قمر حسین آغا، لہوہو کہکشاں، کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۹۲ء
- (۹۰) کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء
- (۹۱) کوثر عابدی پانی پتی، سر مقتل، لاہور، افتخار بک ڈپو، ۱۹۸۹ء
- (۹۲) گوپی چند نارنگ (مرتب) انیس شناس، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء
- (۹۳) گوپی چند نارنگ، سانحہ کر بلا بطور شعری استعارہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء
- (۹۴) محمد اقبال، علامہ ”کلیات اقبال“ لاہور، اقبال اکیڈمی، پاکستان، ۱۹۹۰ء
- (۹۵) محمد رضا کاظمی ”جدید اردو مرثیہ“ کراچی، مکتبہ ادب، ۱۹۸۱ء

(۹۶) محمد قلی قطب شاہ، کلیات محمد قلی قطب شاہ (مرتبہ: ڈاکٹر محی الدین زور) حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، مشین پریس، طبع اول، ۱۹۴۰ء

- (۹۷) مسیح الزماں ڈاکٹر ”اردو مرثیے کا ارتقا“ لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، بار دوم، ۱۹۹۱ء
- (۹۸) مصطفیٰ غلام ہدائی، کلیات مصطفیٰ مرتبہ: نور الحسن نقوی، لاہور، مجلس ترقی اردو، ۱۹۷۱ء
- (۹۹) مصطفیٰ فطرت ڈاکٹر ”صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے“ لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۸۶ء
- (۱۰۰) مظفر حسین ملک ڈاکٹر ”اردو مرثیے میں مرزا دہیر کا مقام“ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۷۶ء
- (۱۰۱) مہذب لکھنوی (مرتب) معیار کامل، جلد اول، لکھنؤ: یونائیٹڈ پریس، ۱۹۵۱ء
- (۱۰۲) میر تقی میر، کلیات میر (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی)، لاہور، اردو دنیا، ۱۹۵۸ء
- (۱۰۳) میر ضاحک ”کلیات ضاحک“ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۲ء
- (۱۰۴) میر ضمیر، مجموعہ مرثیہ ضمیر، جلد اول، لکھنؤ: نول کشور، ۱۸۹۸ء
- (۱۰۵) ناظر حسن زیدی ڈاکٹر ”جدید فن مرثیہ نگاری“ لاہور، مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء
- (۱۰۶) نجم آفندی ”اشارات غم“ لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۴۳ء
- (۱۰۷) نجم آفندی ”نجم آفندی کے سلام“ لاہور، امامیہ کتب خانہ، س۔ن
- (۱۰۸) نجم الغنی، مولوی رام پوری، بحر الفصاحت (مرتبہ: سید قدرت نقوی)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء
- (۱۰۹) نسیم امروہوی ”چشمہ غم“ لاہور، محفوظ بک ایجنسی، ن۔س
- (۱۱۰) نسیم امروہوی ”مرثیہ جوش“ کراچی، لشکر ادب، ۱۹۸۲ء
- (۱۱۱) نصیر الدین ہاشمی ”دکن میں اردو“ لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۰ء
- (۱۱۲) نواز حسن زیدی، سید ”نجم آفندی۔ فکر و فن“ لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- (۱۱۳) وحید الحسن ہاشمی ”العطش“ لاہور، الحبيب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
- (۱۱۴) وحید الحسن ہاشمی، سید ”تشنہ لب ہے حسین“ لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
- (۱۱۵) وحید الحسن ہاشمی ”چراغ صحرا“ لاہور، حلقہ مصنفین پاکستان، ۱۹۸۳ء
- (۱۱۶) وحید الحسن ہاشمی، سید (مرتب) سلام وفا، لاہور، ۱۹۶۹ء
- (۱۱۷) وزیر آغا ڈاکٹر ”اردو شاعری کا مزاج“ لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۵ء
- (۱۱۸) وصی الحسن نقاش ”کوئی صحرا میں بنائے مقتل“ لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء
- (۱۱۹) ولی محمد، کلیات ولی (مرتبہ: نور الحسن ہاشمی)، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۵ء

(۱۲۰) ہلال نقوی ڈاکٹر ”میسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ“ کراچی پاکستان رائٹرز گلڈ ۱۹۹۳ء

(۱۲۱) ہوش عابدی، علی کل غالب، لاہور ۱۹۹۹ء

(۱۲۲) یاد مشکور حسین ”مفہوم زمانہ“ ملتان، شاہراہ ادب ۱۹۷۴ء

(۱۲۳) R.C. Maujaumder "An Advance History of India" London, 1960, p. 67

W.W. Hunter, Brief History of Indian People, Oxford, 1907 (۱۲۴)

لغات

- اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۱۱ لاہور: پنجاب یونیورسٹی س۔ن
- تصدق حسین رضوی، سید ”لغات کشوری“ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء
- حامد علی خان مولانا ”اردو جامع انسائیکلو پیڈیا“ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۷ء
- سید احمد دہلوی مولوی ”فرہنگ آصفیہ“ (جلد سوم) لاہور: مکتبہ حسن ۱۸۹۸ء
- شان الحق حقی ”فرہنگ تلفظ“ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۵ء
- ظہور الحسن ناظم ”اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا“ لاہور: حیدری پرنٹنگ پریس ۲۰۰۳ء
- عبد المجید خواجہ ”جامع اللغات“ (جلد دوم) لاہور: اردو سائنس بورڈ ۱۹۸۹ء
- فرمان فتح پوری ڈاکٹر ”اردو لغت“ کراچی: ترقی اردو بورڈ ۱۹۹۰ء
- فضل الہی عارف ”فرہنگ کارواں“ لاہور: مکتبہ کارواں س۔ن
- فیروز الدین مولوی ”فیروز اللغات“ لاہور: فیروز سنز س۔ن
- منشی چمنی لال ”مخزن المحاورات“ لاہور: مقبول اکیڈمی ۱۹۸۸ء
- مہذب لکھنوی ”مہذب اللغات“ (جلد ششم) لاہور: نامی پریس س۔ن
- نائب حسین نقوی ”فرہنگ انیس“ (جلد دوم) دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۸۳ء
- نسیم امرہوی ”نسیم اللغات“ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۵۵ء
- نشر جان دھری عبد الحکیم خاں قائد اللغات لاہور: ایم آر برادرز ۱۹۶۹ء
- نور الحسن نیر مولوی ”نور اللغات“ (حصہ سوم) لاہور: مقبول اکیڈمی س۔ن
- وارث سرہندی ”علمی اردو لغت“ (جامع) لاہور: علمی کتاب خانہ س۔ن
- وحید الزماں علامہ ”لغات الحدیث“ کراچی: نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب س۔ن

رسائل و جرائد

- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، اپریل ۱۹۷۰ء
- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، فروری ۱۹۷۲ء
- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۲ء
- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، مارچ۔ اپریل ۱۹۷۳ء
- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، جنوری۔ فروری ۱۹۷۴ء
- پیام عمل (ماہنامہ) لاہور، امامیہ مشن انارکلی، جولائی۔ اگست ۱۹۸۷ء
- شام و سحر (ماہنامہ) لاہور، اردو بازار، صبا کبریا، بادی نمبر، اپریل ۱۹۹۲ء
- شام و سحر (ماہنامہ) لاہور، اردو بازار، قیصر بارہوی، نمبر، جون ۱۹۹۲ء
- شام و سحر (ماہنامہ) لاہور، اردو بازار، محرم نمبر، جولائی ۱۹۹۲ء
- فنون (شمارہ) لاہور، سیرت نمبر، ۱۹۸۲ء
- ماہ نو (ماہنامہ) کراچی، ادارہ مطبوعات پاکستان، ستمبر ۱۹۷۹ء
- نقوش لاہور، ادارہ فروغ اردو، انیس نمبر، ۱۹۶۶ء
- نقوش لاہور، ادارہ فروغ اردو، بیسویں سالگرہ۔ خطوط نمبر، اپریل۔ مئی ۱۹۶۷ء

مقالات

- احسن زیدی، اردو میں منقبت نگاری، مقالہ پی ایچ۔ ڈی، غیر مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء
- رباب احسن، مسعود رضا خاکی (شخصیت اور فن) مقالہ برائے ایم۔ اے، غیر مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- شبنم بختیار، نسیم امروہوی، مقالہ برائے ایم۔ اے، اردو غیر مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۹ء
- مرتضیٰ زیدی، سید ”اردو مرثیہ قیام پاکستان کے بعد“ مقالہ ایم۔ اے، اردو غیر مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

